۱۳ شمارہ ۳] لاہور [جون

اس شمارہ میں

آموزں
لاہور

جون سنہ ۱۹۶۰ء

جلد ــــــــــــــ ۱۳

شمارہ ــــــــــــــ ۳

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے ۱۰/

پبلشر

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور سے شائع کیا

اوقاف کی آمدنی اور تعلیم

میاں نامدار خاں

تعلیمی کمیشن نے قومی تعلیم کا جو منصوبہ تیار کیا ہے اس کے مطابق دس سال تک ملک کا ہر بچہ خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی ابتدائی تعلیم (پانچویں جماعت تک) حاصل کرنے لگے گا۔ قومی تعمیر اور تعلیمی اصلاح کی طرف یہ انقلاب آفریں قدم ثابت ہوگا کیوں کہ صنعتی تہذیب کے موجودہ دور میں کوئی قوم اس وقت تک ایک مضبوط اور متوازن معیشت حاصل نہیں کر سکتی جب تک اس کے سارے شہری پڑھے لکھے نہ ہوں موجودہ دور کا معاشی نظام پیش بینی اور منصوبہ بندی کا مطالبہ کرتا ہے۔ گو یہ کام قومی سطح پر کیا جاتا ہے لیکن جب تک قوم کا ہر فرد اس منظم معاشی جد و جہد میں سوجھ بوجھ سے حصہ نہ لے اُس وقت تک قومی منصوبہ بندی کے نقشے میں رنگ نہیں بھرا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ خواندگی کو جدید زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت قرار دیا گیا ہے۔ دورِ حاضر کی رفاہی ریاست صرف اپنے شہریوں کے مال و جان کی حفاظت کے لیے ہی ذمہ دار نہیں۔ اس پر یہ فرض بھی عاید ہوتا ہے کہ اپنے شہریوں کو عزت کی روٹی کمانے کے قابل بنائے۔ یہ ذمہ داری اسے اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ تعلیم کو ہر شہری کے لیے مفت اور لازمی قرار دے۔ ایک جمہوری اور رفاہی ریاست ہونے کے اعتبار سے پاکستان بھی مجبور ہے کہ کم از کم ابتدائی تعلیم کو اپنے ہر شہری کے لیے لازمی اور مفت قرار دے۔

لیکن ایک ایسے ملک میں جس کی آٹھ کروڑ آبادی وسیع دیہی علاقوں میں بکھری پڑی ہو ہر بچے کے لیے ابتدائی تعلیم مہیا کرنا کثیر صرفِ زر کا مطالبہ کرتا ہے۔ آزادی کی آمد کے بعد ملک کے تعلیمی بجٹ میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ ہزاروں نئے سکول کھلے ہیں۔ مگر اس کے باوجود ملک کے کل بچوں کی ابھی کوئی ایک تہائی مدرسوں میں پہنچی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ جس تیزی سے تعلیمی سہولتوں میں اضافہ ہو رہا ہے، تقریباً اسی تیزی سے آبادی بڑھ رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب تک نئے کھلنے والے

مدرسے مشکل سے بڑھتی ہوئی آبادی کا ساتھ دے سکے ہیں۔

یہ صورتِ حال قومی تعلیمی منصوبے کے لیے ایک بڑے چیلنج کا درجہ رکھتی ہے۔ لازمی ابتدائی تعلیم ایک فوری قومی ضرورت ہے۔ مگر یہ ضرورت کروڑوں روپے صرف کیے بغیر پوری نہیں ہو سکتی تعلیمی منصوبے کے مطابق یہ بھاری مصارف زیادہ تر عوام ہی کو پورے کرنے ہوں گے۔ اس میں کلام نہیں کہ عام حالتوں میں پاکستانی والدین اپنی اولاد کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کے لیے کسی مالی قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دیہی علاقوں میں ابھی ایسے والدین موجود ہیں جو تعلیم کی قدر و قیمت سے پوری طرح آگاہ نہیں۔ مزید برآں ملک کے کئی حصوں میں عوام کی اوسط آمدنی اتنی تھوڑی ہے کہ وہ کسی نئے مالی بوجھ کو آسانی سے برداشت نہیں کر سکتے۔

تعلیم کا یہ مالی پہلو تسلی بخش حل چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک ذمہ دار تعلیمی افسر نے حال ہی میں ایک معقول تجویز پیش کی ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ اوقاف کی آمدنی کا بڑا حصہ تعلیم پر صرف کیا جائے ہماری رائے ہے کہ اس تجویز پر سنجیدگی سے غور ہونا چاہیے۔ اسلام نے علم حاصل کرنا ہر مرد اور عورت کے لیے فرض قرار دیا ہے۔ ملک کے گوشے گوشے میں جو اوقاف موجود ہیں وہ آغاز میں دعوت و اِرشاد کے مرکز تھے۔ اس لیے ان کی آمدنی کو علم کی روشنی پھیلانے پر صرف کرنا اس آمدنی کا ایک نہایت پسندیدہ مصرف ہوگا

کتب خانے اور ان کی اہمیت

فضل احمد

اسلامی دنیا کے کتب خانے

دمشق، بغداد، طلیطلہ، غرناطہ اور اسلامی تہذیب کے دوسرے بڑے بڑے مرکز زمانے کے ہاتھوں محفوظ نہ رہے مگر اسلامی تہذیب اور ثقافت کے ان مرکزوں میں جو بڑے بڑے کتب خانے قائم تھے ان کے علمی نوادرات آج تک دنیا میں جگہ جگہ بکھرے ملتے ہیں۔ برٹش میوزیم کا کتب خانہ ہو یا فرانس جرمنی اور روس کے قومی کتب خانے وہاں دیکھنے والی نگاہ کو مسلمان عالموں اور سائنس دانوں کے شاہکار کثیر تعداد میں نظر آتے ہیں

حضرت علامہ اقبالؒ نے ان ہی علمی جواہر پاروں کے متعلق فرمایا ہے۔

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

حضرت علامہ کو افسوس اس بات کا ہے کہ حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے چھن گئی تو کوئی بڑی بات نہ تھی لیکن کاش ان سے وہ علمی دولت نہ چھنتی جس کے مالک ان کے اسلاف تھے۔ اگر ہم اپنے علمی خزانوں کو محفوظ کر سکتے تو ہماری یہ گت کبھی نہ بنتی جو آج بن رہی ہے۔

یہ کوئی اتفاقی بات نہیں کہ آج دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے منظم لائبریری امریکا کانگرس کی لائبریری ہے۔ کتابوں کی معنی خیز فہرستیں مرتب کرنے اور لاکھوں کروڑوں کتابوں کے انبار کو قارئین کے لیے صحیح معنوں میں مفید بنانے کے لیے کانگرس کی لائبریری نے تنظیم و ترتیب کے جو طریقے اور اصول وضع کیے ہیں وہ آج ساری دنیا کے لیے نمونے کا کام دے رہے ہیں۔ کانگرس لائبریری کے نمونے پر امریکہ میں لائبریریوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ کوئی شخص اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ علمی اور ذہنی بیداری امریکہ کی سیاسی عظمت کے بنیادی اسباب میں سے ہے۔ دور حاضر میں روس نے جس تیزی سے طاقت حاصل

کی ہے۔ وہ موجودہ تاریخ کا بہت بڑا واقعہ ہے۔ لیکن اس واقعہ کی شرح بھی علمی اور ذہنی اسباب میں ہی
تلاش کرنی چاہیے۔ کانگرس کی لائبریری کے ایک ذمہ دار افسر تھامس جے۔ ونٹی نے حال ہی میں شکاگو
یونیورسٹی کے ایک علمی اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے اس نکتے پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی تھی :-

کتب خانوں کے ناظموں کی حیثیت سے مجھے اور آپ کو اس بات کا اچھی طرح احساس ہے کہ کتب خانے
اور ان کی تیار کردہ فہرستیں علم کے جمع کرنے اور اس کے پھیلانے میں کس قدر اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس لیے
میں یہ کہنے کی جرات کرتا ہوں کہ سوویٹ روس نے کتب خانوں کو منظم کرنے اور کتابوں کو مرتب کرنے کا
جو نظام جاری کر رکھا ہے وہ اس کی طاقت کے اسباب میں سے ایک ہے۔

ماسکو کی "لینن سٹیٹ لائبریری" روس کے کتب خانوں کے لیے مرکز اعصاب کا درجہ رکھتی ہے
یہ مرکزی کتب خانہ نہ صرف کتابوں کا سب سے بڑا قومی ذخیرہ ہے بلکہ یہ کتابوں کی فہرستیں تیار کرنے
اور کتب خانوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے طریقوں کے متعلق ریسرچ بھی جاری رکھتا
ہے۔ اس طرح سے جمع شدہ علم و تجربہ کی روشنی میں یہ مرکزی کتب خانہ ملک بھر کے کتب خانوں کے لیے تربیتی
نصاب پیش کرتا اور مفید لٹریچر تیار کرتا ہے۔

غرض جس طرح قرون وسطیٰ میں اسلامی دنیا میں جگہ جگہ عظیم الشان کتب خانے قائم تھے اور اسلامی
دنیا کا کوئی قابل ذکر شہر یا قصبہ ایک اچھے کتب خانے سے خالی نہ تھا بالکل اسی طرح آج مغربی ممالک میں
دنیا کے سب سے بڑے کتب خانے ملتے ہیں۔ اور ترقی یافتہ ملکوں کا کوئی قابل ذکر شہر یا قصبہ ایک اچھے
کتب خانے سے خالی نہیں۔ یہ امر بے حد معنی خیز ہے۔ سیاسی عظمت براہ راست علمی اور ذہنی بیداری کی
پیداوار ہو یا نہ ہو اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کتابیں پڑھنے کا ذوق کسی قوم کی ذہنی بیداری کا
بہترین آئینہ ہے اور یہ ذہنی بیداری قومی اور سیاسی استحکام کے لیے سیمنٹ کا کام دیتی ہے۔

عظمت کے بعد انحطاط کی شرح بھی اسی نکتے میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ ایک وقت تھا کہ
ہارون الرشید کے ایلچی نے بازنطین کے عیسائی شہنشاہ سے اس کے پرانے کتب خانے کی کتابیں لطیفہ
تحفۃً طلب کیں تو شہنشاہ نے بڑے بڑے پادریوں سے مشورہ طلب کیا۔ انہوں نے یک زبا

کہا کہ اس سے زیادہ اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ تباہی کے جراثیم ہمارے ہاں سے نکل کر مسلمانوں کے ملک میں جا گھسیں یہ ساری کتابیں فوراً خلیفہ کو بھجوا دیجے اور فکر کا کلمہ پڑھیے ۔

بالآخر وقت نے یہ ورق بھی الٹا اور دنیا نے ایک نیا تماشہ دیکھا ۔ علم کے جن پیاسوں نے صحراؤں ۔ پہاڑوں اور سمندروں کے سینے چیر کر علم و حکمت کے خزانے جمع کیے تھے اور اس لیے جمع کیے تھے کہ آنے والی نسلیں ان کی بدولت سربلندی کے مقام پر رہیں اور انھیں عالموں اور سائنس دانوں کی اولاد نے یہ علمی خزانے کوڑیوں کے دام مغرب کے ہاتھ بیچ ڈالے ۔

ثم جاء من بعدھم ذریۃ اضاعوا الصلوٰۃ واتبعوا الشھوٰت فسوف یلقون غیا (ان کے بعد ایک ایسی پود آئی جنھوں نے نماز کو گنوا دیا اور اپنی گھٹیا خواہشوں کی پیروی کی ۔ وہ بہت جلد سرگردانی میں مبتلا ہو گئے)

فاعتبروا یا اولی الابصار

کتب خانے کی اہمیت

کتاب علم و حکمت کو محفوظ رکھنے اور اسے آگے پھیلانے کا ذریعہ ہے اور بس ۔ انسان جب سے دنیا میں آیا ہے وہ اس کوشش میں لگا ہے کہ اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ اچھا بنائے ۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے اس نے ان گنت تجربے کیے ہیں ۔ ان میں سے بعض تجربے کامیاب ثابت ہوئے ہیں اور بعض ناکام ۔ انسان کو ہمیشہ یہ فکر دامن گیر رہی ہے کہ اپنے کامیاب تجربوں کا حال بعد میں آنے والوں تک پہنچا دے تاکہ وہ ناکامی کی تلخیوں سے بچے رہیں ۔ اپنے کامیاب تجربوں اور مفید خیالوں کا حال محفوظ کرنے اور اسے دوسروں تک پہنچانے کے لیے انسان نے لکھنے پڑھنے کا فن ایجاد کیا اور کتاب وجود میں آگئی ۔

جدید سائنس نے معلومات کی نشر و اشاعت کے لیے کئی ایک نئے وسائل وضع کیے ہیں رسالے ، اخبار ، ریڈیو ، ریکارڈ ، فلم ، ٹیلی ویژن وغیرہ سب کے سب معلومات اور خیالات کے دوسروں تک پہنچانے ہی کے ذرائع ہیں ۔ ان میں بعض ایسے ہیں جو کتاب پڑھنے کے مقابلے میں بہت کم ذہنی کاوش

کی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس بات کو دیکھتے ہوئے بعض لوگوں کا خیال تھا کہ میڈیو بولنے والا
رفتہ رفتہ کتاب خوانی کو بے کار بنا کر رکھ دیں گے۔ لیکن عملی تجربے نے اس خیال کو غلط ثابت کیا گو
غلط ہے۔
یونیورسٹی کے ایک نشری تقریر کسی ایسے موضوع پر مزید روشنی ڈال سکتی ہے جس کے متعلق
کتب خانوں کے موجود ہو۔ اسی طرح فلم کسی ایسی مشین کی حرکات کی تشریح کر سکتی ہے جس پر کتب خانے
اور ان کی تیار کردہ فہرستیں دیے گئے ہوں۔ ٹیلی ویژن نشری تقریر اور متحرک تصویر کے فوائد کو یکجا کر دیتا ہے۔ مگر ان سائنسی
میں یہ کمی کہنے کی ۔۔۔وں میں ایک کمی بالکل عیاں ہے۔ جو شخص ان سے فائدہ اٹھانا چاہے اس کے لیے یہ کسی طرح ممکن
نہیں کہ اگر کوئی نکتہ سمجھ میں نہ آئے تو ساری بات کو از سر نو شروع کر دے۔ اور اگر ضرورت محسوس ہو تو
اس عمل کو چند بار دہرائے۔ یہ وہ علمی اور ذہنی ضرورت ہے جو صرف کتاب ہی پوری کر سکتی ہے۔ اسی
بنا پر یہ بات اب پوری طرح مان لی گئی ہے کہ سائنسی اور فنی علوم کی نشر و اشاعت کے لیے کتاب سے بہتر
اور کوئی ذریعہ نہیں۔

یہ اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ نشر و اشاعت کے جدید سائنسی وسائل کی بے پناہ ترقی کے باوجود مغربی
ملکوں میں کتب خانوں کی تحریک دن بدن مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے۔ سرکاری اور نیم سرکاری
ادارے، کتب خانے قائم کرنا اپنے بنیادی فرائض میں شمار کرتے ہیں۔ رفاہی ریاست کے تصور میں
اب یہ بات بھی شامل ہو چکی ہے کہ وہ اپنے شہریوں کو ہر قسم کے مسائل پر ضروری معلومات بہم پہنچائے
یہ غرض طرح طرح کے کتب خانے چلانے سے پوری کی جاتی ہے۔ نہ صرف یونیورسٹیاں، کالج اور
سکول اپنے یہاں اچھی لائبریریاں قائم کرتے ہیں۔ بلکہ بلدیاتی ادارے بھی عوامی کتب خانے قائم کرتے
ہیں۔ ان کتب خانوں میں ایسی کتابیں رکھی جاتی ہیں اور انھیں اس طور پر چلایا جاتا ہے کہ مقامی آبادی
(جس میں بچے اور بالغ دونوں شامل ہیں) ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔

مغرب میں کتب خانوں کی تحریک جس مقام پر پہنچ چکی ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا
ہے کہ اب وہ زمانہ بہت پیچھے رہ گیا جب کتب خانے کا انتظام کسی از کار رفتہ سپاہی یا بوڑھے استاد
یا سبکدوش شدہ کلرک کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ کتب خانے کا انتظام اب ایک باقاعدہ فن کا درجہ حاصل

کرچکا ہے جس کی تربیت حاصل کرنا ضروری ہے جس طرح کسی ٹیکنیکل کام کے لیے صرف تربیت یافتہ
ملک میں جا گھسیں تا ہے۔ اسی طرح کتب خانوں میں بھی صرف ایسے لوگ ملازم رکھے جاتے ہیں
[illegible] خانہ چلانے اور کتابوں کی فہرستیں مرتب کرنے کے فن کی تربیت لے رکھی ہو۔
صحراؤں۔ یہاں ہی پر اکتفا نہیں۔ کتب خانے ایسے اوقات میں کھلتے ہیں جب ان سے فائدہ اٹھانے
والے لوگ فراغت رکھتے ہوں۔ ان کی ہر دوسری سہولت کا بھی پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ کتب خانے
میں ان کے آرام سے بیٹھنے اور سکون سے پڑھنے کے لیے موسم کے مطابق سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں
غرض کتب خانے اس بات کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ لوگوں کے ذوق مطالعہ کو بڑھانے میں مدد دیں۔ وہ
یہ نکتہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ عوامی ذوق مطالعہ ایک بہت بڑی قومی دولت ہے اور اس دولت کے
بڑھانے پر جو کچھ صرف کیا جائے گا۔ اس سے قوم کو کئی گنا زیادہ فائدہ پہنچے گا۔

سفری کتب خانے

عوامی ذوق مطالعہ کو ترقی دینے اور اس کی تشفی کے لیے سفری کتب خانوں کی تحریک نے مغرب میں بڑی مقبولیت حاصل کی ہے۔ مغربی یورپ کا کوئی ایسا ملک نہیں جس میں سفری کتب خانے لوگوں کو ان کے گھروں میں کتابیں مہیا نہ کرتے ہوں۔ کناڈا۔ آسٹریلیا اور جدید تری آبادی والے دوسرے نئے ملکوں میں سفری کتب خانے بچوں کی تعلیم کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ تاہم ان کتب خانوں کا بڑا فرض بالغ شہریوں کو مزید تعلیم کے مواقع مہیا کرنا ہے۔

سفری کتب خانوں کی سب سے مضبوط تحریک اس وقت غالباً برطانیہ میں ہے۔ برطانیہ میں تعلیم مقامی حکومتوں کی ذمہ داری ہے۔ کاؤنٹی اور بروکونسلیں ہر قسم کے سکول چلاتی ہیں۔ اس صورت حال کے پیچھے یہ فلسفہ کام کرتا ہے کہ مقامی آبادی کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی پسند کی تعلیم کا بندوبست خود کرے اس حق کے ساتھ ہی اس پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ اپنی تعلیم کے اخراجات خود ادا کرے۔ چنانچہ یہ مقامی حکومتیں تعلیم کے لیے مقامی عوام پر محصول لگاتی ہیں اور ان کی خواہشات کے مطابق ہر قسم کی تعلیم کا بندوبست کرتی ہیں۔

اپنی تعلیمی ذمہ داری پوری کرنے کے لیے برطانیہ کی مقامی حکومتیں سفری کتب خانے بھی
چلا رہی ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد اس تحریک نے بہت زور پکڑا ہے۔ ڈاک خانہ دور سے
دور واقع گاؤں کی بھی خدمت بجا لاتا ہے۔ بالکل اسی طرح برطانیہ کے سفری کتب خانے
اپنے حلقے کی گشت کا ایک باقاعدہ پروگرام بناتا ہے۔ ہر گاؤں والے اچھی طرح جانتے ہیں
کہ فلاں روز کتابوں سے لدا ہوا ٹرک ان کے گاؤں میں آئے گا۔ موسم صاف ہو یا طوفانی سفری
کتب خانہ وقت کی پابندی سے اپنی گشت پوری کرتا ہے۔ جب یہ کسی گاؤں میں پہنچتا ہے
تو کچھ دیر کے لیے وہاں خوب چہل پہل پیدا ہو جاتی ہے۔ گاؤں کے لوگ اور آس پاس کی اکیلی
جھونپڑیوں میں رہنے والے لوگ کتب خانے کی گاڑی کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ نئی کتابیں
لیتے اور پرانی واپس کرتے ہیں۔ یہ علمی سلسلہ تھوڑی دیر اسی طرح جاری رہتا ہے اور بالآخر گاؤں
اور اس کے نواح میں ذہنی غذا کا ذخیرہ مہیا کر کے سفری کتب خانہ اگلے گاؤں کی راہ لیتا ہے۔

ان سفری کتب خانوں کے متعلق ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ صرف پُرلطف مطالعہ کا سامان ہی
فراہم نہیں کرتے بلکہ لوگوں کی علمی ضرورتیں بھی پوری کرتے ہیں۔ بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ گاؤں کا
کوئی آدمی نئی وضع کا سستا مکان بنانا چاہتا ہے یا مرغی خانہ کھولنا چاہتا ہے وہ سفری کتب خانہ
کے ناظم سے اس موضوع پر مفید کتابیں طلب کرتا ہے ناظم اس کی فرمائش نوٹ کر کے لے
جاتا ہے۔ اگر صدر دفتر سے مطلوبہ موضوع پر کام کی کتابیں مل جائیں تو اگلی گشت پر یہ کتابیں
فرمائش کرنے والے کو مل جاتی ہیں۔ لیکن اگر کتابیں صدر دفتر میں موجود نہ ہوں تو وہ صدر
دفتر والے انھیں لندن یا امریکہ یا دنیا کے کسی دوسرے ملک سے منگوا کر مہیا کرتے ہیں۔ اگر
کتاب نادر قسم کی ہو تو اس کے نقل کردہ نسخے فراہم کر دیے جاتے ہیں۔

غرض برطانیہ کے سفری کتب خانے صرف ذہنی تفریح کا سامان مہیا نہیں کرتے۔ وہ زندگی
کے حقیقی مسائل حل کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان کی مدد سے کئی لوگوں نے گھر بیٹھے بیٹھے اپنے
مشکل عملی مسائل حل کیے ہیں۔ سفری کتب خانہ صرف کتابیں جاری نہیں کرتا وہ دیہاتی عوام کو

یہ مشورہ بھی دیتا ہے کہ تمھیں اپنی زندگی بہتر بنانے کے لیے کن کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے
اور پھر خود ہی وہ یہ کتابیں مہیا بھی کرتا ہے۔

ہمارے کتب خانے

مغربی ملکوں کے مقابلے میں ہمارے یہاں کتب خانوں کی حالت اور ان کی تنظیم بڑی مایوس کن ہے۔ پاکستان کی سب سے بڑی لائبریریاں غالباً لاہور میں واقع ہیں۔ ان میں سے پہلی پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی ہے اور دوسری پنجاب پبلک لائبریری۔ کتابوں کی تعداد ان کی تنظیم و ترتیب اور دوسرے امور میں یہ دونوں کتب خانے جدید معیاروں پر اچھے خاصے پورے اترتے ہیں۔ مغربی پاکستان کی طرح مشرقی پاکستان کا اچھا کتب خانہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں واقع ہے۔

مگر ایک ایسے ملک میں جس کی آبادی آٹھ کروڑ سے اوپر ہو اور جو شاندار علمی روایات کا وارث ہونے کا مدعی ہو تین لائبریریاں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ کتب خانوں کی سہولت کے جو نئے معیار مغرب میں قائم ہوئے ہیں ان کے مطابق ہمارے ملک میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری اور پنجاب پبلک لائبریری کے پیمانے کے بیسیوں کتب خانے ہونے چاہئیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ہمیں ایک ایسا مرکزی قومی کتب خانہ بھی قائم کرنا چاہیے جو ملک میں کتب خانوں کی تحریک کو فروغ دے اور اس کی مناسب رہنمائی کرے۔

یوں نام کو ہمارے ہر کالج اور تقریباً ہر ہائی سکول میں ایک کتب خانہ موجود ہے مگر ان کتب خانوں کی عام کیفیت یہ ہے کہ ان کی دیکھ بھال تربیت یافتہ لوگوں کے ہاتھ میں نہیں۔ کالجوں میں لائبریری کا کام کسی کلرک کو سونپ دیا جاتا ہے اور اس کی مدد کے لیے ایک چپراسی مقرر کر دیا جاتا ہے۔ کتب خانے کا یہ غیر تربیت یافتہ عملہ ان ہی اوقات میں کام کرتا ہے جب کالج کھلا ہو۔ یہ بیچارے نہ کتابوں کے نظم و ترتیب کی نئی تکنیکوں سے واقف ہوتے ہیں اور نہ لائبریری کو طلبہ کے فارغ اوقات میں کھول سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کتب خانہ اپنی اصل غائت پوری کرنے میں بڑی حد تک ناکام رہتا ہے۔

سکولوں کے کتب خانوں کی حالت اس سے بھی ناگفتہ بہ ہے۔ اس کا انتظام مدرسے کے کسی ایک یا ایک سے زیادہ استادوں کو سونپ دیا جاتا ہے۔ ان بیچاروں کو تدریسی کام کا بوجھ اس طرح دبائے رکھتا ہے کہ کتب خانے کی طرف توجہ دینے کے لیے ان کے پاس کوئی وقت نہیں ہوتا۔ اگر کوئی غیر معمولی گرم جوشی رکھنے والا استاد اس مطلب کے لیے کچھ وقت نکال بھی لے تو وہ کتب خانہ چلانے کی جدید تکنیکوں سے واقف نہیں ہوتا اور یہ بے خبری بہت جلد اس کے کام کو پریشان کن حد تک بوجھل بنا کر رکھ دیتی ہے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ جن مدرسوں نے اپنے کتب خانوں پر کچھ روپیہ صرف کر رکھا ہے وہ بھی اپنے طلبہ کو ان سے کوئی قابل ذکر فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ کتابیں غیر مرتب شکل میں الماریوں میں بند رہتی ہیں اور ان میں بیشتر کتابیں صرف اسی وقت الماری سے باہر نکلتی ہیں جب ان کا انچارج اپنی یہ ذمہ داری کسی اور آدمی کو سونپنے لگے۔ ایسے مدرسوں کی بھی کمی نہیں جن میں سرے سے کوئی لائبریری موجود نہیں۔

بعض میونسپل کمیٹیوں نے بھی اپنے ہاں کتب خانے قائم کر رکھے ہیں۔ مگر ان کی حیثیت ریڈنگ روم سے زیادہ نہیں جس میں روزنامے اور کچھ رسالے پڑھنے کے لیے پیش کیے جاتے ہوں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان نام نہاد کتب خانوں کی خدمات سے بہت تھوڑے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جس پیمانے پر مغربی بلدیات اپنے شہریوں کے لیے کتب خانوں کی سہولتیں مہیا کرتے ہیں ہمارے ہاں ابھی اس کا تصور بھی موجود نہیں۔

ہمارے کتب خانوں کے سامنے ایک نازک مسئلہ یہ ہے کہ جمع کی جانے والی کتابیں کس زبان میں ہوں۔ تاریخی اسباب کی بنا پر ملک میں بڑے بڑے جو کتب خانے موجود ہیں ان کی بیشتر پونجی انگریزی کتابوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے کئی کتابیں اس قدر پرانی اور بوسیدہ ہو چکی ہیں کہ وہ اب کسی کام کی نہیں۔ قومی ضرورتوں کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے کتب خانوں کی زیادہ کتابیں قومی زبانوں (اردو، بنگالی) میں لکھی ہوئی ہوں۔ مگر حالت یہ ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری اور پنجاب پبلک لائبریری کی میں اس وقت کوئی ساٹھ فی صد کتابیں انگریزی میں ہیں اور باقی چالیس فی صدی اردو اور فارسی

عربی وغیرہ میں اس کے مقابلے میں جو دوسرے چھوٹے موٹے کتب خانے ملک کے تعلیمی اداروں میں جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں ان میں انگریزی کی کتابوں کا تناسب ۸۰ سے ۹۰ فی صد تک ہے اس صورت حال نے ان نام نہاد کتب خانوں کی افادیت کو اور بھی کم کر رکھا ہے

مرکزی کتب خانے کی ضرورت

ملک میں کتب خانوں کے نظام کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے اور اسے درست خطوط پر چلانے کے لیے ایک مرکزی قومی کتب خانے کا وجود ناگزیر ضرورت ہے۔ ہمارے کتب خانوں میں اردو کتابوں کی جو افسوسناک کمی ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کتب خانوں کو ملکی زبان میں شائع ہونے والی کتابوں کی کوئی جامع فہرست ہاتھ نہیں لگتی۔ اس قسم کی جامع فہرست تیار کرنا مرکزی کتب خانے کی ذمہ داری ہوا کرتی ہے۔

پاکستان کو بنے تیرہ برس گزر گئے۔ اس عرصے میں حکومت نے مختلف موضوعوں پر سینکڑوں کتابچے اور رسالے شائع کیے ہیں۔ لیکن آج اگر کسی کو اس لٹریچر میں سے کسی کتابچے یا رسالے کی ضرورت پیش آ جائے تو غالب امکان یہ ہے کہ اسے اس تلاش میں ناکامی ہو گی۔ وجہ یہ کہ یہ سارا لٹریچر کسی مرکزی کتب خانے میں محفوظ نہیں کیا جاتا۔ یہی حال ملکی اخباروں اور رسالوں کا ہے ان کے پرانے شماروں کی ضرورت پڑ جائے تو کوئی ایسا ادارہ موجود نہیں جس کی طرف رجوع کیا جا سکے۔

بالکل یہی حال اردو اور بنگالی میں چھپنے والی کتابوں کا ہے۔ ان زبانوں میں بہت سی اچھی کتابیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ مگر کتنی کتابیں ہیں جن کے ایڈیشن ختم ہو گئے اور آج کسی کو اگر ایک جلد کی تلاش ہو تو اس تلاش کو کامیاب بنانے کا کوئی یقینی ذریعہ موجود نہیں۔ صرف یہی نہیں، کسی کتاب کے شائع ہونے پر اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ ملک بھر کے کتب خانوں کو اس کے متعلق اطلاع مل جائے گی۔ ملکی کتب خانے کتابوں کی کھپت کے لیے بہترین منڈی ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں ایک تو یوں ہی کتب خانوں کی کمی ہے اور جو برے بھلے کتب خانے موجود ہیں۔ وہ بھی یہ بات معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں رکھتے کہ ملکی زبانوں میں کون کونسی اچھی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔

مرکزی کتب خانے کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ ملک میں پیدا ہونے والے ہر قسم کے سرکاری اور غیر سرکاری لٹریچر کی ایک جامع اور منظم فہرست تیار کرتا رہے۔ اس فہرست میں کتاب اور مصنف کے نام کے علاوہ اس کے مباحث کا آئینہ بھی درج کیا جاتا ہے اسی طرح اس فہرست میں ملکی اخباروں اور رسالوں کا شمار بھی رکھا جاتا ہے۔

مرکزی کتب خانے کو سرکاری طور پر یہ حق دیا جا سکتا ہے کہ ہر ناشر اپنی کتاب کی ایک یا دو جلدیں اسے مفت مہیا کرے۔ اس وقت صوبائی حکومت کی پریس برانچ کو اس قسم کا حق حاصل ہے لیکن اس اختیار کا استعمال سختی کے ساتھ صرف اخباروں اور رسالوں پر ہی ہوتا ہے۔ کتابیں عموماً اس کے دائرۂ کار سے باہر رہتی ہیں۔ پھر پریس برانچ ملکی مطبوعات کی کوئی فہرست مرتب نہیں کرتی۔ پریس برانچ کی دلچسپی صرف اس قدر ہے کہ آیا ملک میں کوئی قابلِ اعتراض لٹریچر تو شائع نہیں ہو رہا۔ اس سے آگے اسے کسی بات سے سروکار نہیں۔

مرکزی کتب خانہ ملک کی علمی زندگی میں جو اہم کردار ادا کرتا رہے اس کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ مغربی اور مشرقی پاکستان میں ایک ایک مرکزی کتب خانہ جلد از جلد قائم کیا جائے۔ بے شک اس کام پر روپیہ صرف ہوگا۔ لیکن ہر قومی ضرورت روپیہ صرف کرکے ہی پوری کی جا سکتی ہے۔ جب تک مرکزی کتب خانے کتب خانوں کی تحریک کی رہنمائی نہیں کرتے اس وقت تک اس تحریک میں جان نہیں آ سکتی۔

ابن خلدون

فارق العلائی

زبان اور اس کی تدریس

زبان: زبان تحصیل علم کا ذریعہ ہے۔ لسانی ملکہ سے تحصیل علم میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے اور اگر لسانی ملکہ حاصل نہ ہو تو علم کے مافیہ سے وقوف اور اس پر قدرت حاصل کرنا اتنا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ بات آج بھی اتنی ہی صحیح ہے جتنی چار پانسو یا ہزار برس پہلے تھی، اس لیے گفتگو، مذاکرہ مباحثہ، تدریس اور تحقیق میں ہمیشہ زبان ہی کو نمایاں حیثیت حاصل رہی۔ اچھی گفتگو وہی ہے جو دوسروں کو متاثر کر سکے۔ الفاظ کے انتخاب اور طرز ادا میں ایسی مناسبت ہو کہ قاری کی بات سامع کے دل میں گھر کر جائے۔ تحریر ایسی ہو کہ پڑھنے والے پر اس کا اثر ہو۔ لیکن تحریر و تقریر میں یہ پختگی کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ بے محابا یوں ہی یا خون جگر کی لالہ کاری سے۔

زبان الفاظ سے بنتی ہے اور ہر زبان میں الفاظ کا وافر ذخیرہ موجود ہوتا ہے جس میں وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ بولنے والا اسی ذخیرے سے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے کچھ الفاظ چن لیتا ہے۔ ان الفاظ کی بجائے خود علاحدہ علاحدہ کوئی حیثیت نہیں ہوتی لیکن قاری انھیں اس ترتیب سے بولتا ہے کہ ایک مکمل بات بن جائے۔ یہ قاری ایک عامی بھی ہو سکتا ہے اور ایک عالم بھی۔ لیکن دونوں کی زبان و بیان میں جو چیز نمایاں نظر آئے گی وہ ایک کی لسانی بے مائگی اور دوسرے کی زبان پر کوثر و تسنیم میں دھلے ہوئے، رچی ہوئی زبان اور بچے تلے الفاظ، یہ اس لیے کہ اول الذکر نے زبان کی تحصیل تکمیل کے لیے کوئی کاوش نہیں کی بلکہ اس کے ماحول نے اسے جو کچھ اور جس طرح سکھا دیا وہ اسے اسی طرح اپنا کر فارغ ہو گیا۔ اس کے برعکس موخرالذکر نے محض اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ الفاظ کی صوتی اور معنوی ہیئت کا تجزیہ کر کے ہر لفظ کو اپنا انداز اور اپنا اسلوب دیدیا۔ اس سے نہ صرف

یہ کہ اظہار خیال میں آسانی پیدا ہو گئی۔ بلکہ تحصیل علم کی دشوار گذار منزلیں بھی بتدریج طے ہوتی گئیں۔

خیالات اور الفاظ

الفاظ اور بیانات ترسیل خیالات کا ذریعہ اور پردہ ہیں۔ سننے یا پڑھنے والا انہی الفاظ اور بیانات سے مفہوم اخذ کرتا ہے یا انہی میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ کہنے والے نے ایک لفظ کو کیوں اکس لیے اور کس مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ اگر اس کی توضیح ہو جائے تو الفاظ کی یہی معنوی ہیئت خیالات کی نقاب کشائی کرتی ہے اور وہ ساری باتیں منظر عام پر آجاتی ہیں جو الفاظ کے پردے میں چھپی ہوئی تھیں۔ لیکن الفاظ کی معنوی ہیئت کی تفہیم کے لیے طالب علم کا زبان پر حاوی ہونا ضروری ہے[1]۔ اگر زبان پر قدرت حاصل نہ ہوئی تو ان دشواریوں سے قطع نظر جو تحصیل زبان کے ذہنی تجسس کے سلسلے میں پیش آتی ہیں تو الفاظ کے تتبع و تجزیے کے بعد بھی صحیح مفہوم کا اخذ کرنا ناممکن ہوگا۔

اس طرح سب سے پہلے طالب علم کا الفاظ کی معنوی ہیئت پر قدرت حاصل کرنا ضروری ہے یعنی وہ صرف لفظ کی ظاہری ہیئت ہی سے متعارف نہ ہو بلکہ یہ بھی جانتا ہو کہ اس سیاق و سباق میں اس کا مفہوم کیا ہے۔ یہ تفہیم فطری اور فوری ہونی چاہیے اور ایسی کہ صحیح خیالات اس کے دل و دماغ میں اتر جائیں۔ اول تو اس طرح کے خیالات کے مابین جو پردے حائل ہیں بالکل اٹھ جائیں یا اس قدر کہ خیالات سہل الفہم نہ ہوں تو کم از کم یہ پردے اتنے دبیز اور گہرے نہ رہ جائیں اور صرف اتنی سی بات وضاحت طلب رہ جائے کہ جو خیال پیش کیا گیا ہے اس کا مافیہ اور اس کے مسائل کیا ہیں[2]۔

یہ باتیں جو اس وقت تک کہی گئی ہیں ان کا تعلق صرف بات چیت اور زبانی تشریحات سے ہے لیکن جب طالب علم کو بات چیت اور زبانی تشریحات سے ہٹ کر تحریر شدہ مواد سے سابقہ پڑتا ہے تو اسے ایک اور پردہ یا حجاب اٹھانے کی ضرورت پیش آتی ہے سننا اور اس کا سمجھ لینا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ لیکن لکھے ہوئے الفاظ کے پڑھنے اور مفہوم اخذ کرنے میں تھوڑی سی دشواری ضرور

---

[1] روزن تھال۔ المقدمہ جلد سوم صفحہ ۳۱۶

[2] ایضاً

ہوتی ہے[1]۔ یہ پردہ خط اور لفظوں کی تحریری ہیئت کو لفظوں کی زبانی اور تصوراتی ہیئت سے الگ کرتا ہے
اس میں ایک کی حیثیت مستقل اور مقرون ہوتی ہے اور دوسرے کی غیر مستقل اور مجرد۔ جو لفظ بولے جاتے
ہیں ان کے اظہار کے لیے تحریر شدہ حروف کا اپنا اسلوب ہوتا ہے۔ جب تک اس سے واقفیت نہ ہو
یہ جاننا کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے یا اس کا مدعا کیا ہے بہت ہی مشکل ہے۔ اور اگر یہ واقفیت غیر مکمل ہے
تو جو بات کہی گئی ہے اس کا ادراک بھی نامکمل ہوگا۔ اس طرح طالب علم کے سامنے ایک اور پردہ
آجائے گا جو تفہیم خیال اور اس کے سائنٹیفک دست گاہ کے درمیان حائل ہوگا۔ اس پردے کا
اٹھانا پہلے پردے کی نسبت زیادہ مشکل ہے۔ لیکن اگر تفہیم الفاظ اور تفہیم تحریر کی عادت مستقل
ہو تو جو پردے اس کے اور اس کے خیالات کے درمیان حائل ہیں آپ سے آپ اٹھ جائیں گے۔ اس وقت
طالب علم کا کام صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ خیالات کے خلقی مسائل کو سمجھنے کی کوشش میں محو ہو جائے۔ خیالات
کا لفظوں اور تحریروں سے یہ تعلق ہر زبان میں یکساں ہوتا ہے۔ اگر طالب علم اسے اپنی عمر کے ابتدائی
حصے میں سیکھے تو اس پر دست گاہ حاصل کرنے میں دقت نہیں ہوتی اور وہ ایک مستقل عادت
بن جاتی ہے۔ لیکن اگر زبان زندگی کی طویل مدت گذارنے کے بعد سیکھی جائے تو زبان تو آجائے گی
مگر اس میں وہ رچاؤ پیدا نہیں ہوتا جو صرف اہل زبان کا خاصہ ہے[2]۔

غیر زبان

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ایک زبان جو عام بول چال کی زبان ہے ضروری نہیں کہ اس پر
ہر شخص کو یکساں دست گاہ حاصل ہو۔ غیر زبان پر قدرت حاصل کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہوتا ہے
اس کی صرف و نحو، ذخیرۂ الفاظ، اصول بیان، روزمرہ اور اس کے بول ٹھٹول، حتیٰ کہ اس کے مزاج
و آہنگ سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے وقت اور صبر و تحمل دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔
زبان ایک ایسا جوہری غبارہ ہے جو فضا میں اڑ رہا ہے۔ اس سے صحیح و سالم وہی اڑ سکتا ہے جو عمل
کے ردّ عمل پر بھی حاوی ہو۔

۱۔ دوزن تعال المقدمہ جلد سوم صفحہ ۲۹۶

۲۔ " " " صفحہ ۱۲ ۔ ۳۱۷

غیر زبان پھر بھی غیر زبان ہوتی ہے اور اس میں لسانی ملکہ حاصل کرنے میں اسے بھی دشواری ہوتی ہے جس نے تحصیل زبان میں عمر کا بہت بڑا حصہ صرف کیا ہو اور اسے وہ ماحول بھی نصیب ہوا ہے جس میں یہ زبان بولی جاتی ہے۔ اس کی توضیح ہندوستان میں انگریزی زبان کے اجراء سے ہو جاتی ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں انگریزی ملک کی تعلیمی، دفتری اور کاروباری زبان بن گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشی ضروریات کے پیش نظر ایک طالب علم چار یا پانچ سال کی عمر سے انگریزی کا لکھنا پڑھنا اور بولنا شروع کر دیتا ہے اور اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ اسی زبان کی تحصیل و تکمیل میں صرف کر دیتا ہے لیکن اس کا ماحول مصنوعی اور اس کی معلومات سطحی ہوتی ہیں وہ علمی اصطلاحات سے واقف ہو جاتا ہے لیکن اصطلاحات کی اصل غایت سے بے خبر ہوتا ہے، وہ جسم کو پالتا ہے لیکن روح کو سمجھ نہیں سکتا اور اس کا علم جو وہ غیر زبان کی وساطت سے سیکھتا ہے اسی زبان کے چوکھٹے میں بند ہو کر رہ جاتا ہے۔ نہ اس کی آنکھوں میں علم کی چمک ہوتی ہے اور نہ چہرے پر تحقیق کا وقار۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ اپنے گرد لسانی وقار کا ایسا ہالہ بنا لیتا ہے کہ نہ خود اس سے باہر نکل سکتا ہے اور نہ اس میں کسی کو داخل ہونے کی اجازت دیتا ہے۔ اس کی کیفیت اس طوطے کی سی ہوتی ہے جو ہر وقت اپنے منہ میاں مٹھو کہا کرتا ہے۔ لیکن اپنوں سے الگ ہو چکا ہے اور ایسا کہ اب ہم صفیران چمن کے ساتھ فضا میں پرواز کی طاقت بھی باقی نہیں رہی اور اسیری میں صیاد کی بانی سیکھ کر اپنی بانی بھی بھول گیا ہے۔

بعینہٖ یہی کیفیت غیر زبان میں علم حاصل کرنے میں ہوتی ہے۔ نہ اپنا باقی نہ اپنا بھانا۔ اس کا اثر بُرا پڑتا ہے اور اس حد تک کہ رفتہ رفتہ طالب علم کی جملہ فکری صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔ نہ زبان پر قدرت نہ علم پر عبور۔ یہی وجہ ہے کہ سر سید جہاں علوم جدیدہ اور انگریزی زبان کی تحصیل کے قائل تھے انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے حق میں نہ تھے[1]۔ زبان بجائے خود مقصود بالذات نہیں تحصیل علم کا ذریعہ ہے۔ غیر زبان میں علم حاصل کرنا اس سبب مشکل ہو جاتا ہے کہ جو زمانہ تحصیل علم کا

---

[1] عزیز، ایم اے۔ یونیورسٹی ایجوکیشن ان پاکستان صفحہ ۱۰۱

ہوتا ہے، وہ تحصیل زبان پر صرف ہو جاتا ہے۔ اور ابھی زبان پر قدرت حاصل ہونے نہیں پاتی کہ تحصیل علم کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے۔[۱]

ابن خلدون نے تدریس زبان پر جو قلم اٹھایا تو اس کے پیش نظر عربی زبان کی دو مسلمہ حیثیتیں تھیں ایک یہ کہ عربی ایک بہت بڑے طبقے کی مادری زبان تھی اور چوں کہ اس طبقے کو بلادِ اسلامیہ پر صدیوں سیاسی برتری حاصل رہی۔ اس لیے یہی زبان دفتری زبان بن گئی۔ بازار میں لین دین اور خرید و فروخت کی زبان اور مدرسوں میں تعلیم کی زبان۔ دفتری زبان کو چوں کہ برتری حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے عربوں کی جہاں گیری کے جلو میں عربی زبان بھی پھیلتی گئی اور اس کا اثر بلادِ عربیہ سے نکل کر بلادِ عجمیہ میں بھی پہنچ گیا۔ تا این کہ شیراز و اصفہان اور سمرقند و بخارا یکساں طور پر متاثر ہوئے۔ عربی زبان کی تحصیل و تکمیل میں وہ لوگ بھی حصہ لینے لگے جن کی گھریلو زبان عربی نہ تھی، یہ دوسرا طبقہ پہلے [illegible] سے کسی طرح کم اہم نہ تھا۔ مسلمانوں کے دورِ کامرانی میں علما اور فضلا، کی بہت بڑی تعداد عجمی تھی[۲] انھیں یقیناً عربی زبان کی تحصیل و تکمیل میں دشواری ہوتی ہوگی، لیکن اس اختلاط سے رفتہ رفتہ فارسی اور ترکی اور دوسری بولیوں نے عربی کے فیضان سے اتنا فائدہ اٹھایا کہ ان میں دخیل الفاظ کی تعداد بڑھتی گئی اور چوں کہ عجمی زبانیں عربی رسم الخط میں لکھی جانے لگیں۔ اس لیے عربی زبان کے سیکھنے میں نسبتاً آسانی ہو گئی ہو گی۔ مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ صاحب احیاء العلوم یا صاحب قانون کی اپنی زبان عربی نہیں تھی۔ مصر، طرابلس اور المغرب میں عربوں سے پہلے جو زبانیں بولی جاتی تھیں وہ آسنی جان دار ثابت نہ ہوئیں۔ چناں چہ قبطی اور بربری بھی اپنی مقامی بولیوں کو چھوڑ کر عربی زبان بولنے لگے۔ اندلس کی کیفیت اس سے ذرا مختلف تھی۔ اگرچہ عربوں کی اس فرنگی کالونی میں بھی دربار اور علم و فن کی زبان عربی تھی۔ اور اگرچہ ہزاروں عربی الفاظ ہسپانوی زبان میں داخل ہو چکے تھے لیکن چوں کہ ملک کی بہت بڑی آبادی عیسائی تھی اس [illegible] ہسپانوی زبان لاطینی رسم الخط میں لکھی جاتی رہی۔ اس سے عربی کے دخیل الفاظ کی شکل و صورت، ہیئت اور بعض اوقات مفہوم بھی

---

[۱] علی گڑھ میگزین ۱۹۵۵ء (سرسید نمبر) صفحہ ۱۲

[۲] روزن تھال، المقدمہ، جلد سوم صفحہ ۳۱۱

اختلاف پیدا ہوگیا۔ یہ اختلاف عربوں کے اختلاط کے بعد اور نمایاں ہوگیا۔ اندلس میں عربوں کا سیاسی استیلا تقریباً سات سو برس رہا اور سقوط غرناطہ کے بعد بھی کم و بیش ڈیڑھ سو برس تک اندلس کی کاروباری زبان عربی ہی رہی۔ لیکن اس کے باوجود ہسپانوی خواص اور اندلسی عربوں سے قطع نظر ہسپانیہ میں عربی زبان کی حیثیت ایک غیر زبان ہی کی رہی۔

اس پس منظر کو سامنے رکھ کر ابن خلدون نے زبان کی لسانی اور بیانی اہمیت کا جائزہ لیا اور زبان سیکھنے کی ایسی راہ تجویز کی جو دونوں کے لیے مفید ہو۔ اسلام عرب کی بدویانہ زندگی سے نکل کر جب دجلہ و فرات اور نیل کی تہذیبوں سے ٹکرایا اور مسلمانوں کو ان پر سیاسی اقتدار حاصل ہوا تو رفتہ رفتہ عربوں کے بدویانہ خصائل پر بھی ان کا اثر پڑا۔ ان کے دلوں میں حصولِ علم کا جذبہ پیدا ہوا۔ اور انھوں نے دوسری قوموں کے سرمایۂ علم کو عربی زبان میں منتقل کیا اور ان میں اپنے خیالات کو اس طرح سمویا کہ اب وہ ان کا اپنا سرمایہ بن گیا۔ اور پھر علم کی ہر شاخ پر اتنی تحقیق کی کہ وہ اپنی اس کاوش میں غیر عربوں سے بہت آگے نکل گئے۔ حتیٰ کہ دوسری زبانوں کی کتابیں متروک ہوگئیں، ہر علم اور ہر موضوع پر عربی زبان میں مستقل کتابیں لکھی گئیں اور اس طرح عربی زبان ایک علمی زبان بن گئی، جس کا جاننا ہر طالب علم کے لیے ضروری ہوگیا عہ۱

اس ضرورت کے پیش نظر کہ عربی دنیا کی اہم ترین علمی زبان ہے اور مختلف علوم پر دسترس حاصل کرنے کے لیے عربی کا آنا ضروری ہے۔ ابن خلدون نے اس کی تحصیل و تکمیل کی راہیں تجویز کی ہیں۔ اس کے اپنے خیال میں ہر شخص کے لیے عربی کا جاننا اور اس پر قدرت حاصل کرنا اس لیے ضروری ہے کہ دوسری زبانوں کا سرمایۂ علم اتنا قدیم ہوگیا ہے کہ اب ان کے سیکھنے میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی۔ عہ۲ اس زبان کو سیکھنا کارآمد ہوتا ہے [illegible]م کو ایک نئی شاہراہ پر لے جا سکے۔ اور اس عہد کی ترقی یافتہ زبانوں میں یہ مقام صرف عربی کو حاصل تھا۔ اس لیے ابن خلدون کا یہ نتیجہ نکالنا کہ عربی زبان کا سیکھنا ضروری ہے، غلط نہ تھا۔ لیکن اس کا یہ کہنا کہ عربی کی تحصیل و تکمیل کے بعد دوسری زبان کی تحصیل و تکمیل کی ایسی ضرورت نہیں رہتی

عہ۱ ابن خلدون۔ المقدمہ جلد سوم صفحہ ۳۱۷
عہ۲ ایضاً ۳۱۷—۱۸

صحیح نہیں۔ اس کا یہ نظریہ عربوں کی سیاسی برتری کا پیدا کردہ تھا۔ خود اس کے عہد میں بلاد شرقیہ کی علمی اور درباری زبان فارسی تھی اور شمال کے بعض علاقے ایسے تھے جہاں ترکی کو بھی خاصی فوقیت حاصل تھی یورپ میں بھی عربی، یونانی اور لاطینی زبان کی علمی اور تحقیقی کتابوں کو جرمنی، فرانسیسی، اطالوی اور دوسری مقامی زبانوں میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ علم ایک صدقۂ جاریہ ہے کسی زبان و مقام کا پابند نہیں۔ عربوں نے تحقیق و تدقیق کا دامن چھوڑا تو علم کی یہ مہارت ان کی سیاسی سیادت کی طرح قدرت نے دوسروں کے سپرد کر دی۔

عربی کی علمی اہمیت کی توضیح کے بعد ابن خلدون نے عجمیوں کی عربی کا ذکر کیا ہے۔ وہ عربی کس طرح سیکھ سکتے ہیں۔ یا انھیں عربی کس طرح سیکھنی چاہیے۔ عجمیوں کے لیے عربی غیر زبان ہے اور اس سے پہلے کہ وہ عربی زبان لکھنا پڑھنا شروع کریں۔ وہ اپنی روزمرہ کی گفتگو میں ایک ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جو عربی نہیں ہوتی۔ اس طرح اس زبان میں ان کی عادتیں راسخ ہو جاتی ہیں۔ الفاظ کے تلفظ، لب و لہجہ۔ یہاں تک کہ تحریر و تقریر میں اس کا اسلوب اور انداز مختلف ہوتا ہے۔ اب جب وہ عربی سیکھنا شروع کرتے ہیں۔ انھیں لفظوں کے صحیح مخارج، گفتگو اور اسالیب بیان پر قدرت حاصل کرنے میں دشواری ضرور ہوتی ہے۔ اور عربی کی تحصیل و تکمیل میں اس کی اپنی زبان کا پرتاؤ جھلکتا ہے۔

اپنے اس نظریے میں ابن خلدون بعض برطانوی اہل فکر کا پیش رو ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں انگریزی حکومت دنیا کے عریض و بسیط میں پھیل گئی تو انگریزی زبان کو بھی وہی سیاسی تفوق حاصل ہو گیا جو عربی زبان کو اس سے پہلے حاصل تھا۔ انگریز مدبرین سیاست غیر انگریزوں کو زبان و مزاج کے لحاظ سے انگریز بنانے کے آرزومند تھے۔ یہ ابتدائی حکمت عملی مدبرین سیاست نے مرتب کی اور ان کی اس حکمت عملی پر انگریز معلموں نے نیک نیتی سے عمل کیا اور ایک مختصر سی مدت میں خود مقامی آبادی میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے جو انگریزی کا راگ الاپتے رہے۔ بچوں کو شروع ہی سے انگریزی سکھائی جائے۔ عام بول چال میں انھیں انگریزی کے الفاظ سکھائے جائیں اور ان میں کچھ انگریزی خو پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔ بچے ابا اور اماں کی بجائے

ڈیڈی اور ممی کہنا تو سیکھ گئے لیکن ان کا ماحول انھیں اپنی بولی سے بے نیاز نہ کر سکا۔ اس طرح ان کی اپنی شخصیت میں ایک کمی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ نظریہ اس خیال پر مبنی ہے کہ قوم کی ثقافتی زبان کو اس طرح حاصل کیا جائے کہ اہل زبان اور اس زبان کے سیکھنے والوں میں کوئی نمایاں فرق باقی نہ رہے۔ حروف کے مخارج، الفاظ کی ترتیب اور جملوں کی ساخت میں یکسانیت ہو۔ یہ نظریہ بجائے خود غلط نہیں۔ اہل ذوق کو یہ زبان اس طرح سیکھنی چاہیے لیکن ایک غیر زبان کو ساری قوم پر مسلط کرنا اور اسے اس طرح سکھانا صحیح نہیں۔ اس وقت دنیا تہذیب و ترقی کے جس دور سے گذر رہی ہے، اس کے تقاضے کچھ مختلف ہیں اور ہمیں انھیں تقاضوں کے پیش نظر دوسری زبانوں کی تحصیل و تکمیل کا خاکہ مرتب کرنا چاہیے۔

اس بنیادی نظریے سے کہ عربی زبان بچوں کو ان کی اپنی لسانی پختگی سے پہلے سکھانی چاہیے ابن خلدون نے دو نتیجے نکالے۔ ایک یہ کہ طالب علم کی لسانی عادات کی پختگی کی وجہ سے اس کے لیے عربی میں پختگی پیدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر وہ شروع ہی سے عربی بولتا ہے تو وہ اچھی عربی بول سکے گا۔ اور اگر شروع سے عربی نہیں بولتا تو اچھی عربی نہیں بول سکے گا۔ دوسرے یہ کہ اسی طرح اگر اس کی اپنی زبان کا خط پختہ ہو گیا ہے تو عربی تحریر کے مفاہیم و مطالب کے سمجھنے اور ان پر قدرت حاصل کرنے میں اسے خاصی دشواری ہو گی [1]

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ عربی زبان کو غیر زبان کی حیثیت سے سیکھتے ہیں وہ اپنی تحقیق و تدریس میں عربی متن اور اس کی تشریحات کو براہ راست کتابوں سے نقل نہیں کرتے بلکہ انھیں بآواز بلند پڑھتے ہیں۔ اس سے انھیں کسی قسم کی کوئی مزاحمت نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی بدولت خیالات اور نظریات سے واقف ہو جاتے ہیں [2] اس واقفیت کے بعد وہ اس کی پیچیدگیوں کا حل تجویز کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کسی شخص نے زبان کو اس وقت سیکھا ہے جب اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ

---

[1] روزن تھال۔ المقدمہ، جلد سوم صفحہ ۳۱۸

[2] ایضاً

وہ کچھ سیکھ رہا ہے۔ اور بعد میں جب وہ زبان کو زبان کی حیثیت سے سیکھتا ہے تو الفاظ و بیان اور خیالات کے درمیان کوئی پردہ باقی نہیں رہتا۔ اس کی آنکھیں الفاظ کے سینے کو چیرتی ہوئی اس کی تہہ تک پہنچ جاتی ہیں [1]۔ بات واضح ہو جاتی اور اس بنیاد پر وہ علمی تحقیق کی نئی عمارت تعمیر کر سکتا ہے۔

ابن خلدون نے جو بات عربی کے متعلق کہی وہی بات آج اس ملک میں انگریزی پر صادق آتی ہے اگرچہ طالب علم بڑی محنت سے زبان سیکھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن زبان پر قدرت حاصل نہیں ہوتی اور وہ انگریزی تحریروں کے بین السطور مفہوم کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ ایسے لوگ جنھیں فی الواقع انگریزی آتی ہو اور انھیں اس میں لسانی ملکہ حاصل ہو گیا ہو بہت کم نظر آتے ہیں۔ شاید لاکھ میں ایک کا مفروضہ بھی صحیح نہ ہو۔ بات اس سے کہیں نیچے جاتی ہے۔

ان دشواریوں کے باوجود ابن خلدون کے خیال میں مستقل مطالعہ مشق اور تحریر سے لسانی ملکہ پیدا ہو جاتا ہے [2]۔ عجمی علما نے عربی زبان میں تحقیق اور تصنیف کا جو کام کیا ہے۔ اس سے اس کی توضیح ہو جاتی ہے۔ جامعین احادیث نبوی، رازی، بو علی سینا، البیرونی۔ الغزالی غیر عرب تھے۔ لیکن عربی پر انھیں اتنی قدرت حاصل تھی کہ وہ بے کم و کاست ایک بات کو سیدھے سادے انداز میں کر سکتے تھے۔ یہ مثالیں ان غیر عربوں کی ہیں جنھوں نے عربی میں لسانی ملکہ پیدا کرنے کے لیے کاوش کی اور چونکہ خود بہت ذہین تھے اس لیے آگے نکل گئے۔ لیکن اس کے باوجود ابن خلدون کے خیال میں اگر ایک ہی پائے کے دو عالموں کا موازنہ کیا جائے جس میں ایک کی زبان عربی ہو اور دوسرے نے عربی کو بحیثیت غیر زبان سیکھا تو اول الذکر کو فوقیت حاصل ہو گی اور موخر الذکر کو دشواریاں پیش آئیں گی۔ اس لیے کہ اس کی لسانی عادتیں اس کی اپنی زبان میں پختہ ہو چکی ہیں۔ اس کے بعد ابن خلدون نے غیر عربوں کی تفہیم زبان کا تجزیہ کیا ایک غیر عرب مسلمان جو حصول علم کے شوق میں ایک ایسی زبان سیکھتا ہے جو اس کی اپنی زبان نہیں اور ایک ایسا خط پڑھنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے اپنے رسم الخط سے مختلف ہوتا ہے۔

---

[1] روزن تھال۔ المقدمہ جلد سوم صفحہ ۳۱۸

[2] ایضاً ۳۱۹

تو یہ زبان اور یہ رسم الخط حصولِ علم اور اس کے درمیان ایک پردہ بن جاتے ہیں۔ اور اس میں ایرانی، ترک، بربر، فرنگی، سیمی اور وہ لوگ جن کی زبان عربی نہیں ہے برابر کے شریک ہیں[1]

یہ نظریہ بھی تمام تر حقائق پر مبنی نہیں۔ ترکی اور فارسی دونوں زبانیں عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھیں اور ان دونوں زبانوں میں عربی کے دخیل الفاظ کی بھی کثرت تھی۔ اس لیے ان کا ہسپانوی زبان سے موازنہ کرنا درست نہیں۔ فارسی اور ترکی بولنے والے طلبہ کو اطالوی یا ہسپانوی طلبہ سے عربی سیکھنے میں یقیناً آسانی ہوتی ہوگی۔

[1] روزن تھال المقدمہ جلد سوم صفحہ ۳۱۹

نرگسیت اور احساس کہتری

مسعود حسین صدیقی

نرگسیت ترجمہ ہے NARCISSISU کا۔ سب سے پہلے یہ اصطلاح عالم نفسیات سگمنڈ فرائڈ نے استعمال کی۔ NARCISSUS زمانہ قدیم میں ایک یونانی تھا۔ اس کے متعلق روایت کی جاتی ہے کہ یہ اپنا عکس دیکھ کر اس قدر متاثر ہوا کہ خود اپنا عاشق بن گیا۔ نرگسی (NARCISSISTIC) انسان سے مراد ایسا شخص لیا جاتا ہے۔

ا۔ جس کی تمام تر محبت اس کی اپنی ذات پر مرکوز ہو۔

ب۔ جو اپنی ذات کو ہر طرح مکمل اور اعلیٰ سمجھتا ہو۔

ج۔ جسے صرف اپنی ذات سے دل چسپی ہو۔

د۔ جو اپنی کسی قسم کی خواہش یا ضرورت کے لیے خود کو دوسروں کا محتاج نہ محسوس کرے۔

تھوڑی بہت نرگسیت ہر انسان میں پائی جاتی ہے۔ ہر شخص کو اپنی ذات سے محبت ہوتی ہے اور وہ اسے بہتر سمجھتا ہے۔ لیکن نرگسی انسان میں یہ چیزیں اس قدر بڑھ جاتی ہیں کہ وہ طبعی انسانوں سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ اس کا تعلق صرف اپنی ذات سے رہ جاتا ہے۔

نرگسیت کا مفہوم واضح کرنے کے لیے ہمیں ایام طفولیت کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ چھوٹا بچہ اپنی ذات میں گم رہتا ہے، دوسرے اس کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ لیکن اسے صرف اپنی ذات سے تعلق ہوتا ہے رفتہ رفتہ اسے بیرونی دنیا میں دل چسپی ہوتی جاتی ہے اور بڑے ہو کر وہ قربانی و ایثار کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے مقابلے میں قابل ترجیح سمجھنے لگتا ہے۔ چھوٹا بچہ خود بین و خود غرض ہوتا ہے۔ معاشرہ اُسے اخلاص ایثار، اخوت، ہمدردی وغیرہ نئی قدریں سکھاتا ہے۔ طبعی انسان بڑے ہو کر کسی حد تک خود غرض بھی ہوتے ہیں اور کسی حد تک ایثار پسند بھی۔ کبھی وہ اپنی رائے منوا لیتا ہے، کبھی اسے دوسروں کی بات ماننی

پڑتی ہے۔ نرگسی انسان پر معاشرہ کی ان قدروں کا اثر نہیں ہوتا۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اپنی ذات کے لیے کرتا ہے۔

نرگسی انسان کو جیسا کہ اوپر تحریر کیا جا چکا ہے اپنی ذات سے محبت ہوتی ہے۔ صرف وہ شخص اس کی محبت حاصل کر سکتا ہے کہ یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ نرگسی شخص کو اپنے بچوں سے خاص محبت ہوتی ہے۔ میرے خیال میں یہ امر بالکل حیران کن نہیں۔ والدین اپنے بچوں کو اپنی ذات کا جزو تصور کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے نرگسی انسان کا اپنے بچوں سے محبت کرنا اپنی ذات سے محبت کرنا ہے۔ نہ صرف بچوں سے بلکہ میرے مشاہدہ میں آیا ہے کہ ایسے اشخاص اپنے کپڑوں سے، اپنے گھر سے بالخصوص اپنے کمرے سے اور ہر اس چیز یا شخص سے محبت کرتے ہیں جسے یہ اپنی ذات کا جزو سمجھتے ہوں۔ معمولی قسم کا کپڑا ان کے جسم سے لگ کر ان کی نظر میں اعلیٰ قسم کا ہو جاتا ہے۔ بات صرف یہ ہوتی ہے کہ ہر چیز یا ہر شخص ان کے انتخاب میں نہیں آ سکتا اور کوئی شخص اپنی کوشش سے ان کی محبت حاصل نہیں کر سکتا۔ نرگسی لڑکے کتنی لڑکیوں کو مایوس کرتے ہیں اور نرگسی لڑکیاں کتنے لڑکوں کے لیے مصیبت بن جاتی ہیں۔

ان کا انتخاب نہایت SUBJECTIVE ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر کوئی شخص کسی نرگسی انسان کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہا ہو تو اُسے خود اعتمادی نہیں کھونی چاہیے۔ ایک اور امر قابل ذکر ہے کہ چونکہ نرگسی شخص کو صرف اپنی ذات سے محبت ہوتی ہے۔ اس لیے اسے ایسے اشخاص کی دلی حالت کا اندازہ نہیں ہو سکتا جنھیں دوسروں سے محبت ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دوسروں کے دام عشق میں پھنس کر انسان کی انا کمزور اور دل رقیق ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف نرگسی انسان کا دل اس اثر سے بچا رہتا ہے۔ کیونکہ یہاں محب اور محبوب دونوں اس کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ لازماً ایسے اشخاص سنگ دل ہوتے ہیں۔ اور دوسروں کا درد انھیں متاثر نہیں کرتا۔ یہ اگر کسی کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ انھیں اس سے ہمدردی ہوتی ہے بلکہ اس لیے کہ ان کی ذات کا ایک معیار ہوتا ہے اور حسن سلوک ایسے نرگسی شخص کے

اس معیار میں شامل ہوتا ہے۔ کوئی شخص محض اپنی آہ و زاری یا زیادہ سے زیادہ نرگسی شخص کے دل کو متاثر نہیں کرسکتا۔ میرے سامنے دو نرگسی اشخاص کی مثالیں ہیں۔ ان میں سے ایک حد درجہ سخی ہے اور دوسرا انتہائی درجہ ممسک۔ ان دونوں کا طرز عمل ان کی ذاتی اقدار پر مبنی ہے۔ ایک کی ذات سخاوت کو اہم قدر سمجھتی ہے۔ دوسرے کی ذات دولت جمع کرنے کو۔ جہاں تک دلی ہمدردی کا تعلق ہے جس نرگسی انسان کے متعلق میں نے تحریر کیا ہے کہ وہ حد درجہ سخی ہے اس کا سلوک اپنی رفیقۂ حیات سے نہایت سنگدلانہ اور ظالمانہ رہا ہے۔ بیوی نہایت خدمت گذار، نیک طینت اور بے زبان تھی۔ اس کی مرضی کے خلاف ایک ایسی چیز کردی گئی جس نے اسے دلی صدمہ پہنچایا اس کا تدارک ممکن تھا لیکن صرف یہ نرگسی خاوند ہی کرسکتا تھا۔ لیکن اس کی آہ و زاری اپنے خاوند کے دل کو بالکل متاثر نہ کرسکی۔ جب وہ چیخ و پکار کرتی تھی تو اس کی نقلیں اتاری جاتی تھیں، اسی طرح تڑپ تڑپ کر وہ ختم ہوگئی لیکن نرگسی خاوند کا دل کبھی رام نہ ہوا۔

اسی طرح ایک نرگسی لڑکی میرے مشاہدہ میں آئی ہے۔ اسے اپنے بھائی سے کسی بات پر شکایت پیدا ہوگئی۔ وجہ یقیناً کسی بات پر اختلاف رائے یا مفاد کا تصادم ہوگی۔ اس کا یہ بھائی بہت زیادہ علیل ہوگیا اور ایک ماہ سے زیادہ بستر پر پڑا رہا۔ والدہ اور دوسرے عزیز کبھی کبھی روتے دیکھے گئے لیکن اس نرگسی لڑکی پر اس کا مطلق اثر نہ ہوا۔ اس نے علالت کے دوران میں کبھی بھائی کی بیماری پر بیمار پرسی نہیں کی، تیمارداری تو کجا۔ ایک دو مواقع ایسے بھی آئے کہ بھائی نے پینے کو پانی مانگا لیکن اس نرگسی بہن نے اس پر دھیان نہ دیا۔ اس لڑکی کی زبانی میں نے یہ سنا ہے کہ جو شخص اس کی مرضی کے مطابق نہ چلتا ہو اس کے جسم کے ٹکڑے بھی کردیے جائیں تو اس (نرگسی لڑکی) کے دل پر اس کا اثر نہ ہوگا، ایسے شخص پر اسے کبھی رحم نہیں آسکتا۔

پیشتر اس کے کہ میں نرگسی انسان کی باقی خصوصیات پر روشنی ڈالوں یہ ضروری ہوتا ہے کہ احساس کہتری کا مطلب واضح کروں اور یہ بھی بیان کروں کہ میں نے نرگسیت اور احساس کہتری کو یکجا کیوں کیا ہے۔ احساس کہتری عدم خود اعتمادی کا دوسرا نام ہے۔ یہ احساس دو شکلیں اختیار

کر سکتا ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ یہ احساس رکھنے والا شخص قدم قدم پر خود کو کہتر محسوس کرے مجلسی زندگی سے گھبرائے۔ نئے ماحول میں جانے کی جرأت نہ کرے۔ ہمیشہ پیچھے پیچھے اور الگ تھلگ رہنا پسند کرے۔ جیسے کام کرتے وقت بار بار یہ احساس ہو کہ وہ ٹھیک نہیں کر رہا اور دوسرے اسے کبھی پسند نہیں کریں گے وغیرہ وغیرہ۔

احساس کہتری کی یہ صورت اور نرگسیت ایک دوسرے سے سب مختلف ہیں، نرگسی شخص کسی جگہ جاکر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی موجودگی نے اس جگہ کا رتبہ بڑھا دیا ہے۔ اس کے برعکس احساس کہتری کی یہ شکل بار بار ایسے شخص کو مضطرب کرتی ہے کہ وہ اس جگہ کے قابل نہیں، نرگسی انسان کی قوت فیصلہ قابل رشک ہوتی ہے۔ اس کے برعکس احساس کہتری کی یہ شکل قوت فیصلہ کا فقدان ظاہر کرتی ہے۔

احساس کہتری کی دوسری شکل اس سے مختلف ہے۔ جب کوئی شخص خود کو کسی لحاظ سے کہتر سمجھتا ہے تو اس کے طرز عمل کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(الف) مندرجہ بالا یعنی مجالس سے بھاگنا اور ہر قدم پر خود اعتمادی کا اظہار کرنا۔

(ب) اس احساس کو دور کرنے کی سعی کرنا اور اس میں کامیاب ہو جانا۔

(ج) اس کوشش میں ناکام رہنا اور بعد ازاں ایسا [illegible] اس پر تیار کرنا کہ اسے احساس کہتری ہے ہی نہیں بلکہ وہ دوسروں سے بہتر ہے۔ ایسا شخص لاشعوری طور پر خود کو کہتر سمجھتا ہے لیکن شعوری طور پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ کہتر نہیں ہے۔

کوشش کے کامیاب اور ناکام رہنے کا اندازہ نہایت آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی شخص نے اپنی خامی یا خامیوں کو دور کرنے کی سعی کی ہے اور معاشرہ نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ فی الواقع اس شخص کی وہ خامی یا خامیاں دور ہو چکی ہیں یا اس کی وہ خامی تو دور نہیں ہوئی لیکن اس نے اپنے اندر کوئی خوبی اس درجے تک پیدا کر لی ہے کہ اس کی وہ خامی چھپ جاتی ہے تو اس کوشش کو کامیاب کیا جائے گا نتیجتاً ایسے شخص میں خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔ کوشش کے ناکامیاب رہنے سے مراد یہ ہے کہ معاشرہ یہ تسلیم نہیں کرتا کہ فلاں شخص نے اپنی یہ خامی دور کر لی ہے۔ بعض ایسی خوبیاں پیدا کر لی ہیں

ب وہ خامی چھپ چکی ہے ایسے شخص کا بالعموم مذاق اڑاتا ہے۔ اس قسم کی کوشش بار ورنہ دیکھتے
ے ایسا شخص ردعمل (Reaction) شروع کر دیتا ہے۔ اب وہ اپنے قول و فعل سے
ہر کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ دوسروں سے بہتر ہے۔ عمدہ لباس پرتکلف انداز گفتگو اپنی
پنے اعزا و احباب کی قابلیت اور امارت کا بار بار تذکرہ وغیرہ ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں۔
دوسروں پر یہ واضح ہو کہ وہ معمولی شخص نہیں۔ میٹرک کے ایک طالب علم کو میں نے یہ کہتے ہوئے
ہے "تم مجھے کیا سمجھتے ہو میرے ساتھی ایم اے میں پڑھتے ہیں"۔ بعض حضرات کو اپنے اعزا و احباب
لی پوزیشن کا بار بار تذکرہ کرتے سنا ہے۔ "میں اتفاق سے ایسا ہوں میرے خاندان کے باقی افراد یہ ہیں
وہ ہیں"۔ اسی طرح جائداد کے متعلق بعض حضرات کو کہتے سنا ہے "پاکستان بننے پر ہماری یہ پوزیشن
ورنہ پہلے ہمارے اتنے لاکھ کے مکان اور اتنے لاکھ کی دکانیں تھیں"۔ اسی طرح کپڑوں کے متعلق
معمولی کپڑا کبھی نہیں پہنا کرتا۔ میرے اتنے گرم سوٹ ہیں اور اتنے سرد سوٹ وغیرہ وغیرہ"۔

جس طرح ایک خاص درجے تک نرگسیت ہر طبعی انسان میں پائی جاتی ہے۔ اسی طرح مختلف
قع پر ہر طبعی شخص خود کو دوسروں سے بہتر یا کہتر سمجھتا ہے۔ شاگرد کا استاد کی موجودگی میں خود کو کم تر
ھنا، اسی طرح بچوں کو والدین کی موجودگی میں اس قسم کا احساس ہونا بالکل طبعی ہے۔ احساس کہتری
ی کی صورت اختیار اس حالت میں کرتا ہے جب کوئی شخص مستقل طور پر خود کو کہتر سمجھنے لگے اور
احساس کی وجہ سے دوسروں سے کنارہ کشی کرنا چاہے یا ردعمل کی شکل میں ہر جگہ یہ ظاہر کرنے کی
شش کرے کہ وہ دوسروں سے کم نہیں۔

نرگسیت اور احساس کہتری بنیادی طور پر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ نرگسی انسان خود کو
اترین سمجھتا ہے اور یہ ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ دوسروں سے یہ کہلوائے کہ وہ اعلیٰ شخصیت کا
ہے۔ احساس کہتری کے مریض کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ دوسروں پر اپنی شخصیت کا اثر
لے اور ان سے یہ منوا لے کہ وہ کسی سے کم نہیں۔ نرگسی انسان میں فطری طور پر کچھ خوبیاں ہوتی ہیں
ان کی بنا پر وہ خود کو اعلیٰ سمجھتا ہے۔ احساس کہتری کا مریض ردعمل کی صورت میں نرگسی افعال

طرزِ عمل اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور بعض اوقات اس کوشش میں بظاہر وہ اس قدر کامیاب
رہتا ہے کہ نرگسیت اور احساس کہتری کی اس شکل میں تمیز مشکل ہو جاتی ہے۔ لیکن تجربہ کار عالمِ نفسیات
بہت جلد معلوم کر لیتا ہے کہ یہ شخص نرگسی ہے یا احساس کہتری کا مریض دونوں مصیبت بن سکتے ہیں فرق
یہ ہے کہ نرگسی انسان اس وقت تک کسی کو نہیں چھیڑتا جس وقت تک اس کے مفاد کا کسی سے تصادم
نہ ہو یا اسے کسی سے اختلاف رائے نہ ہو۔ اس کے برخلاف احساس کہتری کا مریض ہر وقت اس
فکر میں رہتا ہے کہ لوگ اسے کیا سمجھتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ احساس کہتری کا مریض ہر معمولی بات کو
اپنی بے عزتی خیال کرتا ہے اور دوسروں سے الجھ پڑتا ہے۔ "آپ مجھے سمجھتے کیا ہیں۔ میں یہ ہوں اور
وہ ہوں"۔ احساس کہتری کے مریض کو یہ تلخ تجربات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ بہت سی صورتوں
میں ہوتا یہ ہے کہ کسی نے اس کی بے عزتی نہیں کی ہوتی۔ یہ اس کا محض اپنا خیال ہوتا ہے اور یہ خیال
ہوتا اس وجہ سے ہے کہ ایسا شخص خود لاشعوری طور پر اپنی ذات کو کہتر سمجھتا ہے۔ اُسے دوسرے
کے الفاظ سن کر فوراً یہ خیال ہو جاتا ہے کہ وہ بھی اُسے کہتر سمجھتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مرتبہ مغربی
پاکستان کے ایک شہر میں چائے کے موقع پر ایک صاحب کو چائے دوسرے کے بعد ملی۔ انھوں نے
اسے بہت محسوس کیا اور چائے دینے والے چپراسی کو انگریزی میں بڑی ناراضگی سے کہا

"WHAT DO YOU THINK ABOUT ME, WHY DID YOU SERVE ME TEA LAST OF ALL?"

ذات دوسروں سے کم نہیں حقیقت میں وہ اپنے لاشعوری احساس کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے کہ
وہ کہتر نہیں۔ نرگسی انسان اس کے برعکس اگر کسی موقع پر بگڑ جاتا ہے تو دوسروں کو کہتا ہے کہ وہ کیا ہیں
حقیقت میں نرگسی انسان دوسروں کو اپنی ذات کے مقابلے میں بہت کم تر سمجھتا ہے۔ جب تک دوسرے
اس کے راستے میں نہ آئیں اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں صورت حال ٹھیک رہتی ہے
لیکن جب اسے کسی سے شکایت ہو جاتی ہے یا کوئی دوسرا شخص اس کی ذات کے متعلق کچھ

کہہ دیتا ہے۔ پھر نرگسی انسان کے الفاظ نا قابل برداشت ہوتے ہیں۔ ذیل میں میں چند مثالیں بیان کرتا ہوں ۔

(۱) ایک درجہ دوم گورنمنٹ ملازم کا کام اس کے محکمہ کا سب سے بڑا حاکم دیکھ رہا تھا۔ اس حاکم نے اپنے اس ماتحت کے طریق کار سے کچھ اختلاف کیا اور کچھ ہدایات دینی چاہیں۔ اتفاق سے یہ درجہ دوم ملازم نرگسی تھا وہ یہ الفاظ کس طرح برداشت کر سکتا تھا، اس نے فوراً جواب دیا، میں اپنا کام اچھی طرح جانتا ہوں اور آپ سے کہیں بہتر مجھے آپ ہدایات دینے کی تکلیف نہ کریں"۔

(۲) ٹریننگ کالج کے ایک نرگسی طالب علم کا واقعہ ہے۔ وائس پرنسپل کی کلاس تھی اور یہ وائس پرنسپل خاصے سخت گیر خیال کیے جاتے تھے۔ لکچر کے دوران میں اس طالب علم نے کسی بات پر وائس پرنسپل صاحب سے اختلاف کرنا چاہا۔ وائس پرنسپل نے تحکمانہ انداز میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس نرگسی طالب علم نے گرج کر کہا۔

..... صاحب آپ خود کو کیا سمجھتے ہیں۔ میں معزز شخص ہوں اور آپ سے کہیں زیادہ معزز بات کرنا سیکھیے"۔ ٹریننگ کالج کے بعد ملازمت کے دوران میں بھی اس شخص کی نرگسیت دوسروں کے لیے خاصی تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ بالعموم اس کے افسر اور ساتھی اس کی بات مان لیا کرتے تھے ایک افسر سے کسی بات میں اختلاف ہو گیا۔ اس نرگسی شخص نے کبھی اسے دفتری کارروائی میں بھی 'سر' استعمال نہیں کیا۔ دونوں میں بدمزگی رہی۔

نرگسی انسان کسی دوسرے شخص کو اپنے برابر نہیں سمجھتا۔ بالعموم نرگسی مرد و عورت دونوں کے اندر کچھ ایسے نمایاں اوصاف ہوتے ہیں کہ معاشرہ میں انھیں ممتاز پوزیشن مل جاتی ہے۔ لوگ انھیں اپنا لیڈر مان لیتے ہیں اور ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے ہیں۔ ان کی نرگسیت بذاتِ خود ایک جاذبیت رکھتی ہے۔

فرائڈ نرگسی عورتوں کے متعلق کہتا ہے:

"STRICTLY SPEAKING SUCH WOMEN LOVE ONLY

THEMSELVES WITH AN INTENSITY COMPARABLE TO THAT OF THE MAN'S LOVE FOR THEM. SUCH WOMEN HAVE THE GREATEST FASCINATION FOR MEN; NOT ONLY FOR THEIR AESTHETIC REASONS; SINCE AS A RULE THEY ARE THE MOST BAUTIFUL, BUT ALSO BECAUSE OF CARTAIN INTERESTING PSYCHOLOGICAL CONSTELLATIONS. IT SEEMS VERY EVIDENT THAT ONE PERSON,S NARCISSISU HAS A GREAT ATTRACTION FOR THOSE OTHERS WHO HAVE RENOUNCED PART OF THEIR OWN NERCISSISU AND ARE SEEKING AFTER OBJECT LOVE; THE CHARM OF A CHILD LIES TO A GREAT EXTEN IN HIS NARCISSISU AND SELF SUFFICIENCY AND INACCESSIBILITY.

نرگسی مردوں میں بھی نمایاں اوصاف ہوتے ہیں، جسمانی، ذہنی اور دوسری صفات میں فی الواقع نرگسی مرد و عورت ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ بالعموم لوگ انھیں ممتاز پوزیشن دے دیا کرتے ہیں۔ لیکن اگر کسی وجہ سے ایسا نہ ہو سکے تو نرگسی انسان کا طرز عمل قابل دید ہوتا ہے۔ دوسرے شخص کی اس قدر بے عزتی کرتے ہیں کہ اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

جیسا کہ میں پہلے تحریر کر چکا ہوں، نرگسی انسان اور احساس کہتری کے مریض کے الفاظ میں بنیادی فرق ہوگا۔ نرگسی انسان کہے گا۔

"آپ نے میرا کیا" اس کے برعکس احساس کہتری کے مریض کے الفاظ یوں ہوں گے۔ "آپ نے مجھے

کیا سمجھتے ہیں۔ نرگسی انسان اپنی ذات کے متعلق دوسروں سے نہیں پوچھتا کہ وہ اسے کیا سمجھتے ہیں۔ اسے اپنی ذات کے متعلق یقین ہوتا ہے کہ اُس جیسا اور کوئی نہیں، جب صورت حال بگڑتی ہے تو وہ دوسروں کو بتاتا ہے کہ اس کی نگاہ میں وہ کیا ہیں۔

نرگسی مرد اور عورت کے متعلق ایک بات قابل ذکر یہ ہے کہ جنس مخالف کو یہ بہت حقیر سمجھتے ہیں۔ سب سے بڑی ان کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ چوں کہ اس کا تعلق ان کی اپنی جنس سے ہوتا ہے۔ اس لیے لازماً ان کی نگاہ میں وہ جنس مخالف جنس سے اعلیٰ ہوتی ہے۔ جس پونی کے طالب علم کا میں نے ذکر کیا ہے۔ اس کی زبان سے جنس مخالف کے متعلق میں نے انتہائی حقارت آمیز الفاظ سنے ہیں۔ اسی طرح جس نرگسی لڑکی کا میں نے ذکر کیا ہے، مردوں کے متعلق بار ہا حقارت آمیز الفاظ کہا کرتی ہے۔

نرگسیت کی پہلی دو خصوصیات پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ باقی دو خصوصیات کے متعلق بھی مجملاً کہا جا چکا ہے۔ نرگسی انسان کو صرف اپنی ذات سے دلچسپی ہوتی ہے۔ دوسرے اشخاص یا چیزوں سے صرف اسی صورت میں تعلق پیدا ہوتا ہے جب وہ اس کی ذات کا جزو بن جائیں۔ بعض موقعوں پر نرگسی انسان کی یہ خصوصیت بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ احساس کہتری کا مریض دخل در معقولات کر کے اپنی قابلیت منوانا چاہتا ہے۔ لیکن نرگسی انسان دوسروں کے معاملات میں اس وقت تک کبھی مخل نہیں ہوتا جب تک اسے ایسا کرنے کی دعوت نہ دی جائے۔ یا اس معاملے کا تعلق اس کی اپنی ذات سے نہ ہو جائے

آخری خصوصیت بہت ہی اہم ہے۔ نرگسی شخص خود کو

سمجھتا ہے۔ یہ بات مسلمہ سمجھی جاتی ہے کہ انسان اپنی بہت سی ضروریات پوری کرنے کے لیے دوسروں کا محتاج ہے۔ نرگسی انسان اس کے برعکس اپنی ہر ضرورت و خواہش خود پوری کرنا چاہتا ہے۔ اس اصول کے مطابق نرگسی اشخاص نہایت خاموش طبع اور تنہائی پسند ہوتے ہیں، کیوں کہ بصورت دیگر دوسرے شخص کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی اس خصوصیت سے ان کے گھر کے افراد، ہم جماعت

اور دوسرے ساتھی بہت نالاں رہتے ہیں۔ رفیق یا رفیقۂ حیات کو جس قدر شکایت ہو سکتی ہے۔ ان کے اندر قوت فیصلہ، خود اعتمادی، خودداری، قناعت بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں۔ دوسرے اشخاص بہت سے معاملات کے فیصلوں کے لیے اور اپنی تکالیف کے حل کے لیے ان کی طرف کا رخ کرتے ہیں لیکن یہ احتیاط لازم ہے کہ اختلاف رائے نہ ہو ورنہ انتہائی بدمزگی ہوگی۔

احساس کہتری کا مریض اس کے برعکس اپنے معاملات میں دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ اسے ہر وقت اس چیز کا خیال رہتا ہے کہ دوسرے اس کے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں۔ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے دوسروں پر اثر ڈالنے کے لیے کرتا ہے۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے نرگسیت اور احساس کہتری دونوں معاشرتی زندگی کے لیے ٹھیک نہیں نرگسیت بڑی جاذبیت رکھتی ہے لیکن عملی زندگی میں ایسا کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ کوئی شخص نرگسی انسان سے اختلاف رائے نہ کرے۔ معاشرتی زندگی کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان کبھی خود رہبری کرے اور کبھی دوسروں کی رہبری میں کام کرے۔ جو شخص دوسروں کو اس درجہ حقیر سمجھتا ہے وہ کسی وقت مصیبت بن سکتا ہے۔ اسی طرح نرگسی انسان کا اپنی جنس مخالف کو حقیر سمجھنا معاشرتی زندگی میں کسی وقت خطرہ بن سکتا ہے۔ اسی طرح نرگسی انسان بعض کا افسر ہوگا اور بعض کا ماتحت۔ اس صورت میں اس کی یہ خصوصیت کسی وقت بدمزگی پیدا کر سکتی ہے۔ اس کی ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اگر نرگسی انسان کو کوئی مزمنہ عارضہ ہو جائے تو اس کا علاج بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ کسی معالج کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ اس کا علاج کر سکے۔ جیسا کہ میں ابتداء میں تحریر کر چکا ہوں۔ نرگسیت ہر شخص میں ہوتی ہے لیکن ایک درجے تک سے طبعی سمجھا جاتا ہے۔ بچہ نرگسی ہوتا ہے سب اس کی طرف توجہ دیتے ہیں اور وہ ہوتا ہے۔ لیکن عملی زندگی کے لیے یہ ضروری ہے کہ باقی نشوونما کے ساتھ نرگسیت بھی اسی درجے تک رہے جس کی معاشرہ اجازت دیتا ہے۔

احساس کہتری کے اسباب اور معالجہ یہاں زیر بحث نہیں لایا جا سکتا۔ ان امور پر میں آئندہ شمارہ میں روشنی ڈالوں گا۔

ہماری تعلیم

سید احمد مزمل

تاریخی پس منظر

تعلیم کا جو نظام اس ملک میں رائج ہے، اس کا انتظام ہنوز اس نہج پر قائم نہیں ہو سکا جس سے ہماری جملہ قومی ضروریات پوری ہو سکیں۔ تعلیم نہ مقصود بالقوم ہے اور نہ مقصود بالذات۔ پڑھنے لکھنے کا ایک سلسلہ ہے جس میں پڑھانے والا دو چار رٹی رٹائی پرانی باتیں بتا دیتا ہے۔ اگر یہ باتیں پڑھنے والے کی سمجھ میں آ جائیں تو بہتر اور اگر نہ آئیں تو اس سے بہتر اور بیفکری کے اس بیل کی طرح جو گھر ہی میں سفر کوس پورے کر لیتا ہے۔ معلم اور متعلم اسی رفتار سے آنکھوں پر پٹی باندھے چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اگرچہ دونوں کے چکر ذرا مختلف ہوتے ہیں لیکن انجام ایک ہی ہوتا ہے۔

یہ حالات کیوں پیدا ہوئے اس کے اسباب و علل کیا ہیں؟ بعض اہل فہم اسے سامراجی نظام کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ بعض دینی اور اخلاقی تعلیم سے عدم توجہی کا۔ بعض اساتذہ کی بے نیازی کا اور بعض طلبہ کی بے فکری کا۔ اور بعض اسے من جانب اللہ سمجھ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ بعض ارباب فکر محض مشرقی ہونا ہی اس کا سب سے بڑا سبب سمجھتے ہیں۔ گویا مشرق میں پیدا ہونا علم و دانش سے عاری ہونا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے خیالات و نظریات ہماری تعلیمی زندگی پر چھائے ہوئے ہیں اور اس میں سے جو بات ہمارے نقطۂ نظر سے اہم تر ہوتی ہے اس پر شدت سے قائم رہ کر ہم تعلیم کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ تعلیم کا کوئی جائزہ اس اعتبار سے صحیح نہیں ہوگا۔ ممکن ہے یہ برائیاں من حیث المجموع تعلیم پر براہ راست یا بالواسطہ اثر انداز ہو رہی ہوں یا ان میں سے ایک اہم ہو اور ایک محض ضمنی اور ہمیں اسی معیار پر اچھائی اور برائی کو پرکھنا ہوگا۔ حسن، حسن ہوتا ہے اور عیب عیب اور حسن و عیب میں امتیاز قائم کرنا ہی پرکھنے والے کا سب سے

بڑا وصف ہے۔

ہماری تعلیم ہماری اس لیے ہے کہ ہم اس ملک میں رہتے ہیں اور یہ نظام ہمیں آقایانِ فرنگ سے ورثے میں ملا ہے جو ایک تاریخی حادثہ ہے۔ لیکن حادثے کے اثرات کی چھاپ ہماری ثقافت پر نمایاں طور پر جھلکتی نظر آتی ہے۔ تعلیم پر اس کا اثر بالخصوص سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ انیسویں صدی کے ربع دوم میں ہندوستانی سیاست انگریز کی سامراجی سیادت کے آگے سر جھکا چکی تھی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، اسکی تمام تر ذمہ داری ہمارے اوپر عاید ہوتی ہے۔ ظالم اس وقت ظلم کرتا ہے جب مظلوم اُسے ظلم کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ ہم نے جب اپنی ہست و بود کا سودا انگریزوں سے کر لیا تو اس کے بعد ہمارے پاس کچھ باقی نہ رہا۔ سیاسی سیادت ان کی، تجارتی تفوق ان کا، ملک کی اقتصادیات ان کے ہاتھوں میں اور تعلیم ان تینوں کی کنیز بن گئی جس کا مقصد انگریزی مفاد کی حفاظت تھا۔

انگریزی مفاد کی حفاظت کی ایک ہی صورت تھی کہ تعلیم کو ایک مخصوص طبقے کی اجارہ داری بنا دیا جائے۔ ایک ایسے طبقے کی جو "رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہو لیکن آداب و اطوار کے لحاظ سے مغربی"۔ چنانچہ عوام کی عمومی تعلیم سے قطع نظر، مخصوص مفاد کی حفاظت کے لیے کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں علی الترتیب تین یونیورسٹیاں قائم کی گئیں اور پھر یونیورسٹی میں پڑھنے والوں کی ضروریات کے ماتحت چند ثانوی اور ابتدائی مدارس بھی قائم ہو گئے۔ جن کی اپنی علیحدہ کوئی حیثیت نہ تھی۔ وہ یونیورسٹی کے تابع اس کی نصابی ضروریات کے مطابق گھومتے رہے اور یہ سلسلہ اُس وقت سے لے کر اِس وقت تک جاری ہے۔ حتیٰ کہ اس ملک کے بعض اربابِ دانش آج بھی کمپنی بہادر کے نظریۂ تقاطر (FILTRATION THEORY) کے قائل نظر آتے ہیں۔ اس سے ایک خرابی یہ پیدا ہو گئی کہ ابتدائی تعلیم کی ماہیت اور اس کی ضرورت کی تعیین نہ ہو سکی۔ ہر گروہ اپنے نقطۂ نظر سے اس کی توضیح کرتا آیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اِس وقت تک اس ملک میں ابتدائی تعلیم کا ایسا نظام قائم نہ ہو سکا جو قومی مفاد کے تابع ایک متحد اور مشترک طریق کار کا حامل ہو سکتا۔

ووڈ ڈسپیچ | ووڈ ڈسپیچ (WOOD DESPATCH) سے لے کر قومی تعلیمی کمیشن مجریہ سنہ ۱۹۶۶ء

ادی تعلیمی ضروریات کا جائزہ لینے کے لیے ایک نہیں بیسیوں کمیشن وجود میں آئے اور ہر کمیشن نے
انفرادی رائے کا اظہار کیا۔ مثلاً ووڈ ڈسپیچ نے نظریہ تعاطر کے خلاف آواز اٹھائی اور ملک میں
ائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک ایک منظم نظام تعلیم کے قیام کی سفارش کی لیکن اس پر نیک نیتی
مل نہ ہو سکا۔

ووڈ ڈسپیچ کی اہم سفارشات یہ ہیں :-

(ا) محکمہ تعلیم کا قیام :- ڈسپیچ نے کمپنی کی عمومی تعلیمی حکمت عملی کا جائزہ لینے کے بعد
صوبہ میں ایک محکمۂ تعلیم قائم کرنے کی سفارش کی۔ اس محکمے کے قیام کا مقصد تعلیم کو ایک "مربوط نظ
تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے یہ سفارش کی گئی کہ اس محکمے کا سربراہ ایک ذمہ دار افسر ہوگا
ناظم تعلیمات (ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن) کہلائے گا۔ ناظم تعلیمات کی امداد کے لیے چند نائب او
ناظم تعلیمات بھی ہوں گے۔

(ب) یونیورسٹی :- ڈسپیچ کی دوسری اہم سفارش یونیورسٹیوں کا قیام اور ان کی ترویج
اور رہی ہے۔ اس سے پہلے کمپنی کے ارباب اقتدار ہندوستان میں کسی یونیورسٹی کے قیام کے حق میں
نہ تھے۔ چناں چہ ۱۸۴۵ء میں کونسل آف ایجوکیشن نے کلکتہ یونیورسٹی کے قیام کی جو تجویز پیش کی
تھی وہ مسترد کر دی گئی تھی، مگر ڈسپیچ نے اس پرانی تجویز میں از سر نو جان ڈال دی۔

اس وقت ہندوستان میں عمومی تعلیم کا رواج ہو چکا ہے۔ نجی اداروں کے طلبہ کا معیار سرکاری ملازمتوں
کے سلسلہ میں خاصہ بلند ہے۔ میڈیکل کالج بڑی کامیابی سے چل رہے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ یورپین اور
اینگلو انڈین آبادی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ ان اسباب کے پیش نظر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اب
وہ وقت آ گیا ہے کہ ہندوستان میں یونیورسٹیاں قائم کی جائیں۔

ڈسپیچ نے یہ بھی سفارش کی کہ جن کارآمد مضامین کا انتظام ہندوستان میں نہیں ہو سکا ان کے
انتظام کی کوشش کی جائے اور اس سلسلہ میں مقامی حکومت کو پورا پورا اختیار ہوگا کہ افادی
نقطۂ نگاہ سے جن مضامین کی ضرورت سمجھی جائے ان کا ایک علیحدہ شعبہ قائم کر دیا جائے۔۔۔

ساتھ ہی ساتھ اس بات پر بھی زور دیا کہ مقامی زبانوں کی توسیع و ترقی کو فراموش نہ کیا جائے، بلکہ ان زبانوں کے لیے علیحدہ علیحدہ پروفیسر[1] مقرر کیے جائیں۔ مقامی زبانوں کے متعلق ایک عمومی سی بات کہنے کے بعد ڈسپیچ نے اردو کا ذکر کیا ہے کہ یہ ہندوستان کے طول و عرض میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور چوں کہ اس میں ترقی کرنے کی خاص اہلیت موجود ہے۔ اس لیے اس زبان کی ترقی و توسیع کا بالخصوص خیال رکھا جائے۔

(ج) درجہ وار مدارس کا قیام :- اس وقت تک ہندوستان میں تعلیمی ترویج کی جو کوششیں کی گئی ہیں ان میں عوامی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ ڈسپیچ نے پہلی مرتبہ ابتدائی اور ثانوی مدارس کے قیام کی ضرورت محسوس کی اور حکومت کی اس حکمت عملی پر کہ اونچے طبقے کے چند آدمیوں کے لیے اعلیٰ تعلیم کی تحصیل و تکمیل کا انتظام کیا جائے۔ کڑی نکتہ چینی کی اور اس کا حل یہ تجویز کیا کہ درجہ وار مدرسے قائم کیے جائیں۔ ابتدائی، ثانوی اور پھر یونیورسٹی۔ اس طرح تعلیم ہر طبقے کی ضروریات کو پورا کر سکے گی۔

اس ضمن میں ڈسپیچ کی ایک اور اہم سفارش کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں آج کل ان مدرسوں کو جن کا ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے خاص فوقیت دی جا رہی ہے۔ اس موضوع پر آج سے سو برس پہلے خود انگریزوں نے ہماری تعلیم کے متعلق جو کچھ اور جس نہج پر سوچا، وہ ہماری عبرت کے لیے کافی ہے۔

"ہم اینگلو ورنیکلر اور ورنیکلر مدارس کو ایک ہی درجے میں شامل کرتے ہیں۔ کیوں کہ ہم اس تفریق کو مٹا دینا چاہتے ہیں جو ان مدرسوں کے درمیان ذریعۂ تعلیم کی وجہ سے قائم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اینگلو ورنیکلر مدارس میں جو تعلیم دی جاتی ہے، وہ اس وقت ورنیکلر مدارس سے بہتر ہے۔ لیکن جب مقامی زبانیں ترقی کر جائیں گی اور ان کے نصاب میں بھی توسیع ہو جائے گی۔ اور اچھے تربیت یافتہ

---

[1] ہمارے ملک میں عام طور پر ہر کالج میں پڑھانے والے کو پروفیسر کہہ دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ لیکچرار، پروفیسر کہلاتے ہیں۔ یہاں پروفیسر سے مراد پروفیسر کا عہدہ ہے۔

درسین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوجائے گا تو یہ تفریق اتنی نمایاں نہیں رہ جائے گی اور موخرالذکر مدارس زیادہ اچھے ہوجائیں گے۔

لیکن اس وقت یہ تفریق اتنی نمایاں ہوتی جارہی ہے کہ شاید آگے چل کر اس ملک میں دو قومیں وجود میں آجائیں۔ ایک وہ جو انگریزی کے مصنوعی ماحول میں الگ تھلگ نام نہاد پبلک اسکولوں میں پڑھتی ہے اور ایک وہ جو عوامی اداروں میں مقامی ماحول میں پرورش پاتی ہے۔ اس وقت انھیں اس تفریق کے مٹانے پر اصرار تھا۔ اس وقت ہمیں اس تفریق کے قائم رکھنے پر اصرار ہے

ببین تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

(د) زرِ امداد :- اس تعلیمی حکمت عملی کے پیش نظر حکومت کو یہ احساس تھا کہ اگر ہندوستان کے نظامِ تعلیم میں یہ انقلابی تبدیلی ضروری ہے تو اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مہتمین تعلیم کے پاس اتنا روپیہ ہو کہ وہ اس اسکیم کو چلا سکیں۔ لیکن حکومت کے پاس اتنا روپیہ نہیں ہوگا کہ وہ اس اسکیم کو ایک عملی تشکل دے سکے۔ اس لیے انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ مقامی انجمنیں اور مخیر حضرات اس کارِ خیر میں حصہ لیں اور حکومت ان اداروں کو ایک خاص شرح کے مطابق زرِ امداد دیتی رہے۔

ڈسپیچ کی یہ سفارشات اہم تھیں اور اگر ان پر نیک نیتی سے عمل ہوتا تو اس وقت دونوں ملکوں کی تعلیمی حالت کچھ اور ہوتی۔ لیکن یہ سفارشات بعض سیاسی مصالح کے پیش نظر تفریطِ زر کا شکار ہوتی رہیں۔ ۱۸۸۲ء میں حکومت ہند نے ڈاکٹر ہنٹر کی قیادت میں ایک تعلیمی کمیشن مقرر کیا۔ اس کمیشن کے مندرجات میں سب سے اہم مقام ابتدائی تعلیم کو دیا گیا، بلکہ یونیورسٹی اور تعلیم کی بعض دوسری شاخوں کو خارج از بحث قرار دے دیا گیا۔ اس طرح ۱۸۸۲ء میں پہلی مرتبہ ابتدائی تعلیم کی اہمیت کے پیش نظر اس کا عمومی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی۔ کمیشن نے اصولی طور پر یہ تسلیم کیا کہ ابتدائی تعلیم کو عوام کی تعلیم سمجھنا چاہیے جس کا ذریعۂ تعلیم مقامی زبان ہو اور مضامین درس اس قسم کے ہوں جو ان کی زندگی میں ان کے کام آسکیں۔ ۱۸۸۴ء میں حکومت ہند نے کمیشن کی جملہ سفارشات کو تسلیم

کر لیا۔ لیکن اس پر عمل درآمد نہ ہو سکا اور سوائے اس کے کہ لارڈ رپن کی مساعی سے جو مقامی حکومتیں
قائم ہوئیں، ابتدائی تعلیم کے اہتمام اور انصرام کا سارا کام ان کے سپرد کر دیا گیا۔ اُس وقت سے لے کر
اس وقت تک ابتدائی تعلیم کی تمام تر ذمہ داری مقامی بورڈ پر عائد ہوتی ہے۔ چناں چہ ہر میونسپل بورڈ
اور ہر ڈسٹرکٹ بورڈ اپنے اپنے حلقوں میں ابتدائی تعلیم کا انتظام کرتا ہے۔ یہ صورتِ حال آج بھی
اسی طرح قائم ہے۔ ان مقامی حکومتوں کے علاوہ دوسری مقامی انجمنوں کو بھی ابتدائی تعلیم کے
انتظام کا حق حاصل ہے۔

انیسویں صدی میں انگلستان تعلیمی نقطۂ نگاہ سے یورپ کے بعض ممالک سے بہت پیچھے
تھا۔ جرمن، سوئٹزرلینڈ اور فرانس اس سے بہت آگے تھے۔ انگریزوں کو اپنی اس بے مائگی اور
دوسروں کی برتری کا پورا پورا احساس تھا۔ چناں چہ پچھلی صدی میں مختلف نظامِ تعلیم کے مطالعے کے لیے
وفود روانہ کیے گئے۔ ان وفود نے ہر نظامِ تعلیم کی اچھائی اور برائی کو پرکھا اور پھر مجموعی طور پر اپنے
خیالات کا اظہار کیا۔ تعلیمی اصلاح کی اس کوشش کا نتیجہ قانون لازمی ابتدائی تعلیم مجریہ ۱۸۷۰ء
سے ۱۸۸۲ء کا کمیشن اسی اصلاحی کوشش کی پرچھائیں تھا۔ انگلستان میں تعلیم ایک غیر مرکزی
نظام کے تابع تھی۔ اس لیے ہندوستان میں بھی اسے غیر مرکزی بنانے کی کوشش کی گئی۔ حکومت
براہِ راست تعلیم کی ذمہ دار نہ تھی۔ چناں چہ یہاں بھی زیرِ امداد کے اصول کے مطابق یہ فرض مقامی
انجمنوں اور مخیر حضرات کے سپرد کر دیا گیا۔ اس وقت انگلستان میں یہ جھگڑا کہ مدرسوں میں دینی
تعلیم دی جائے یا نہ دی جائے ایک عجیب سی شکل اختیار کر رہا تھا۔ بعض اس کے حق میں تھے
اور بعض سرے سے اس کے مخالف تھے۔ یہ متنازع فیہ مسئلہ برسوں چلتا رہا، اور اس کا کوئی فیصلہ
نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہندوستان میں اصلاحِ تعلیم کا مسئلہ سامنے آیا تو دینی اور اخلاقی
تعلیم کو نصاب سے خارج کر دیا گیا۔

۱۹۰۲ء اور مابعد

۱۸۸۲ء کے تعلیمی کمیشن کی سفارشات کا بھی انجام وہی ہوا۔ ان میں سے بعض پر کچھ تھوڑا بہت

ر درآمد ہوا، اور بعض یوں ہی تسکین ذوق کے لیے صفحۂ قرطاس پہ مزین رہیں۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم
ظام میں کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہ ہوسکی۔ ثانوی مدارس ہنوز یونیورسٹی کے تابع تھے۔ اور ان کے
ب میں وہی مضامین داخل تھے جن کی بدولت طلبہ کو یونیورسٹی میں داخلہ لینے میں آسانی ہوجاتی
طرح انتظامی اور نصابی لحاظ سے ان میں کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہ ہوسکی۔ ماقبل سنہ ۱۹۰۲ء انگلستان
ظام تعلیم میں بھی ایک عمومی انتشار تھا۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی حدبندی کے متعلق ہر ایوان فکر کی اپنی
ے تھی۔ ٹیکنیکل تعلیم کس عنوان سے دی جائے، اس کے متعلق بھی کسی کی کوئی حتمی رائے نہ تھی، اس سے
عجیب سا انتظامی الجھاؤ پیدا ہوگیا۔ اور کسی کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ اسے کس طرح سلجھایا جائے
جھاؤ بادستور قانون تعلیم مجریہ سنہ ۱۹۰۲ء تک قائم رہا۔

جب خود انگلستان میں تعلیم ایک محدود سے حلقہ میں کاوے بدلتی رہی تو ہماری یہ توقع کہ
یسویں صدی کے ربع آخر میں ہندوستان کی اپنی ضروریات کے مطابق ایک ایسا نظام تعلیم قائم
یا جاتا جو اس کا اپنا نظام تعلیم ہوتا، ایسی ہی تھی جیسے کسی صحرائی علاقہ میں بارش کی توقع۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا
ل کا ٹکڑا آگیا تو دو چار بوندیں پڑگئیں۔ ورنہ صحرا آخر صحرا ہی ہوتا ہے۔ انگلستان سے ہمیں وہی مل
تا تھا جو اس کے پاس تھا اور جہاں سامراجی تعلقے مانع نہ ہوئے تو اس کے رشحات فیض سے ہمیں بھی
ہ ملتا رہا۔

ڈین یونی ورسٹی کمیشن

سنہ ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے یونی ورسٹی تعلیم کی پڑتال کے لیے ایک تعلیمی تحقیقاتی کمیشن قائم کیا
انڈین یونیورسٹی کمیشن کے نام سے موسوم ہوا۔ اس کمیشن نے ہندوستان کے مختلف اداروں کا دورہ کیا
ایک یونیورسٹی کا جائزہ لیا۔ اور سنہ ۱۹۰۲ء ہی میں اپنی رپورٹ مرتب کرلی۔ کمیشن کی اہم سفارشات
تھیں:-

۱) موجودہ یونیورسٹی حکومت کا انتظام از سر نو کیا جائے۔
۲) کالجوں کی نسبتاً سخت اور منظم نگرانی کی جائے اور الحاق کی شرائط کو زیادہ قطعی اور درست

بنایا جائے۔

(۳) طلبہ کی عمومی رہائش اور کام اور ان کے ماحول پر بالخصوص توجہ دی جائے۔

(۴) مقررہ حدود میں ہر یونیورسٹی میں براہ راست تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے۔

(۵) نصاب اور طریق امتحان میں اہم اور ضروری تبدیلیاں کی جائیں۔

انہی سفارشات کی بنیاد پر انڈین یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۰۴ء منظور ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی ۱۹۵۴ء تک اسی قانون کے تابع کام کرتی رہی۔ دفعہ ۳ قانون ۱۹۰۴ء کے یہ الفاظ قابل توجہ ہیں۔

"یونیورسٹی کے قیام کا مقصد من جملہ اور چیزوں کے طلبہ کی تعلیم کا اہتمام بھی ہوگا ہر یونیورسٹی کو اپنے پروفیسر اور لیکچرر کی تقرری کا حق ہوگا۔ وہ تعلیمی اوقاف کی مالک بن سکیں گی اور ان کا انتظام بھی انھی کے ہاتھ میں ہوگا۔ ان کا کام یہ بھی ہوگا کہ وہ کتب خانے، تجربہ گاہیں اور عجائب گھر قائم کریں، انھیں ساز و سامان سے آراستہ کریں۔ اور ان کا باقاعدہ انتظام کریں۔ طلبہ کی رہائش اور ان کے اخلاق کے متعلق قانون وضع کرنا بھی انھی کا کام ہوگا۔ اس کے علاوہ ان جملہ امور کا پورا پورا حق ہوگا۔ جو یونیورسٹی کے قانون ہیئت اجتماعی کے مطابق تعلیم اور تحقیق میں اضافے کے متعلق ہوں"

چوں کہ اس قانون کے مطابق الحاق کی شرائط بہت سخت کر دی گئی تھیں۔ اس لیے ہندوستان کے تعلیمی حلقوں میں اس کا خیر مقدم نہ ہو سکا۔ بلکہ چاروں طرف اس کے مسترد کرنے کے حق میں ہنگامے ہوتے رہے۔

قرارداد ۱۹۱۳ء :۔ ۱۹۱۳ء میں حکومت نے یہ محسوس کیا کہ اس وقت ہندوستان کے نظام تعلیم کا جائزہ از سر نو لینے اور ایک نئی تعلیمی حکمت عملی مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے پیش نظر حکومت ہند نے ۱۹۱۳ء میں ایک تعلیمی قرارداد منظور کی۔ اس کی اہم سفارشات یہ ہیں :۔

(۱) پیراگراف (۱) میں بیان شدہ اصول کے مطابق۔ ایسے لوئر پرائمری سکولوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہونا چاہیے۔ جہاں لکھنے پڑھنے اور ریاضی کے علاوہ، ڈرائنگ، گاؤں کے نقشے سے

واقفیت، مطالعۂ قدرت اور جسمانی تربیت کی تعلیم دی جاتی ہو۔

(ii) اس کے ساتھ ساتھ موزوں مقامات پر پرائمری اسکول قائم کیے جائیں، اور جہاں ضروری ہو نچلی لوئر پرائمری اسکولوں کو اپر پرائمری اسکول بنا دیا جائے۔

(iii) مدرسوں کی توسیع بورڈ اسکولوں کی صورت میں عمل میں آنی چاہیے۔ اور جہاں مالی وجوہات کی بنا پر یہ ممکن نہ ہو وہاں منظور شدہ انتظامیہ کے تحت، امداد پانے والے اسکولوں کے قیام کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ بعض علاقوں میں ایسے مکتبوں، پاٹھ شالاؤں اور اسی قسم کی دوسری درس گاہوں کی دا فراخی امداد کی جائے جو علاقائی زبان میں عمومی تعلیم دینے پر رضامند ہوں۔ تجارتی قسم کے اداروں پر اس وقت تک بھروسا نہ کیا جائے جب تک وہ اچھی مجلس انتظامیہ کا قیام اور حسابات کا اصول اختیار کر کے تسلیم شدہ کہلانے کے حق دار نہ ہو جائیں۔

(iv) ہندوستان کے اکثر علاقوں میں فی الحال یہ ممکن نہیں ہے کہ دیہاتی اور شہری پرائمری اسکولوں کے نصاب میں بہت بڑا فرق رکھا جائے۔ لیکن شہری اسکولوں میں جغرافیے کی عملی تربیت اور تعلیمی سیر و سیاحت کے زیادہ مواقع ہیں۔ اس طرح مطالعۂ قدرت کو ماحول کے ساتھ ساتھ بدل جانا چاہیے۔ گاؤں کے نقشے سے واقفیت کی بجائے علاقے کے متعلق عام فہم معلومات کو جگہ ملنی چاہیے جس وقت قابل اساتذہ مہیا ہونے لگیں گے۔ نصاب میں زیادہ امتیاز قائم کرنا ممکن ہوگا۔

(v) اساتذہ کا انتخاب اس طبقے سے ہونا چاہیے جس طبقے کے لڑکوں کو انہیں پڑھانا ہے انہیں مڈل ورنیکلر امتحان یا اسی قسم کا کوئی دوسرا کورس پاس کرنا چاہیے اور یک سالہ کی تربیت حاصل کی اگر انھوں نے صرف اپر پرائمری کورس پاس کیا ہے اور انھیں اسکول کا کافی تجربہ نہیں ہے تو اس صورت میں دو سال کی تربیت مناسب ہوگی۔ شروع شروع میں یہ تربیت چھوٹی مقامی درس گاہوں میں دی جانی چاہیے۔ لیکن مالی حالات اجازت دیں تو یہ تربیت زیادہ بڑے اور اچھے مرکزی نارمل اسکولوں میں دی جانی چاہیے۔ دونوں طرح کی درس گاہوں کے ساتھ تربیتی اسکولوں کا ہونا لازم ہے اور ان درس گاہوں کی وسعت کا انحصار بھی ان اسکولوں کی وسعت پر ہوگا ——

______ اگر اساتذہ گاؤں میں یوں ہی پڑے رہیں اور ان کی طرف توجہ نہ دی جائے تو ان کی کارکردگی میں فرق آ جانا لازمی ہے۔ اس لیے اسکول کی چھٹیوں کے دوران میں اساتذہ کے لیے اصلاحی کورس کی تکرار زیادہ مفید ثابت ہوگی۔

(vi) تربیت یافتہ اساتذہ کو بارہ روپے ماہوار سے کم تنخواہ نہیں ملنی چاہیے (بعض علاقوں کے لیے خاص شرح دی گئی ہے) انھیں ایک درجہ دار ملازمت میں رکھنا چاہیے اور ان کے لیے پنشن مقرر ہونی چاہیے۔ یا ان کے لیے پراویڈنٹ فنڈ کا انتظام ہونا چاہیے۔

(vii) کسی استاد کے ذمے پچاس سے زیادہ طلبہ نہیں ہونے چاہئیں۔ اگر یہ تعداد تیس یا چالیس ہو تو بہتر ہے۔ اور مناسب یہ ہے کہ ہر جماعت کے لیے علیحدہ علیحدہ استاد ہوں۔

(viii) توسیعی مدارس جو مڈل اسکول کہلاتے ہیں انھیں بہتر بنایا جائے۔ اور ان کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔

(ix) اسکولوں کی عمارت صاف ستھری، وسیع اور کم خرچ ہونی چاہیے۔

یہ عمومی اصول بیان کرتے ہوئے حکومت ہند کو احساس ہے کہ مختلف صوبوں میں ابتدائی تعلیم کے حالات مختلف ہیں۔ مثال کے طور پر بنگال کے پرانے صوبے میں تقریباً ہر تین مربع میل علاقے میں ایک پرائمری اسکول موجود ہے۔ اور یہاں اسکولوں کی تعداد بڑھانے کی بجائے طلبہ کی حاضری زیادہ کرنے اور اساتذہ کی اہلیت میں اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کے بعض حصوں میں اس وقت پرائمری اسکول کا کوئی استاد کبھی ۱۲ روپے ماہوار سے کم تنخواہ نہیں پاتا۔ برما میں حالات مختلف ہیں اور وہاں خانقاہی اسکولوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح جہاں پرائمری تعلیم کی بنیاد بورڈ یا امدادی اسکولوں پر ہے انھیں مختلف مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیے کہ یہاں جو عمومی اصول بیان کیے گئے ہیں وہ حکومت ہند یا صوبائی حکومتوں کے لیے حرف آخر کا درجہ رکھتے ہیں۔ حکومت کو یہ امید ہے کہ وہ دن دور نہیں جب پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کو تنخواہ بھی نسبتاً زیادہ ملے گی۔ جب تمام اساتذہ تربیت یافتہ ہوں گے اور جب پرائمری اسکولوں میں جدید اور لچکدار طریقے نافذ کیے جائیں گے حکومت ہند کی یہ خواہش اور امید ہے کہ مستقبل قریب میں لڑکوں کے موجودہ ایک لاکھ پرائمری پبلک

اسکولوں میں اکانوے ہزار کا اضافہ کر دیا جائے۔ اور اس وقت تعلیم پانے والے سوا چالیس لاکھ طلبہ تعداد کو دگنا کر دیا جائے۔

ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے متعلق بھی اس طرح ہر بات شرح و بسط کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

کلکتہ یونی ورسٹی کمیشن

ابھی یہ قرار داد، قرار داد ہی تھی کہ پہلی عالم گیر لڑائی شروع ہو گئی اور تعلیم کی تعمیر نو کا مسئلہ بھی التوا میں پڑ گیا۔ ۱۹۱۷ء میں جب جنگ کے بادل کچھ کچھ چھٹنے لگے اور انگریزوں کو اپنی کامیابی کا احساس ہو چلا تو ایک مرتبہ پھر تعلیم کی تعمیر کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ اس سال حکومت نے ڈاکٹر سیڈلر، وائس چانسلر یونی ورسٹی آف لیڈز کی قیادت میں کلکتہ یونی ورسٹی کمیشن کی تقرری کا اعلان کیا۔ کمیشن نے ثانوی اور یونی ورسٹی تعلیم کا تفصیلی جائزہ لیا اور ۱۹۱۹ء میں اپنی سفارشات تیرہ جلدوں میں پیش کیں۔ اس کی چند اہم سفارشات یہ ہیں:-

ثانوی تعلیم

(۱) یونی ورسٹی اور ثانوی تعلیم کا خط تقسیم میٹرک نہیں انٹرمیڈیٹ ہے۔

(۲) اس کلیے کے پیش نظر حکومت ایک نئے قسم کا میٹرکولیشن ادارہ قائم کرے۔ یہ ادارہ انٹرمیڈیٹ کالج کہلائے گا اور اس میں آرٹس، سائنس، طب، انجینئرنگ اور تعلیم کے مضامین پڑھائے جائیں گے۔ ان کالجوں کا انتظام یا تو بالکل علیحدہ ہو یا انھیں چند مخصوص ہائی اسکولوں کے ساتھ شامل کر دیا جائے۔

(۳) یونیورسٹی میں داخلے کے لیے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنا ضروری ہوگا۔

(۴) بورڈ آف سکینڈری اور انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن قائم کیا جائے، یہ بورڈ، حکومت، یونیورسٹی، ہائی اسکولوں اور انٹرمیڈیٹ کالجوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو۔ اس کا کام ثانوی تعلیم کا انتظام اور کنٹرول ہو۔

یونی ورسٹی تعلیم:- (۱) ایک وحدانی تدریسی یونی ورسٹی ڈھاکہ میں قائم کی جائے۔

کلکتہ شہر کے جملہ تدریسی وسائل کو یک جا کر کے کلکتہ میں ایک تدریسی یونی ورسٹی قائم کی جائے۔

۔ متصل کالجوں کو اس طرح ترقی دی جائے کہ آگے چل کر یہی یونی ورسٹیاں بن جائیں جو بعض مخصوص مضامین کے لیے مخصوص ہوں۔

۔ آنرز کورس کا اجرا کیا جائے۔

۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد ڈگری کورس تین سال کا ہو۔

۔ پروفیسر اور ریڈر کی تقرری کے لیے، ماہرین کی ایک مخصوص کمیٹی مقرر کی جائے جس میں بیرونی ماہر بھی شامل ہوں۔

کلکتہ یونی ورسٹی کمیشن کا یہ سروے اتنا مفصل اور واضح ہے کہ اس میں ابہام کی گنجائش نہیں قانون حکومت ہند مجریہ ۱۹۱۹ء کے مطابق تعلیم مرکزی حکومت سے نکل کر صوبوں کے پاس پہنچ گئی کمیشن کی سفارشات کا حشر بھی کچھ اچھا نہ ہوا۔ بعض صوبوں نے اکا دکا سفارشات پر عمل کیا اور بعض نے قطعی درخور اعتنا نہ جانا۔ لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ اُس وقت سے لے کر اس وقت تک تعلیمی کمیشن وجود میں آئے ان کی سفارشات کلکتہ یونی ورسٹی کمیشن کی سفارشات کی صدائے بازگشت یعنی ایک طرف تو ان سفارشات پر عمل کرنے کی توفیق نصیب نہیں ہوئی اور دوسری طرف اصلاح کے لیے ہم انھیں سفارشات کو بالفاظ دیگر دہراتے رہے اور یہ کیفیت ہنوز جاری ہے۔

تبدیلی

۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہوئی اور برطانیہ کو بھی سکون کا سانس لینے کا موقع ملا۔ ہندوستان کے معبرین ت نوآبادیاتی درجے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ لیکن ان کی یہ بات تسلیم نہ کی گئی اور حکومت نے محض ہی تبدیلیوں کو کافی سمجھ کر ۱۹۱۹ء کے آئین کا اعلان کر دیا۔ اس آئین کے مطابق تعلیم کی ذمہ داری حکومتوں کے سپرد کر دی گئی۔ واضعین آئین کے پیش نظر ہندوستان کو ایک واحدہ سمجھنا غلطی تھی یہ جو آئین ۱۹۱۹ء میں مرتب ہوا، اس کی بنیاد وفاقی تھی اور یہ اس طرح کہ آگے چل کر جو آئینی بیاں رونما ہوں حکومت کے وفاقی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہونے پائے۔ اس وفاقی آئین کے

ابتدائیہ میں تعلیم کا صوبائی حکومتوں کے زیر اہتمام آنا بالکل فطری تھا۔ ہر صوبہ اپنی زبان، اپنی ثقافت اور اپنی مقامی ضروریات کے تابع ایک نیا تعلیمی نظام قائم کر سکتا تھا۔ اس آئینی تبدیلی کے بعد حکومت ہند کے محکمہ تعلیم کی حیثیت ایک نگران کی سی رہ گئی اور اب وہ از خود کسی تعلیمی قانون کا اجرا اور نفاذ نہیں کر سکتا تھا۔ حکومت ہند کے اس دست تعاون کے اٹھنے کے بعد تعلیم کی عمومی حکمت عملی میں یگانگت پیدا نہ ہو سکی۔ اور اب اس وقت دونوں ملک اپنی اپنی قومی یک جہتی کی خاطر تعلیمی یک جہتی پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

سائمن کمیشن ۱۹۲۹ء

۱۹۱۹ء کی آئینی تبدیلیاں خواستگاران آزادی کو مطمئن نہ کر سکیں اور اس بے اطمینانی نے بالآخر احتجاج کی صورت اختیار کر لی۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ اتحادیوں نے سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کر کے آپس میں تقسیم کر لیے، اور خلافت کو ایک ادارے کی حیثیت سے منسوخ کر دیا۔ اس سے ہندوستان کے مسلمانوں کو جو ٹھیس لگی تو تحریک خلافت کا آغاز ہوا۔ ہندوستان کے مسلم زعما نے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے دنوں کا آرام اور راتوں کا چین قربان کر دیا۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، یہ وہ لوگ تھے جو بے سروسامانی کے عالم میں بھی ایک اصولی جنگ لڑ رہے تھے۔ آئینی تبدیلیوں کے خلاف جو احتجاج ہو رہا تھا اس نے ایک اشتراک کی صورت اختیار کر لی تھا، یوں کہ تحریک ترک موالات اور تحریک خلافت کے احتجاجی جلسے ایک ساتھ ہونے لگے۔ ہندو مسلم اتحاد کی یہ آخری جھلک تھی جو ان دونوں تحریکوں کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔

ان احتجاجی جلسوں کا ایک نتیجہ یہ ضرور برآمد ہوا کہ برطانیہ نے ۱۹۲۷ء میں سر جان سائمن کی قیادت میں ایک آئینی کمیشن مقرر کیا۔ اس کمیشن نے اپنی معلومات کے لیے سر فلپ ہارٹاگ کی قیادت میں ایک امدادی تعلیمی کمیٹی بھی مقرر کی۔ اس امدادی کمیٹی نے ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا جائزہ لے کر پہلی مرتبہ تعلیم کو مربوط کل بنانے کی کوشش کی۔ یہ کوشش اس لیے بھی قابل تحسین ہے کہ اس رپورٹ میں نظریۂ تفاطر کو کوئی مقام حاصل نہیں۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وڈ ڈسپیچ نے بھی اس نظریے کی مخالفت کی اور ۱۸۸۲ء ہی میں اسے مسترد قرار دیا گیا تھا۔ اور اس کے بعد جو تعلیمی کمیشن وجود میں آئے وہ بھی اس کی تردید کرتے رہے۔

بس اس کے باوجود یہی نظریہ ہمارے ذہنوں پر مسلط رہا۔ حتیٰ کہ آج بھی ہم یہی سمجھتے ہیں کہ ایک مخصوص طبقہ کی تعلیم سے قومی نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

نہرو کمیٹی رپورٹ

ترک موالات کی تحریک پھر سرگرم کار ہوئی، اور کانگرس نے سائمن کمیشن کا خیر مقدم سیاہ جھنڈیوں سے کیا۔ ہندوستان کا آئین کیا ہونا چاہیے۔ اس کے لیے کانگرس نے پنڈت موتی لال نہرو (الہ آبادی) کی قیادت میں ایک کمیٹی مقرر کی۔ اس کمیٹی نے ہندوستان کے آئین نو کی تدوین و ترتیب کے سلسلے میں جو سفارشات کیں اس میں مسلمانوں کے حقوق کا احترام نہ کیا۔ بلکہ انھیں اکثریت کے رحم و کرم پر اس طرح چھوڑ دیا گیا یا ان کی اپنی کوئی انفرادی حیثیت نہیں۔ اس سے دونوں قوموں (ہندو مسلم) کی رہی سہی یک جہتی بھی ختم ہو گئی۔

آئینی تبدیلی

سائمن کمیشن اور اس کے مابعد آئینی کش مکش کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ حکومت برطانیہ بعض آئینی تبدیلیوں کے لیے تیار نہ تھی اور ہندوستان کے ارباب سیاست کو اس پر اصرار تھا۔ اس وقت برطانیہ خود ایک اقتصادی بحران کا شکار تھا۔ لیکن اس کے باوجود دونوں کا نقطۂ نگاہ مختلف رہا اور سمجھوتے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ بالآخر ۱۹۳۵ء میں برطانوی پارلیمان نے آئینی تبدیلیوں کا قانون منظور کر لیا جو آئین حکومت ہند مجریہ ۱۹۳۵ء کے نام سے موسوم ہوا۔ اس آئین کے مطابق صوبوں کے اختیارات میں اور اضافہ ہو گیا۔ اور ہندوستان کی مرکزی حکومت ایک وفاقی حکومت بن گئی۔ ۱۹۳۷ء میں اس آئین کے تحت عمومی انتخابات ہوئے۔ ہندو اکثریت کے صوبوں میں کانگریسی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ مسلم لیگ نے بھی ان انتخابات میں حصہ لیا۔ لیکن ابھی اسے اتنی نمایاں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ کانگریسی حکومتوں نے اپنے مختصر سے دور حکومت میں مسلمانوں کے جذبات و احساسات کو قدم قدم پر کچلا۔ اس سے ایک ناخوش گوار فضا قائم ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر مسلم اقلیت کے صوبے میں مسلم لیگ مضبوط تر ہوتی گئی۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری عالم گیر لڑائی کا آغاز ہوا۔ اور کانگریس اور حکومت ہند کے مابین جنگ کے متعلق بعض اختلافات پیدا ہو گئے۔ ان اختلافات کے پیش نظر کانگریسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں۔ کانگریسی وزارتوں کے متعلق

ل درآمد ہوا، اور بعض یوں ہی تسکین ذوق کے لیے صفحۂ قرطاس پر مزین رہیں۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم
ے نظام میں کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔ ثانوی مدارس ہنوز یونیورسٹی کے تابع تھے۔ اور ان کے
ساب میں وہی مضامین داخل تھے جن کی بدولت طلبہ کو یونیورسٹی میں داخلہ لینے میں آسانی ہو جاتی
س طرح انتظامی اور نصابی لحاظ سے ان میں کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔ ماقبل ۱۹۰۲ء انگلستان
ے نظام تعلیم میں بھی ایک عمومی انتشار تھا۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی حد بندی کے متعلق ہر ایوان فکر کی اپنی
ائے تھی۔ ٹیکنیکل تعلیم کس عنوان سے دی جائے اس کے متعلق بھی کسی کی کوئی حتمی رائے نہ تھی۔ اس سے
یک عجیب سا انتظامی الجھاؤ پیدا ہو گیا۔ اور کسی کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس طرح سلجھایا جائے
یہ الجھاؤ بدستور قانون تعلیم مجریہ ۱۹۰۲ء تک قائم رہا۔

جب خود انگلستان میں تعلیم ایک محدود سے حلقہ میں کاوے بدلتی رہی تو ہماری یہ توقع کہ انیسویں صدی کے ربع آخر میں ہندوستان کی اپنی ضروریات کے مطابق ایک ایسا نظام تعلیم قائم ہو جاتا جو اس کا اپنا نظام تعلیم ہوتا، ایسی ہی تھی جیسے کسی صحرائی علاقہ میں بارش کی توقع۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا بادل کا ٹکڑا آ گیا تو دو چار بوندیں پڑ گئیں۔ ورنہ صحرا آخر صحرا ہی ہوتا ہے۔ انگلستان سے ہمیں وہی مل سکتا تھا جو اس کے پاس تھا اور جہاں سامراجی تقاضے مانع نہ ہوئے تو اس کے رشحات فیض سے ہمیں بھی حصہ ملتا رہا۔

انڈین یونیورسٹی کمیشن

۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے یونیورسٹی تعلیم کی پڑتال کے لیے ایک تعلیمی تحقیقاتی کمیشن قائم کیا جو انڈین یونیورسٹیز کمیشن کے نام سے موسوم ہوا۔ اس کمیشن نے ہندوستان کے مختلف اداروں کا دورہ کیا ایک ایک یونیورسٹی کا جائزہ لیا۔ اور ۱۹۰۲ء ہی میں اپنی رپورٹ مرتب کر لی۔ کمیشن کی اہم سفارشات یہ ہیں :-

(۱) موجودہ یونیورسٹی حکومت کا انتظام از سر نو کیا جائے ۔

(۲) کالجوں کی نسبتاً سخت اور منظم نگرانی کی جائے اور الحاق کی شرائط کو زیادہ قطعی اور درست

بنایا جائے ۔

(۳) طلبہ کی عمومی رہائش اور کام اور ان کے ماحول پر بالخصوص توجہ دی جائے ۔

(۴) مقررہ حدود میں ہر یونیورسٹی میں براہ راست تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے۔

(۵) نصاب اور طریق امتحان میں اہم اور ضروری تبدیلیاں کی جائیں۔

انہی سفارشات کی بنیاد پر انڈین یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۰۴ء منظور ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی ۱۹۵۴ء تک اسی قانون کے تابع کام کرتی رہی۔ دفعہ ۳ قانون ۱۹۰۴ء کے یہ الفاظ قابل توجہ ہیں۔

"یونی ورسٹی کے قیام کا مقصد منجملہ اور چیزوں کے طلبہ کی تعلیم کا اہتمام بھی ہوگا ہر یونیورسٹی کو اپنے پروفیسر اور لیکچرر کی تقرری کا حق ہوگا۔ وہ تعلیمی اوقاف کی مالک بن سکیں گی اور ان کا انتظام بھی انہی کے ہاتھ میں ہوگا۔ ان کا کام یہ بھی ہوگا کہ وہ کتب خانے، تجربہ گاہیں اور عجائب گھر قائم کریں، انھیں ساز و سامان سے آراستہ کریں۔ اور ان کا باقاعدہ انتظام کریں۔ طلبہ کی رہائش اور ان کے اخلاق کے متعلق قانون وضع کرنا بھی انھی کا کام ہوگا، اس کے علاوہ ان جملہ امور کا پورا پورا حق ہوگا۔ جو یونیورسٹی کے قانون ہیئت اجتماعی کے مطابق تعلیم اور تحقیق میں اضافے کے متعلق ہوں"

چوں کہ اس قانون کے مطابق الحاق کی شرائط بہت سخت کر دی گئی تھیں۔ اس لیے ہندوستان کے تعلیمی حلقوں میں اس کا خیر مقدم نہ ہو سکا۔ بلکہ چاروں طرف اس کے منسوخ کرنے کے حق میں ہنگامے ہوتے رہے۔

قرارداد ۱۹۱۳ء :- ۱۹۱۳ء میں حکومت نے یہ محسوس کیا کہ اس وقت ہندوستان کے نظام تعلیم کا جائزہ از سر نو لینے اور ایک نئی تعلیمی حکمت عملی مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے پیش نظر حکومت ہند نے ۱۹۱۳ء میں ایک تعلیمی قرارداد منظور کی۔ اس کی اہم سفارشات یہ ہیں :-

(۱) پیراگراف (۷) میں بیان شدہ اصول کے مطابق، ایسے لوئر پرائمری سکولوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہونا چاہیے۔ جہاں لکھنے پڑھنے اور ریاضی کے علاوہ۔ ڈرائنگ۔ گاؤں کے نقشے سے

واقفیت، مطالعۂ قدرت اور جسمانی تربیت کی تعلیم دی جاتی ہو۔

(ii) اس کے ساتھ ساتھ موزوں مقامات پر پرائمری اسکول قائم کیے جائیں۔ اور جہاں ضروری ہو وہاں لوئر پرائمری اسکولوں کو اپر پرائمری اسکول بنا دیا جائے۔

(iii) مدرسوں کی توسیع بورڈ اسکولوں کی صورت میں عمل میں آنی چاہیے۔ اور جہاں مالی وجوہات کی بنا پر یہ ممکن نہ ہو وہاں منظور شدہ انتظامیہ کے تحت، امداد پانے والے اسکولوں کے قیام کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ بعض علاقوں میں ایسے مکتبوں، پاٹھ شالاؤں اور اسی قسم کی دوسری درس گاہوں کی دا فرمالی امداد کی جائے جو علاقائی زبان میں عمومی تعلیم دینے پر رضامند ہوں۔ تجارتی قسم کے اداروں پر اس وقت تک بھروسا نہ کیا جائے جب تک وہ اچھی مجلس انتظامیہ کا قیام اور حوا کینے کا اصول اختیار کرکے تسلیم شدہ کہلانے کے حق دار نہ ہو جائیں۔

(iv) ہندوستان کے اکثر علاقوں میں فی الحال یہ ممکن نہیں ہے کہ دیہاتی اور شہری پرائمری اسکولوں کے نصاب میں بہت بڑا فرق رکھا جائے۔ لیکن شہری اسکولوں میں جغرافیے کی عملی تربیت اور تعلیمی سیر و سیاحت کے زیادہ مواقع ہیں۔ اس طرح مطالعۂ قدرت کو ماحول کے ساتھ ساتھ بدل جانا چاہیے۔ گاؤں کے نقشے سے واقفیت کی بجائے علاقے کے متعلق عام فہم معلومات کو جگہ ملنی چاہیے جس وقت قابل اساتذہ مہیا ہونے لگیں گے۔ نصاب میں زیادہ امتیاز قائم کرنا ممکن ہوگا۔

(v) اساتذہ کا انتخاب اس طبقے سے ہونا چاہیے جس طبقے کے لڑکوں کو انھیں پڑھانا ہے۔ انھیں مڈل ورنیکلر امتحان یا اسی قسم کا کوئی دوسرا کورس پاس کرنا چاہیے اور یہ کہ۔ سال کی تربیت حاصل کی ہو اگر انھوں نے صرف اپر پرائمری کورس پاس کیا ہے اور انھیں اسکول کا کافی تجربہ نہیں ہے تو اس صورت میں دو سال کی تربیت مناسب ہوگی۔ شروع شروع میں یہ تربیت چھوٹی مقامی درس گاہوں میں دی جانی چاہیے۔ لیکن مالی حالات اجازت دیں تو یہ تربیت زیادہ بڑے اور اچھے مرکزی نارمل اسکولوں میں دی جانی چاہیے۔ دونوں طرح کی درس گاہوں کے ساتھ تربیتی اسکولوں کا ہونا لازمی ہے، اور ان درس گاہوں کی وسعت کا انحصار بھی ان اسکولوں کی وسعت پر ہوگا ——————

______ اگر اساتذہ گاؤں میں یوں ہی پڑے رہیں اور ان کی طرف توجہ نہ دی جائے تو ان کی کارکردگی میں فرق آ جانا لازمی ہے۔ اس لیے اسکول کی چھٹیوں کے دوران میں اساتذہ کے لیے اصلاحی کورس کا انتظام زیادہ مفید ثابت ہوگی۔

(vii) تربیت یافتہ اساتذہ کو بارہ روپے ماہوار سے کم تنخواہ نہیں ملنی چاہیے (بعض علاقوں کے لیے خاص شرح دی گئی ہے) انھیں ایک درجہ دار ملازمت میں رکھنا چاہیے اور ان کے لیے پنشن مقرر ہونی چاہیے۔ یا ان کے لیے پراویڈنٹ فنڈ کا انتظام ہونا چاہیے۔

(viii) کسی استاد کے ذمے پچاس سے زیادہ طلبہ نہیں ہونے چاہئیں۔ اگر یہ تعداد تیس یا چالیس ہو تو بہتر ہے۔ اور مناسب یہ ہے کہ ہر جماعت کے لیے علیحدہ علیحدہ استاد ہوں۔

(viiii) توسیعی مدارس جو ماڈل اسکول کہلاتے ہیں انھیں بہتر بنایا جائے۔ اور ان کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔

(ix) اسکولوں کی عمارت صاف ستھری، وسیع اور کم خرچ ہونی چاہیے۔

یہ عمومی اصول بیان کرتے ہوئے حکومت ہند کو احساس ہے کہ مختلف صوبوں میں ابتدائی تعلیم کے حالات مختلف ہیں۔ مثال کے طور پر بنگال کے پرانے صوبے میں تقریباً ہر تین مربع میل علاقے میں ایک پرائمری اسکول موجود ہے۔ اور یہاں اسکولوں کی تعداد بڑھانے کی بجائے طلبہ کی حاضری زیادہ کرنے اور اساتذہ کی اہلیت میں اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کے بعض حصوں میں اس وقت پرائمری اسکول کا کوئی استاد کبھی ۱۲ روپے ماہوار سے کم تنخواہ نہیں پاتا۔ برما میں حالات مختلف ہیں اور وہاں خانقاہی اسکولوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح جہاں پرائمری تعلیم کی بنیاد بورڈ یا امدادی اسکولوں پر ہے انھیں مختلف مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیے۔ کہ یہاں جو عمومی اصول بیان کیے گئے ہیں وہ حکومت ہند یا صوبائی حکومتوں کے لیے حرف آخر کا درجہ رکھتے ہیں۔ حکومت ہند کو یہ امید ہے کہ وہ دن دور نہیں جب پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کو تنخواہ بھی نسبتاً زیادہ ملے گی جب تمام اساتذہ تربیت یافتہ ہوں گے اور جب پرائمری اسکولوں میں جدید اور لچکدار طریقے نافذ کیے جائیں گے حکومت ہند کی یہ خواہش اور امید ہے کہ مستقبل قریب میں لڑکوں کے موجودہ ایک لاکھ پرائمری پبلک

اسکولوں میں اکانوے ہزار کا اضافہ کر دیا جائے۔ اور اس وقت تعلیم پانے والے سوا چالیس لاکھ طلبہ کی تعداد کو دگنا کر دیا جائے۔

ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے متعلق بھی اس طرح ہر بات شرح و بسط کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

کلکتہ یونی ورسٹی کمیشن

ابھی یہ قرارداد، قرارداد ہی تھی، کہ پہلی عالمگیر لڑائی شروع ہوگئی اور تعلیم کی تعمیر نو کا مسئلہ بھی التواء میں پڑ گیا۔ ۱۹۱۷ء میں جب جنگ کے بادل کچھ کچھ چھٹنے لگے اور انگریزوں کو اپنی کامیابی کا احساس ہو چلا تو ایک مرتبہ پھر تعلیم کی تعمیر کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ اس سال حکومت نے ڈاکٹر سیڈلر، وائس چانسلر یونی ورسٹی آف لیڈز کی قیادت میں کلکتہ یونی ورسٹی کمیشن کی تقرری کا اعلان کیا۔ کمیشن نے ثانوی اور یونی ورسٹی تعلیم کا تفصیلی جائزہ لیا اور ۱۹۱۹ء میں اپنی سفارشات تیرہ جلدوں میں پیش کیں اس کی چند اہم سفارشات یہ ہیں:-

ثانوی تعلیم

(۱) یونی ورسٹی اور ثانوی تعلیم کا خط تقسیم میٹرک نہیں انٹرمیڈیٹ ہے۔

(۲) اس کلیے کے پیش نظر حکومت ایک نئے قسم کا میٹرکولیشن ادارہ قائم کرے۔ یہ ادارہ انٹرمیڈایٹ کالج کہلائے گا اور اس میں آرٹس، سائنس، طب، انجینیرنگ اور تعلیم کے مضامین پڑھائے جائیں گے۔ ان کالجوں کا انتظام یا تو بالکل علیحدہ ہو یا انھیں چند مخصوص ہائی اسکولوں کے ساتھ شامل کر دیا جائے۔

(۳) یونیورسٹی میں داخلے کے لیے انٹرمیڈایٹ کا امتحان پاس کرنا ضروری ہوگا۔

(۴) بورڈ آف سکینڈری اور انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن قائم کیا جائے، یہ بورڈ، حکومت، یونیورسٹی ہائی اسکولوں اور انٹرمیڈیٹ کالجوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو۔ اس کا کام ثانوی تعلیم کا انتظام اور کنٹرول ہو۔

یونی ورسٹی تعلیم:- (۱) ایک وحدانی تدریسی یونی ورسٹی ڈھاکہ میں قائم کی جائے۔

(۲) کلکتہ شہر کے جملہ تدریسی وسائل کو یکجا کرکے کلکتہ میں ایک تدریسی یونی ورسٹی قائم کی جائے۔
(۳) مفصل کالجوں کو اس طرح ترقی دی جائے کہ آگے چل کر یہی یونی ورسٹیاں بن جائیں جو بعض مخصوص مضامین کے لیے مخصوص ہوں۔
(۴) آنرز کورس کا اجرا کیا جائے۔
(۵) انٹرمیڈیٹ کے بعد ڈگری کورس تین سال کا ہو۔
(۶) پروفیسر اور ریڈر کی تقرری کے لیے ماہرین کی ایک مخصوص کمیٹی مقرر کی جائے جس میں بیرونی ماہر بھی شامل ہوں۔

کلکتہ یونی ورسٹی کمیشن کا یہ سروے اتنا مفصل اور واضح ہے کہ اس میں ابہام کی گنجائش نہیں لیکن قانون حکومت ہند مجریہ ۱۹۱۹ء کے مطابق تعلیم مرکزی حکومت سے نکل کر صوبوں کے پاس پہنچ گئی تو اس کمیشن کی سفارشات کا حشر بھی کچھ اچھا نہ ہوا۔ بعض صوبوں نے اکا دکا سفارشات پر عمل کیا اور بعض نے اسے قطعی درخور اعتنا نہ جانا۔ لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ اُس وقت سے لے کر اس وقت تک جتنے تعلیمی کمیشن وجود میں آئے ان کی سفارشات کلکتہ یونی ورسٹی کمیشن کی سفارشات کی صدائے بازگشت ہیں۔ یعنی ایک طرف تو ان سفارشات پر عمل کرنے کی توفیق نصیب نہیں ہوئی اور دوسری طرف اصلاح حال کے لیے ہم انھیں سفارشات کو بالفاظ دیگر دہراتے رہے اور یہ کیفیت ہنوز جاری ہے۔

آئینی تبدیلی

۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہوئی اور برطانیہ کو بھی سکون کا سانس لینے کا موقع ملا۔ ہندوستان کے مبصرین سیاست نوآبادیاتی درجے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ لیکن ان کی یہ بات تسلیم نہ کی گئی اور حکومت نے محض چند آئینی تبدیلیوں کو کافی سمجھ کر ۱۹۱۹ء کے آئین کا اعلان کر دیا۔ اس آئین کے مطابق تعلیم کی ذمہ داری صوبائی حکومتوں کے سپرد کر دی گئی۔ واضعین آئین کے پیش نظر ہندوستان کو ایک وحدہ سمجھنا غلطی تھی اس لیے جو آئین ۱۹۱۹ء میں مرتب ہوا، اس کی بنیاد وفاقی تھی اور یہ اس طرح کہ آگے چل کر جو آئینی تبدیلیاں رونما ہوں حکومت کے وفاقی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہونے پائے۔ اس وفاقی آئین کے

ابتدائیہ میں تعلیم کا صوبائی حکومتوں کے زیرِ اہتمام آنا بالکل فطری تھا۔ ہر صوبہ اپنی زبان، اپنی ثقافت اور اپنی مقامی ضروریات کے تابع ایک نیا تعلیمی نظام قائم کر سکتا تھا۔ اس آئینی تبدیلی کے بعد حکومت ہند کے محکمہ تعلیم کی حیثیت ایک نگران کی سی رہ گئی اور اب وہ از خود کسی تعلیمی قانون کا اجرا اور نفاذ نہیں کر سکتا تھا۔ حکومت ہند کے اس دستِ تعاون کے اٹھنے کے بعد تعلیم کی عمومی حکمتِ عملی میں یگانگت پیدا نہ ہو سکی۔ اور اب اس وقت دونوں ملک اپنی اپنی قومی یک جہتی کی خاطر تعلیمی یک جہتی پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

سائمن کمیشن ۱۹۲۹ء

۱۹۱۹ء کی آئینی تبدیلیاں خواستگارانِ آزادی کو مطمئن نہ کر سکیں اور اس بے اطمینانی نے بالآخر احتجاج کی صورت اختیار کر لی۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ اتحادیوں نے سلطنتِ عثمانیہ کے حصے بخرے کر کے آپس میں تقسیم کر لیے اور خلافت کو ایک ادارے کی حیثیت سے منسوخ کر دیا۔ اس سے ہندوستان کے مسلمانوں کو جو ٹھیس لگی تو تحریکِ خلافت کا آغاز ہوا۔ ہندوستان کے مسلم زعمانے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے دنوں کا آرام اور راتوں کا چین قربان کر دیا۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، یہ وہ لوگ تھے جو بے سر و سامانی کے عالم میں بھی ایک اصولی جنگ لڑ رہے تھے۔ آئینی تبدیلیوں کے خلاف جو احتجاج ہو رہا تھا اس نے ایک اشتراک کی صورت اختیار کر لی۔ تا این کہ تحریکِ ترکِ موالات اور تحریکِ خلافت کے احتجاجی جلسے ایک ساتھ ہونے لگے۔ ہندو مسلم اتحاد کی یہ آخری جھلک تھی جو ان دونوں تحریکوں کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔

ان احتجاجی جلسوں کا ایک نتیجہ یہ ضرور برآمد ہوا کہ برطانیہ نے ۱۹۲۷ء میں سر جان سائمن کی قیادت میں ایک آئینی کمیشن مقرر کیا۔ اس کمیشن نے اپنی معلومات کے لیے سر فلپ ہارٹاگ کی قیادت میں ایک امدادی تعلیمی کمیٹی بھی مقرر کی۔ اس امدادی کمیٹی نے ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا جائزہ لے کر پہلی مرتبہ تعلیم کو مربوط کل بنانے کی کوشش کی۔ یہ کوشش اس لیے بھی قابلِ تحسین ہے کہ اس رپورٹ میں نظریۂ تعاطر کو کوئی مقام حاصل نہیں۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ووڈ ڈیسپچ نے بھی اس نظریے کی مخالفت کی اور ۱۸۸۲ء میں اسے مسترد قرار دیا گیا تھا۔ اور اس کے بعد جو تعلیمی کمیٹی وجود میں آئے وہ بھی اس کی تردید کرتے ر ہے۔

لیکن اس کے باوجود یہی نظریہ ہمارے ذہنوں پر مسلط رہا۔ حتیٰ کہ آج بھی ہم یہی سمجھتے ہیں کہ ایک مخصوص طبقہ کی تعلیم سے قومی نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

نہرو کمیٹی رپورٹ

ترک موالات کی تحریک پھر سرگرم کار ہوئی۔ اور کانگرس نے سائمن کمیشن کا خیر مقدم سیاہ جھنڈیوں سے کیا۔ ہندوستان کا آئین کیا ہونا چاہیے۔ اس کے لیے کانگرس نے پنڈت موتی لال نہرو (الٰہ آبادی) کی قیادت میں ایک کمیٹی مقرر کی۔ اس کمیٹی نے ہندوستان کے آئین نو کی تدوین و ترتیب کے سلسلے میں جو سفارشات کیں اس میں مسلمانوں کے حقوق کا احترام نہ کیا۔ بلکہ انھیں اکثریت کے رحم و کرم پر اس طرح چھوڑ دیا گیا۔ یا ان کی اپنی کوئی انفرادی حیثیت نہیں۔ اس سے دونوں قوموں (ہندو مسلم) کی رہی سہی یک جہتی بھی ختم ہو گئی۔

آئینی تبدیلی

سائمن کمیشن اور اس کے مابعد آئینی کش مکش کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ حکومت برطانیہ بعض آئینی تبدیلیوں کے لیے تیار نہ تھی اور ہندوستان کے ارباب سیاست کو اس پر اصرار تھا۔ اس وقت برطانیہ خود ایک اقتصادی بحران کا شکار تھا۔ لیکن اس کے باوجود دونوں کا نقطۂ نگاہ مختلف رہا اور سمجھوتے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ بالآخر ۱۹۳۵ء میں برطانوی پارلیمان نے آئینی تبدیلیوں کا قانون منظور کر لیا۔ جو آئین حکومت ہند مجریہ ۱۹۳۵ء کے نام سے موسوم ہوا۔ اس آئین کے مطابق صوبوں کے اختیارات میں اور اضافہ ہو گیا۔ اور ہندوستان کی مرکزی حکومت ایک وفاقی حکومت بن گئی۔ ۱۹۳۷ء میں اس آئین کے تحت عمومی انتخابات ہوئے۔ ہندو اکثریت کے صوبوں میں کانگریسی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ مسلم لیگ نے بھی ان انتخابات میں حصہ لیا۔ لیکن ابھی اسے اتنی نمایاں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ کانگریسی حکومتوں نے اپنے مختصر سے دور حکومت میں مسلمانوں کے جذبات و احساسات کو قدم قدم پر کچلا۔ اس سے ایک ناخوش گوار فضا قائم ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر مسلم اقلیت کے صوبے میں مسلم لیگ مضبوط تر ہوتی گئی۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری عالم گیر لڑائی کا آغاز ہوا۔ اور کانگریس اور حکومت ہند کے مابین جنگ کے متعلق بعض اختلافات پیدا ہو گئے۔ ان اختلافات کے پیش نظر کانگریسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں۔ کانگریسی وزارتوں کے مستعفی

ہونے پر مسلم لیگ نے یوم نجات منایا۔ آخر آئی اس پہ تباہی آآذ منائیں فکر الہی۔

اس مختصر سی روداد کا مقصد یہ ہے کہ اس دور میں ہندوستان کے ارباب فہم کی ساری توجہ حصول آزادی پر مرکوز رہی۔ تعلیم کی طرف بہت کم توجہ دی گئی۔ خود طلبہ مبصرین سیاست کے اکسانے پر سیاست میں حصہ لے رہے تھے۔ یہ حالات تادیر قائم رہے اور مدتوں تعلیمی اصلاح کا کوئی کام نہ ہو سکا۔

عربستان کے چند لسانی و ادبی مسائل

محمد کاظم سباق

ادب و لغت کے موضوع پر عرب میں ایک مسائل ایسے ہیں جو ایک طویل عرصہ عرب میں اہل فکر و شعور کی توجہ کا مرکز بنے رہے ہیں۔ ان میں سے بعض مسائل کی تاریخ کافی پرانی ہے لیکن ذہنوں کے اندر ان کا خیال ابھی تک موجود ہے۔ آج بھی ان مسائل پر گاہے گاہے کوئی بحث دیکھنے میں آجاتی ہے۔ ان مسائل پر جو چیزیں ہماری نظر سے گذری ہیں ان کا مفصل تذکرہ کسی دوسرے موقع پر کیا جائے گا۔ آج کی صحبت میں چند زیر بحث مسائل کا ایک مختصر سا جائزہ قارئین کے پیش خدمت کیا جا رہا ہے۔

ادب میں قدیم و جدید کی تقسیم

پہلا مسئلہ قدیم و جدید کا ہے۔ موجودہ صدی کے نصف اول میں جب عربی زبان و ادب کی نشاۃ ثانیہ عروج کو پہنچی تو مصر و شام کے بعض اہل قلم نے عربی بلاغت و انشا پردازی کا ایک ایسا اونچا معیار قائم کر دیا، جہاں تک نحو و لغت اور علوم بلاغت کی دشوار گذار گھاٹی عبور کیے بغیر رسائی حاصل کرنا ناممکن تھا۔ عرب کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو جب یہ کٹھن منزل دشوار نظر آئی تو اپنے ضعف و عجز پر پردہ ڈالنے کے لیے انھوں نے عربی ادب میں قدیم و جدید کا مسئلہ کھڑا کر دیا ——— قدیم ادب وہ قرار پایا جس میں نحو و گرامر کا التزام ہو جس میں عرب کے قدیم اور خالص محاورے کی پابندی ہو جس کا طرز اموی اور عباسی دور کے انشا پردازوں کا ہو جس کے سامنے مثالی نمونہ قرآن کریم کی زبان کا ہو۔ جو فصاحت و بلاغت کے اصولوں پر ہر لحاظ سے پورا اترے اور جدید ادب وہ کہلایا گیا جو مذکورہ بالا تمام پابندیوں سے آزاد ہو جس میں بقول اس طبقے کے۔ لفظ سے زیادہ معنی کا اہتمام ہو جس کی عبارت سلیس اور سادہ ہو۔ اگرچہ اس سادگی میں ادبی چاشنی اور حلاوت کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔ آج سے تقریباً تیس سال پہلے مصر میں قدیم و جدید کا معرکہ کارزار گرم تھا۔ جدید طبقہ کی سربراہی نابینا ادیب طٰہٰ حسین کر رہے تھے۔ اور ان کے مقابلہ پر اس دور کے ادب و لغت کے امام مصطفےٰ صادق الرافعی

ہتہ تھے. قدیم ادب والے کہتے تھے کہ نہ ہم قدیم ہیں نہ تم جدید ہو. عربی زبان وادب میں تطور وارتقا کے تو
ل ہیں. لیکن یہ قدیم وجدید کی حد بندی بالکل وہمی اور خیالی چیز ہے. جدید ادب والوں کا اصرار تھا
یں تم قدیم ادب کے نمائندہ ہو اور ہم جدید ادب کے علم بردار ہیں. تم ماضی کی یادگار ہو ہم حال اور مستقبل
ار ہیں —— یہ معرکہ اگرچہ بعد کے زمانہ میں کچھ ٹھنڈا پڑ گیا. لیکن دونوں طرف کے حامی ابھی تک
رہیں اور اس معرکہ کی صدائے بازگشت آج بھی وقتاً فوقتاً سنائی دے جاتی ہے۔

رسم الخط کی اصلاح

دوسرا مسئلہ عربی زبان کے موجودہ رسم الخط کی اصلاح کا ہے. مصطفیٰ کمال نے ترکی زبان کا رسم الخط کیا بدلا.
بدعتِ سیہ کی طرح ڈال دی جس کے حق میں اور کبھی کئی مشرقی ملکوں کے اندر تحریکیں اٹھیں. ہمارے
ملک میں اردو زبان کے لیے رومن رسم الخط اختیار کرنے کی تجویز کئی دفعہ سامنے آئی اور روپوش ہوئی اسی
عرب میں بھی آج سے کوئی بیس سال پہلے مصر کی ایک مشہور قانون دان شخصیت عبدالعزیز فہمی پاشا نے
کی لغوی اکیڈمی کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ عربی زبان کے لیے رومن رسم الخط اختیار کیا جانا چاہیے اکیڈمی
تجویز رائے عامہ کی توجہ کے لیے نشر کی. تجویز کا منظر عام پر آنا تھا کہ ملک کے پڑھے لکھے طبقہ میں اس کے
نہ زبردست ہنگامہ برپا ہوگیا. اس تجویز کے رد و قدح میں اتنے مضامین شائع ہوئے اور صاحب تجویز
طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہوئی کہ اسے جان چھڑانی مشکل ہوگئی. اس تجویز کے حق میں بڑی
یہ دی گئی کہ عربی کا موجودہ رسم الخط بہت مشکل اور دقیق ہے. مدرسہ میں آٹھ دس سال عربی زبان
لیم حاصل کرنے کے بعد بھی ایک طالب علم عربی عبارت صحت کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا جس کی بڑی وجہ
الخط اور اعراب کی پیچیدگیاں ہیں. رومن رسم الخط میں ان سب مشکلات اور پیچیدگیوں کا حل موجود ہے
ب. اس تجویز پر لوگوں نے قواعد زبان اور تلفظ کے پہلو سے مدلل قسم کے اعتراض کیے اور اس ضمن میں قدیم
ہبی روایات کے نقطۂ نظر کا سوال بھی سامنے لایا گیا تو پاشا نے جواب میں کہا تعجب کی بات ہے کہ
ا رسم الخط جو ہمیں مشرکین عرب سے ورثہ میں ملا ہے اس کو تو ہم اتنا مقدس سمجھتے ہیں کہ اس سے
ت بردار ہونے پر کسی طرح آمادہ نہیں. لیکن رومن رسم الخط جو ہمیں پیروان مسیح سے ملے گا اس کو ہم

کیا سمجھتے ہیں۔ کیا مسیح اہل کتاب ہمارے زیادہ قریب ہیں یا قدیم عرب کے بُت پرست؟ کہا گیا کہ جناب: قرآن اور احادیث شریف کس رسم الخط میں لکھے جائیں گے؟ کیا انھیں بھی آپ رومن رسم الخط میں منتقل کرکے بازیچۂ اطفال بنا دیں گے۔ جواب ملا کہ نہیں قرآن و حدیث اپنے رسم الخط میں باقی رہیں گے اور اس رسم الخط کو پڑھنے اور سمجھنے والے علما اور دینی مدارس کے طلبا ہر زمانہ میں موجود رہیں گے۔ علما اب آئندہ ہمارے لیے مستشرقین کی سی خدمات سر انجام دیں گے۔ یعنی جدید نسل کے لیے ان تصانیف و کتب کی شرح و تفسیر کیا کریں گے۔ جو نئے رسم الخط میں منتقل نہیں ہوئی ہوں گی۔

عبدالعزیز فہمی پاشا کی اس تجویز کا جو حشر اس وقت ہوا سو ہوا۔ لیکن رسم الخط کی اصلاح کا مسئلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ ابھی تک اہل فکر اس پر سوچ رہے ہیں۔ اور اس سلسلے میں کچھ معتدل اور معقول قسم کی تجویزیں بھی سامنے آنے لگی ہیں۔

فصیح عربی اور عامی زبان

اسی سے ملتا جلتا ایک تیسرا مسئلہ عربی میں فصیح زبان اور عامی زبان کی کشمکش کا ہے۔ موجودہ صدی کے اوائل کی بات ہے کہ مصر کے ایک انگریز انجینئر نے تجویز پیش کی کہ بجائے فصیح عربی زبان کے عرب کے ہر ملک کو چاہیے کہ اپنی مقامی زبان کو ترقی دے کر اسی سے ایک لکھنے پڑھنے اور بول چال کی زبان پیدا کرے۔ ظاہراً اس تجویز کا فائدہ یہ بتایا گیا کہ اس طرح ایک مصری طالب علم آسانی سے اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کر سکے گا اور ایک عراقی اپنی مقامی زبان میں۔ یہ جو فصیح عربی کی تعلیم کا سخت مشکل بوجھ مختلف عرب ممالک کے طلبا پر خواہ مخواہ پڑا ہوا ہے، اس سے نجات حاصل ہو جائے گی۔ دوسرے یہ کہ اس طرح عوامی ادب جو دراصل کسی ملک کی ثقافت کی جان ہوتا ہے۔ ٹھیک طرح نشوونما حاصل کر سکے گا۔ موجودہ حالت میں فصیح و عامی کی تقسیم نے عامی ادب کو ان پڑھ طبقہ کی محلسوں اور محفلوں تک محدود رکھا ہوا ہے اور پریس پر فصیح زبان کا غاصبانہ قبضہ ہے ــــــــــ باطن میں اس تجویز کا مقصود یہ تھا کہ فصیح عربی زبان کی وحدت جس نے عرب کے متعدد ممالک کو ایک رشتہ میں جوڑ رکھا ہے اس کا طلسم کسی طرح ٹوٹے، اور قرآن کی زبان کا تسلّط کسی طرح ذہنوں سے دور ہو۔ انگریز انجینئر کی ہاں میں ہاں ملانے کے لیے کچھ مصری تجدّد پسند بھی اٹھ کھڑے ہوئے

لیکن وہ زمانہ جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہٗ کا تھا۔ شیخ محمد عبدہٗ نے اس تجویز کے جواب میں طرح کر کہا:۔

بل نصعد بالعامیة الی افق الفصیح (ہم اس کی بجائے اپنی عامی زبان کو فصیح کے درجے تک لے جائیں گے) اس کے کچھ عرصہ بعد بھی تجویز تمصیر اللغۃ (عربی زبان کو مصری جامہ پہنانے) کے نام سے ظاہر ہوئی۔ لیکن مصطفیٰ صادق الرافعی نے اپنے زوردار قلم سے اس کا بھی تار پود بکھیر دیا اور کہا:۔

بل نعرب المصریۃ (ہم مصری زبان کو عربی کا جامہ پہنائیں گے) تاہم عامی زبان کو نشو و نما دینے کی یہ تحریک اس زمانہ میں پوری طرح دبائی نہیں جا سکے گی اور اس کے حامیوں میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ زمانۂ حال کے بعض افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں مقامی رنگ پیدا کرنے اور انہیں زیادہ مقبول بنانے کا یہ طریقہ نکالا ہے کہ ان میں عامی زبان جگہ جگہ استعمال کرتے ہیں۔ خاص طور پر مکالموں میں۔ اس مقبولیت کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ عربی افسانہ کے لیے ایک تیسری زبان پر غور کیا جانے لگا ہے۔ جو فصیح عربی اور عامی کا امتزاج ہو۔

شعر مقفیٰ اور شعر مرسل

زمانہ حال میں جس طرح دنیا کی دوسری زبانوں میں آزاد نظم کی بدعت نے جنم لیا ہے۔ اسی طرح عربی زبان میں بھی شعر مرسل کا عام رواج چل نکلا ہے۔ عرب کے ترقی پسند اور جوڑی کے ادبی رسالوں میں "آزاد نظم" کا تناسب شعر مقفیٰ سے کچھ زیادہ ہی نظر آتا ہے۔ الادیب بیروت کے حلقۂ ادب میں ایک عجیب بات محسوس ہوتی ہے کہ یہاں شعر مقفیٰ اور شعر مرسل کے درمیان رقابت کی ایسی فضا قائم ہے جو کہیں دوسرے حلقوں میں نظر نہیں آتی اور نہ اس کا عام سے اردو ادب میں کوئی وجود پایا جاتا ہے۔ تجدد پسند ادبا شعر مقفیٰ کا ذکر کچھ اس انداز سے کرتے ہیں کہ جیسے کوئی حقیر اور پامال قسم کی چیز ہو ——— دوسرے لفظوں میں یہی قدیم و جدید کا جھگڑا اب شاعری میں بھی چل نکلا ہے۔ (ماخوذ از ہفت روزہ "شہاب" لاہور)

معلومات عامہ

مشترکہ کاروبار کا قانون

یوں تو برطانیہ میں مشترکہ کاروبار کا طریقہ ایک مدت دراز سے رائج ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۶۲ء کے بعد تک اس طریقۂ کاروبار کو ملک میں مقبولیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اس سال برطانیہ میں ایک قانون منظور کیا گیا جس کے مطابق محدود ذمہ داری کو شراکت کے قانون کا بنیادی نکتہ بنا دیا گیا۔ اس قانون کے نفاذ سے قبل یہ دستور تھا کہ مشترکہ کاروبار کے شرکا ساہوکار کے واجب الادا روپیہ کی ادائیگی کے مشترکہ طور پر بھی اور انفرادی طور پر بھی ذمہ دار ہوتے تھے۔ اور ساہوکار کو یہ حق حاصل ہوتا تھا کہ وہ ان سب شرکا کی جائداد سے یا ان میں سے کسی ایک کی جائداد یا ذرائع آمدنی سے جیسی بھی صورت ہو اپنا روپیہ وصول کر لے۔ بہرحال محدود ذمہ داری کا مطلب یہ ہے کہ مشترکہ کاروبار کا ہر حصہ دار ساہوکار کے واجبات کی ادائیگی کا ذمہ دار تو ہوتا ہے۔ مگر مشترکہ کاروبار میں شریک حصہ دار سے اس کے حصہ سے زیادہ رقم وصول نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً میں ایک مشترکہ کمپنی میں پانچ پانچ شلنگ کے چار حصوں کا مالک ہوں اور وہ کمپنی ساہوکار کے واجبات ادا کرنے میں ناکام ہو جائے تو ساہوکار مجھ سے اپنے واجبات کے سلسلے میں ایک پونڈ سے زیادہ وصول نہیں کر سکتا۔ اگر محدود ذمہ داری نہ ہوتی تو اس امر کا خدشہ تھا کہ میں ساہوکار کے واجبات کی ادائیگی سے قبل ہی مالیاتی اعتبار سے تباہ ہو جاتا اور جو کچھ میرے پاس تھا چھین جاتا۔

محدود ذمہ داری کی وجہ سے مشترکہ کاروبار میں روپیہ لگانا انتہائی ممکن العمل ہو گیا ہے۔ یہ دونوں کے لیے فائدہ مند ہے۔ جن لوگوں کے پاس بڑی رقمیں ہیں اور وہ بڑے کاروبار میں روپیہ لگا سکتے ہیں اور جن کے پاس پس انداز کیا ہوا تھوڑا سا ہی سرمایہ ہے وہ بھی یکساں طور پر کاروبار میں بڑی رقم لگا سکتے ہیں وہ اپنی رقم کو متعدد کاموں میں لگا کر نقصان کے امکانات اور رقم کے ڈوبنے کے خطرہ کو کم کر سکتے ہیں۔

دوسری طرف وہ شخص بھی جس کے پاس پس انداز کی ہوئی چھوٹی سی رقم ہے اور یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی پونجی اتنی نہیں ہے کہ کسی بڑے مشترکہ کاروبار میں لگائی جا سکے کسی بڑے کاروبار کے حصے اپنی حیثیت کے مطابق خرید سکتا ہے۔ اور اپنے روپیہ سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتا ہے بعض وہ لوگ جو نفع کے ایسے کاموں میں روپیہ لگانا پسند کرتے ہیں جن میں سرمایہ کے ڈوب جانے کا کم خطرہ ہو، وہ براہ راست کاروبار میں روپیہ نہیں لگایا کرتے بلکہ ایسے مالی اداروں کے حصے خرید لیتے ہیں جو دوسری تجارتی کمپنیوں میں روپیہ لگاتے ہیں اشتراکہ کاروبار کا ایک دوسرا قابل ذکر فائدہ یہ ہے۔ اگر کاروبار میں شراکت سیدھی سادھی ہے اور ایک حصہ دار اپنا روپیہ کاروبار سے نکالنا چاہتا ہے تو وہ یا تو کسی ایسے آدمی کو تلاش کرے گا جو اس کی جگہ کاروبار میں روپیہ لگا دے ورنہ وہ اپنا روپیہ نکال کر اس کاروبار کو نقصان پہنچائے اور تباہ کر دینے کا سبب بنے گا۔ مگر کسی ایسے شترکہ کاروبار سے جو مشترکہ کاروبار کے قانون کے مطابق قائم ہوا ہے۔ اگر کوئی شخص جس نے اس میں روپیہ لگایا ہے اپنا روپیہ نکالنا چاہے تو کمپنی کو کسی قسم کا نقصان پہنچائے بغیر وہ بڑی آسانی سے اپنے حصے فروخت کر سکتا ہے۔ اور کمپنی سے اپنا روپیہ نکال سکتا ہے۔ وہ اسٹاک ایکسچینج کے ذریعے جہاں تمسکات کی خرید و فروخت ہوتی ہے اپنے حصے فروخت کر سکتا ہے۔

برخلاف صرافہ بازار کے جہاں کاروبار ایک ہی جگہ نہیں ہوتا ہے، تمسکات کی خرید و فروخت ایک ہی جگہ ہوتی ہے (برطانیہ میں متعدد صوبائی ادارے تمسکات کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ ان کا کاروبار بھی بالکل لندن اسٹاک ایکسچینج کی مانند ہے" (یہاں ہم ان صوبائی اداروں کا ذکر کر رہے ہیں جو تمسکات کی خرید و فروخت کرتے ہیں) جیسا کہ اسٹاک ایکسچینج کے لفظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ایک مقام ہے جہاں حصے بیچے جاتے ہیں اور خریدے جاتے ہیں اور ان کے ذریعے ہر شخص اپنا سرمایہ کاروبار میں لگا سکتا ہے۔ میں نے ذریعہ کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ کیوں کہ اگرچہ عوام کو گیلری میں بیٹھ کر تمسکات کی خرید و فروخت میں براہ راست حصہ نہیں لے سکتا۔ اگر آپ وہاں حصے خریدنا یا بیچنا چاہتے ہیں تو آپ ایجنٹ کے ذریعے ایسا کر سکتے ہیں یہ ایجنٹ بروکر یعنی دلال کہلاتا ہے۔ لندن اسٹاک ایکسچینج اور دوسرے تمام اسٹاک ایکسچینج میں بڑا فرق یہ ہے کہ لندن اسٹاک ایکسچینج کے ممبران دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک دلال ہوتے ہیں اور دوسرے جابرس

بلاتے ہیں جو فی الحقیقت کاروبار کرنے والے ہوتے ہیں۔ مگر جابرس براہِ راست عوام سے کاروبار نہیں کرتے ہیں وہ صرف دلال کے ذریعے کام کرتے ہیں۔ دلال کی آمدنی وہ کمیشن ہوتا ہے جو اسے حصے خریدنے والے سے ملتا ہے اور وہ شرح جس پر دلال اپنا کمیشن لیتا ہے اسٹاک ایکسچینج کی مجلس انتظامیہ کی مقرر کردہ ہوتی ہے اور جابر کی آمدنی وہ نفع ہوتا ہے جو وہ حصوں کی خرید و فروخت سے حاصل کرتا ہے۔ دلال محض دلالی کے فرائض انجام دیتا ہے۔ جبکہ جابر حصوں کی خریداری میں اپنا روپیہ لگاتا ہے۔

حصوں کے خرید و فروخت کے کام کے طریقہ کو واضح طور پر سمجھانے کے لیے ہم ایک معمولی سی مثال پیش کرتے ہیں۔ ایک شخص کے پاس تین سو پونڈ ہیں اور وہ یہ طے کرتا ہے کہ وہ اس رقم کو کسی ایسے کاروبار میں لگائے گا جس میں نقصان نہ ہوگا۔ یعنی وہ حکومت کی کفالتوں کی خریداری میں اپنا روپیہ لگائے گا۔ جو حصے خریدنا وہ پسند کرتا ہے وہ ۲½ فی صدی کے اضافہ سے مل سکتے ہیں۔ چناں چہ اخبار کے ذریعہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ بھاؤ ۹۴ پونڈ پر آکر رک گیا ہے۔ یعنی ایک سو پونڈ کی مالیت کے حصے کی قیمت ایک سو چار پونڈ ہے وہ اپنے دلال کو ٹیلیفون پر ہدایت دیتا ہے کہ تین سو پونڈ کے حصے زیادہ سے زیادہ اچھی قیمت پر خرید لو۔ دلال ہدایت پاکر اپنے دفتر سے جو اسی عمارت میں واقع ہے روانہ ہوتا ہے اور جہاں حصوں کی خرید و فروخت ہو رہی ہے آتا ہے۔ وہ ان جابرس کے پاس آتا ہے جو ایسے حصوں کا کاروبار کر رہے ہیں جن پر روپیہ لگانے میں کوئی نقصان کا خطرہ نہیں ہے اور ان میں سے ایک سے دریافت کرتا ہے ۲½ فی صدی (مبادلہ) کی کیا قیمت ہے۔ کس بھاؤ پر خریدے اور بیچے جا رہے ہیں۔ وہ یہ بات قطعی ظاہر نہیں کرتا ہے کہ آیا اسے حصص فروخت کرنے ہیں یا خریدنے اور یہ بات روپیہ لگانے والے کے قطعی مفاد میں ہے۔ کیوں کہ جابر دونوں صورتوں کے لیے تیار ہوگا وہ بھی خریدے گا اور فروخت بھی کرے گا۔ اگر اسے یہ بات معلوم ہوگئی کہ دلال حصے خریدنا چاہتا ہے تو وہ قیمت زیادہ بتائے گا۔ اور اگر اسے یہ پتہ چل جائے کہ دلال حصص فروخت کرنا چاہتا ہے تو وہ دام گرا کر بتائے گا۔ اس لیے دلال کے گول مول سوال کے جواب میں جابر کہتا ہے کہ ۲-۳ میں خریدے گا اور ۴ میں فروخت کرے گا۔ اس صورت میں وہ یہ تصور کرے گا کہ دلال اس کے جواب سے مطمئن ہے اور اپنے گاہک کی طرف سے حصص خریدنا چاہتا ہے۔ دلال اپنے گاہک کو مندرجہ ذیل تحریر ارسال کرتا ہے۔

	پونڈ	شلنگ	پنس
۳۰۰ پونڈ کا زرمبادلہ ۴½ فیصد کے حساب سے ۱۰۴⅛ فی سینکڑہ	۳۱۲	۷	۶
دستاویز اقرار نامہ	۰	۲	۰
کمیشن ⅜	۱	۲	۶
	۳۱۳	۱۲	۶

جب روپیہ لگانے والا مندرجہ بالا رقم ادا کر دیتا ہے تو اس میں وہ دلال کا کمیشن بھی ادا کرتا ہے جو دلال کے ارسال کردہ مراسلہ میں تحریر ہے اور وہ جابر کو بھی منافع دیتا ہے۔ کیوں کہ جابر نے کسی دوسرے شخص سے حصص خریدے تھے اور اس کو ۱۰۳⅞ کی شرح سے رقم ادا کی تھی اور اب ۱۵ شلنگ نفع لے کر فروخت کر رہا ہے۔

اقرار نامہ کی دستاویز قانونی طور پر ضروری ہے۔ اگر ہم برطانیہ کی بجائے کسی دوسرے ملک کے اسٹاک ایکسچینج کی مثال لیتے تو ہم دیکھتے کہ اقرار نامہ میں ایک اور مد کی بھی شامل ہے اور وہ ٹکٹ اور فیس کی ہے۔ فیس بہت مختصر ہوتی ہے۔ جو کمپنیاں حصوں کے تبادلہ کے اندراج کے معاوضہ کے طور پر لیتی ہیں، مگر اسٹامپ کی اجرت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ بجز حکومت کی کفالتوں کی خریداری کے باقی تمام تبادلوں کی دستاویزات پر ریونیو ٹکٹ لگایا جاتا ہے اور جس قدر روپیہ کا لین دین ہوتا ہے۔ اسی لحاظ سے ریونیو ٹکٹ لگایا جا سکتا ہے۔

یوں تو اسٹاک ایکسچینج میں بہت سی قسموں کے تمسکات بیچے اور خریدے جاتے ہیں۔ مگر ایسا کاروبار جس میں نقصان کا احتمال نہ ہو ایک ہی ہے۔ جابرس کے دوسرے گروہ کسی نہ کسی قسم کے تمسکات کی خرید و فروخت کے ماہر ہوتے ہیں۔ مختلف قسم کی تجارتوں کے حصص کی خرید و فروخت اسٹاک ایکسچینج میں ہوتی ہے ان میں سے چند یہ ہیں۔ بنک، بٹا گھر، شراب سازی، بیمہ، اتحاد تجارہ (کئی تجارتی کمپنیوں کا متحدہ کاروبار) کان کنی، ربڑ، تیل، جہاز رانی۔ بیرونی ممالک کے تمسکات، چائے، نائٹریٹ، لوہا اور فولاد وغیرہ۔ یہ صورت حال کہ ہر قسم کے کاروبار کے حصوں کی خرید و فروخت کرنے والے متعدد جابرس ہوتے ہیں۔ اس امر کو واضح کرتی ہے کہ دلالوں کو اپنی پسند کے حصوں کو منتخب کرنے کے لیے بڑی

ں ہوتی ہے۔ اوپر کی مثال میں دلال نے پہلے ہی جابر کی پیشکش کو جس کے پاس وہ گیا تھا قبول
مگر وہ دوسرے جابر کے پاس بھی زیادہ بہتر بھاؤ حاصل کرنے کے لیے جا سکتا تھا۔

اب تک ہم نے پرانے قائم شدہ کاروبار کے حصول اور تمسکات کی خرید و فروخت کے بارے میں
لکھی ہے۔ اور اب دیکھنا یہ ہے کہ کسی کاروبار میں شرکاء کی جماعت کسی نئے کاروبار کے لیے
م کو روپیہ مہیا کرنے کے سلسلہ میں کیوں کر آمادہ کرتی ہے۔ اس سوال کا جواب بھی لندن شہر کے ایک
کاروباری مرکز سے جسے نیو ایشو مارکٹ یا نئے کاروبار کا بازار کہتے ہیں ملے گا۔

نیو ایشو مارکٹ نئے کاروبار کا بازار ایک آسان اصطلاح ہے۔ اگرچہ اس سے صحیح مفہوم
نہیں ہوتا ہے۔ یہ بازار مختلف قسم کے کاروبار پر مشتمل ہے جن کے متعلق ہم پہلے ہی تذکرہ کر چکے
ں جیسے معمولی بنک، تجارتی بنک، تمسکات کے دلال اور جابرس وغیرہ۔ ان میں ایسے کاروباری
فائز بھی شامل ہیں جو نئے کاروبار کے قیام کے سلسلہ میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ ان کو ایشوئنگ
ہاوسز" کہا جاتا ہے۔

شرکاء کی جماعت (فرم) کو جو کام سب سے پہلے کرنا ہے وہ یہ کہ نیو ایشو مارکٹ میں کسی
ایسے دفتر کو تلاش کرے جو اس کے لیے حصہ دار فراہم کرنے کی پوری پوری ذمہ داری قبول کرنے کے لیے
آمادہ رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نئے کاروبار کے قیام کے سلسلہ میں تمام کاموں میں سب سے اہم
کام جو کرنا ہوتا ہے وہ یہی ہے۔ بقیہ کام اور انتظامات نئے کاروبار کا اعلان، اس کے دستور کی تکمیل
حصوں کے خریداروں کے لیے درخواستوں کے مسودہ کی تیاری اور دوسرے تمام امور ایشوئنگ ہاؤس
میں انجام پائیں گے اور جو بھی دفتر ایشوئنگ ہاؤس یہ ذمہ داری قبول کرے گا وہ ان خدمات کا معاوضہ
لے گا۔ نئے کاروبار کے قیام کے سلسلہ میں کامیابی کا دار و مدار ایشوئنگ ہاؤس کی ساکھ پر ہوتا ہے
جو اسے سرمایہ لگانے والے حلقوں میں حاصل ہے۔ اس لیے شرکاء کی جماعت کا کام صرف یہی نہیں ہے
کہ ایشوئنگ مارکٹ میں نئے کاروبار قائم کرنے کا کام کرنے والی کسی فرم کی خدمات حاصل کرے بلکہ
اہم ترین کام یہ ہے کہ ایسے ایشوئنگ ہاؤس سے معاملے کرے اور اپنا کام اس کے سپرد کرے

ہے کہ ان لوگوں کا اعتماد حاصل ہو جو نئے کاروبار کے حصوں کی خریداری کیا کرتے ہیں اور تمسکات کی خرید و فروخت میں دلالی کرنے والوں کی طرح لوگوں کو نئے کاروبار کے حصص خریدنے پر آمادہ کر سکیں۔

آجکل یہ قاعدہ ہے کہ پچاس ہزار پونڈ سے زیادہ کی مالیت کے حصص جاری کرنے سے پہلے برطانوی خزانہ سے اجازت حاصل کی جائے۔

اب ہم نظام مالیات کے تیسرے اہم شعبہ بیمہ کا تذکرہ کرتے ہیں۔ بیمہ کا اصول دوسروں کی ذمہ داریاں قبول کرنا ہے۔ عام حالات میں یہ قطعی ممکنات میں سے نہیں ہے کہ کسی قوم کے تمام مکانات نذر آتش ہو جائیں۔ مگر یہ تو ممکن ہے کہ کسی غلطی کی بنا، پر ان میں سے چند جل جائیں۔ کوئی شخص پہلے سے تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ کونسا گھر خوش نصیب ہے اور کونسا نہیں۔ اس لیے تباہی کا خطرہ سب کے لیے یکساں ہے اگر ہر خاندان تھوڑی سی رقم مشترکہ سرمایہ میں جمع کرا دے تو ان میں سے ہر ایک نقصان سے بچنے کے لیے بیمہ کرا سکتا ہے۔ اور وہ خاندان جس کا گھر جل کر راکھ ہو جائے اس کی جگہ نیا مکان مشترکہ سرمایہ سے رقم لے کر بنا سکتا ہے۔ اس طرح بیمہ کرنا نقصان سے بچنے کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کرنا ہے یا یوں کہیے کہ بیمہ کا مطلب نقصان ہو جانے پر اس کی تلافی کرنے کی ذمہ داری قبول کرنا ہے۔ اس ذمہ داری کے قبول کرنے پر بیمہ کمپنی کو جو پریمیم ملتا ہے، اس سے وہ نقصان کو پورا کرتی ہے۔ یہاں یہ بات سمجھ لینا کافی ہے کہ کمپنی نقصان کا معاوضہ اسی صورت میں دے گی جبکہ واقعی نقصان ہوگا اور وہ معاوضہ یقیناً اس معاہدہ کے مطابق ہوگا جو ذمہ داری قبول کرتے وقت کیا جائے گا۔ اور اس لحاظ سے انشورنس (بیمہ) اور ایشورنس (تیقین دہانی) میں فرق ہوتا ہے۔ ایشورنس ایک معاہدہ ہوتا ہے جس میں یہ ذمہ داری قبول کی جاتی ہے۔ اگر فلاں قسم کا نقصان ہوا تو اس قدر معاوضہ دیا جائے گا۔ گویا نقصان کی نوعیت اور اس کے معاوضہ کی مقدار دونوں ذمہ داری قبول کرتے وقت طے کر لی جاتی ہیں۔ ان میں رد و بدل یا کمی بیشی ممکن نہیں ہے۔

غالباً برطانیہ میں انشورنس کے کام کی ابتداء بھی لومبرڈ کے رہنے والے ان ہی لوگوں نے کی تھی جن کے اقدامات اور نظام بنک کاری پر ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں۔ یہ یقینی امر ہے کہ سب سے پہلے جو بیمہ ہوا ہے وہ جہازرانی کا تھا۔ یعنی پہلے پہل جہازوں کی غرقابی یا ان کو کسی قسم کا نقصان پہنچنے کی صورت

ذمہ داری قبول کی گئی اور پھر رفتہ رفتہ یہ کاروبار ترقی کر گیا اور زندگی کا بیمہ ہونے لگا۔ تاجروں نے اپنے جہازوں کا اور سامان بردار کشتیوں کا بیمہ کرانا شروع کر دیا اور مسافر جبکہ وہ جہازوں سے سفر کرتے تھے اپنی زندگیوں کا بیمہ کرانے لگے اس طرح ایک اصطلاح ایشورنس پالیسی (ASSURANCE POLICY) پیدا ہو گئی۔

زندگی کا بیمہ کرنے والی پہلی بیمہ کمپنی برطانیہ میں ۱۷۰۶ء میں قائم ہوئی تھی۔ اور اس سے بھی پچاس سال پہلے، لندن میں زبردست آگ لگنے کے واقعہ کے بالکل بعد ہی آگ لگ جانے کی وجہ سے نقصان ہونے سے بچنے کی ذمہ داری قبول کرنے والا دفتر (فائر انشورنس آفس) قائم ہو چکا تھا۔ جس طرح لندن نذر آتش ہوا تھا، خیال کیجیے کہ اس میں پوری قوم پر کس قدر زبردست مصیبت آئی ہو گی اور وہ لوگ جو اس مصیبت کا شکار ہوئے تھے بیمہ کے فوائد سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ برطانیہ کے بیمہ کے کاروبار میں ترقی دینے میں ان دفاتر نے جو آگ لگنے سے نقصان کی تلافی کرنے کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں بہت بڑا کام کیا ہے۔ کیوں کہ انہی دفاتر نے گزشتہ صدی کے وسط میں سب سے پہلے بیرونی ممالک میں اپنے کاروبار کو قائم کر کے نقصان کی تلافی کرنے کی ذمہ داریوں کو قبول کیا تھا۔ ان دفاتر نے بیرونی ممالک میں جو مقام اور جو نیک نامی حاصل کی تھی اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہی دفاتر دراصل دوسری قسم کے بیمہ کرنے والے برطانوی ماہرین کی ایک مدت سے رہنمائی کر رہے ہیں اور اس طرح موجودہ برطانوی بیمہ کنندگان کو بیرونی ممالک میں بیمہ کے کاروبار کے لیے بڑا میدان مل گیا جس میں اب بھی دن بدن ترقی ہو رہی ہے۔

برطانیہ کی تمام بیمہ کرنے والی کمپنیوں میں غالباً سب سے زیادہ مشہور کمپنی لائڈس (LLOYD.S) ہے جو شہر لندن کے مشرقی علاقہ میں ایک وسیع عمارت میں جو لیڈن ہال اسٹریٹ میں واقع ہے اور چالیس ایکڑ زمین پر بنی ہوئی ہے، کاروبار کرتی ہے۔ لائڈس میں اور بیمہ کا کاروبار کرنے والی دوسری کمپنیوں میں فرق ہے۔ قانونی اعتبار سے لائڈس ایک کمپنی نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک انجمن ہے جو چند افراد پر مشتمل ہے۔ یہ افراد ایک مقام پر بیمہ کا کاروبار کرنے کے لیے مجتمع ہو گئے ہیں اور "پالیسی" دیتے ہیں۔ اس لفظ پالیسی کا مخزن کیا ہے اور آجکل اس سے کیا مطلب اخذ کیا جاتا ہے۔ جلد ہی آگے چل کر بیان کر دیا جائے گا۔ فی الحال یہ بتانا ضروری ہے کہ اگرچہ لائڈس کی حیثیت ایک مجلس کی سی ہے جس میں

کچھ افراد شامل ہیں۔ تاہم اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کوئی بھی شخص وہاں جاکر بیمہ کا کاروبار کرسکتا ہے
لائڈس کی مجلس کی ایک کمیٹی ہے جو ممبروں کا انتخاب کرتی ہے اور اِس ادارہ کے چلانے کے لیے
قاعدے وضوابط مرتب کرتی ہے اور صرف وہی لوگ بیمہ کا کاروبار کرسکتے ہیں جو اس کے ممبر ہیں
مختصر یہ کہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ لائڈس دو حصّوں میں منقسم ہے۔ لائڈس کی مجلس ان مسائل و معاملات
کو دیکھتی ہے جن کے متعلق عوام کے فائدہ و مفاد کے پیشِ نظر قاعدہ وضوابط بنانے کی ضرورت ہے
اور ممبران اپنے طور پر بیمہ کا کاروبار کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ لائڈس سے بیمہ نہیں
کرا سکتے کیوں کہ لائڈس کی مجلس بیمہ کی کسی دستاویز کے لیے ذمہ دار نہیں ہے۔ مگر آپ لائڈس پر بیمہ
کرا سکتے ہیں جیسا کہ لاکھوں آدمیوں نے کرا رکھا ہے۔ کیوں کہ یہاں پر بیمہ کی ذمہ داری لینے کا کام
اجتماعی نہیں ہے بلکہ انفرادی طور پر کیا جاتا ہے۔ یہاں افراد ذاتی طور پر خطرہ مول لیتے ہیں، اور صرف یہاں
بیٹھ کر اپنا کاروبار کرتے ہیں۔ اس طرح لائڈس محض ان کے کاروبار کی جگہ ہے۔

یہ فرق ابتدا میں قدرے الجھا دیتا ہے لیکن جب لائڈس کا حقیقی حال بیان کیا جاتا ہے
تو بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ سترھویں صدی کے آخری حصّہ میں ایک شخص نے جس کا نام ایڈورڈ لائڈ
تھا شہر لندن میں ایک کافی ہاؤس قائم تھا۔ جو شہر کے ان لوگوں کی بیٹھک بن گیا جو جہازوں اور جہازوں
سے سفر کرنے والوں کا بیمہ کرتے تھے۔ ایک بیمہ تیار کیا جاتا تھا جس میں بیمے سے متعلق تفصیلات و شرائط
وغیرہ لکھی جاتیں اور اگر حاضرین میں سے کوئی کسی قسم کے بیمہ کی ذمہ داری قبول کرنا چاہتا تھا تو وہ بھی
اس دستاویز پر جو اس کافی ہاؤس میں مرتب کی جاتی تھی، اپنا نام معاہدہ کے مضمون کے اختتام پر لکھ دیتا
تھا۔ اس طرح لفظ انڈر رائٹر کی ابتدا ہوئی۔ آجکل یہ لازمی نہیں ہے کہ انڈر رائٹر وہ شخص متصوّر کیا
جائے جو بیمہ کے معاہدہ کا اپنے آپ کو پابند کرتا ہے۔ اور اِس کا سبب یہ ہے کہ لائڈس کے
ممبران نے سنڈیکیٹس یا شراکت تجار (متعدد تاجروں کی شرکت جو متحدہ طور پر کاروبار کرتی ہیں) بنا رکھی ہیں
اور ہر سنڈیکیٹ میں ایک سے زیادہ لوگ شامل ہوتے ہیں۔ جو طے شدہ حصوں کے مطابق ذمہ داری قبول
کرتے ہیں۔ اس طرح اگر کسی سنڈیکیٹ میں چار افراد شامل ہیں جن میں سے ایک نے دو تہائی کی ذمہ داری

قبول کی ہے اور بقیہ تین آدمی ایک انتہائی ذمہ داری میں برابر کے شریک ہیں۔ سنڈیکیٹ کا کونسا رکن کتنی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ یہ بات سنڈیکیٹ کے ممبروں کے طے کرنے کی ہوتی ہے۔ مگر جب ایک دفعہ یہ فیصلہ ہو گیا کہ کس ممبر کی کس قدر ذمہ داری ہو گی پھر کوئی اس سے بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ خواہ سنڈیکیٹ ایک یونٹ کی حیثیت سے ذمہ داری قبول کرے۔ یا اس کے علاوہ کوئی اور صورت ہو وہ خود کاروبار میں شرکت سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ شخص جو حقیقت میں سنڈیکیٹ کی جانب سے ذمہ داریاں قبول کرتا اور خطرہ مول لیتا ہے ان میں سے ہی ایک ہو سکتا ہے جن پر سنڈیکیٹ مشتمل ہے یا کوئی اور شخص بھی ہو سکتا ہے جسے سنڈیکیٹ اپنا ایجنٹ بنائے اور وہ اس کی جانب ذمہ داریاں قبول کرنا منظور کرے۔ وہ خواہ سنڈیکیٹ کا ممبر ہو یا اس کا ایجنٹ۔ یعنی ذمہ داریاں قبول کرنے والا کہلاتا ہے۔ اگرچہ لائڈس ایک سے زیادہ جگہ منتقل ہو چکا ہے اور اب سے وہ سترھویں صدی کے کافی ہاؤس سے تبدیل ہو کر ایک عظیم کاروباری ادارہ بن چکا ہے۔ مگر اس سابقہ روایات کو جوں کا توں برقرار رکھا گیا ہے۔ مثال کے طور پر کافی ہاؤس کے الفاظ کی جگہ لائڈس کے نام کے ساتھ (ہی) ابھی تک پتہ پر لکھا جاتا ہے۔ اور جو لوگ لائڈس میں کام کرتے ہیں ان کو ویٹر کہا جاتا ہے۔ اور سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ سابقہ روایات کے مطابق اب بھی کاروبار کا وہی طریقہ ہے۔

مدرسوں میں باغبانی کے لیے یونی سیف کی امداد

جب موسم بہار اور خوش گوار دھوپ کی تازگی بخش کیفیات زمین کے مسخ چہرے کو شگفتہ کر دیتی ہیں تو بچے کھیل کود میں حصہ لینے کے لیے گھروں سے میدانوں میں نکل آتے ہیں کیوں کہ کھیل کے میدانوں کا سبزہ ان کے لیے ایک لطیف نظارہ بن جاتا ہے۔ اور وہ اس سے لطف اٹھانے کے لیے بیتاب ہو جاتے ہیں دنیا کے بہت سے ملکوں میں سال کے یہی دن ہوتے ہیں جبکہ مدرسوں میں بچوں کو زراعت و غذائیت کا کام سکھایا جاتا ہے۔ انھیں اس کام میں اقوام متحدہ کے بچوں کے فنڈ (یونی سیف) سے ہر قسم کی امداد ملتی ہے۔

دنیا کے بہت سے ترقی پذیر ملکوں میں لاکھوں بچوں کو خرابیٔ غذا کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کیونکہ

فاقہ کشی کی نوبت اس وجہ سے آتی ہے کہ لوگوں کو اشیائے خوراک کی غذائی قدروں کے بارے میں
معلومات نہیں ہوتی ہیں۔ اس لیے مدرسوں میں بہ عملی نصاب بچوں کو ایک معیشت سے بچانے اور
ع ناقفیت پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے۔

ایک توسیعی پروگرام کے بموجب جس کا منشا اس قسم کے کاموں کو فروغ دینا ہے، یونی سیف فی الحال
ہ ملکوں میں مدرسوں اور گھریلو باغیچوں کے لیے کھیتی باڑی کے آلات اور عمدہ بیج دے رہا ہے بمقصد
ہے کہ بچوں اور ماؤں کو خوراک اور اعلیٰ قدروں سے باخبر کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ دیہی گھرانوں
ں اپنی مدد آپ کرنے کا رواج پا جائے۔

اسی پروگرام کے ماتحت یونی سیف مچھلیوں، مرغیوں اور چھوٹے جانوروں کی پرورش میں بھی مدد دیتا
ہے۔ اس کے علاوہ بتایا جاتا ہے کہ گھروں میں اشیائے خوراک کے ذخیروں کو کیوں کر محفوظ رکھا جائے تاکہ
مقامی طور پر دستیاب ہونے والی اشیائے خوراک کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے۔

یونی سیف بچوں اور ماؤں کی تندرستی و فلاح و بہبود کو ترقی دینے کے لیے دنیا کا سب سے بڑا
بین الاقوامی ادارہ ہے۔ یونی سیف کا مفہوم دوسرے لفظوں میں یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ اقوام متحدہ
کی نگرانی میں بہت سے ملک انسانی دوستی کے ماتحت جمع ہوئے ہیں۔ ان کا مقصد ان بیماریوں
کو جڑ سے اکھاڑنا یا ان کی روک تھام کرنا ہے جو بچوں کو بری طرح لاحق ہوتی ہیں۔ ان قوموں کا عقیدہ
ہے کہ ایک بیمار شہری نہ تو اپنے خاندان کے لیے مفید ہو سکتا ہے اور نہ اپنے ملک یا ساری دنیا کے لیے
کارآمد ہو سکتا ہے۔

یونی سیف سامان کی فراہمی کا ادارہ ہے۔ دوائیں، ٹرک، موٹریں، دوا چھڑکنے کے آلات، پچکاریاں
دوائیوں کے سامان کے تھیلے، فالتو غذا۔ مثلاً دودھ یا مچھلی کا تیل اور فی الحقیقت وہ سب چیزیں جو ایک
پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کسی ملک میں درآمد کرنی ضروری ہوں، یونی سیف بہم پہنچاتا ہے۔
علاوہ ازیں یونی سیف عموماً عالمی ادارۂ صحت کے تعاون سے لاکھوں بچوں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔
اب ہر سال مزید دو کروڑ بچوں کو اس سے فائدہ پہنچ رہا ہے۔

المی صحت کی اسمبلی کا تیرھواں اجلاس

عالمی صحت کی اسمبلی کے تیرھویں اجلاس نے، جو پچھلے مہینے جنیوا میں نیوزی لینڈ کے ڈاکٹر ہیرلڈ
بوٹ کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ عالمی ادارۂ صحت کے ڈائرکٹر جنرل سے درخواست کی ہے کہ وہ ادارے
کی طرف سے عرب ملکوں کی لیگ سے بات چیت کریں اور صحت کے میدان میں دائرۂ تعاون کی توضیح کے
لیے معاہدہ کرلیں۔

عالمی ادارۂ صحت کے ایک سو ایک ممبروں اور ایسوشی ایٹ ممبروں میں سے ۹۶ نے، جن میں
مشرقی بحیرۂ روم کے خطے کے ۱۶ ملک اور علاقے شامل ہیں۔ عالمی صحت کی اسمبلی کے اس تیرھویں اجلاس
میں حصہ لیا۔ اس اجلاس نے کویت، جمہوریت کیمبرون اور ٹوگو لینڈ کو ادارے کا مکمل رکن اور تبرص اور
مات دوسرے افریقی ملکوں کو ایسوشی ایٹ اراکین کی حیثیت سے ادارے میں داخل کیا۔

عالمی صحت کی اسمبلی نے اگلے سال کا لائحہ عمل اور تمام کاموں کے لیے ایک کروڑ ۹۸ لاکھ ۷۵ ہزار
۱ سو ۴ ۵ ڈالر کا بجٹ منظور کیا۔ ادارے کے ڈائرکٹر جنرل کی تجویز کے مطابق بجٹ کی رقم ایک کروڑ
۹۵ لاکھ ۹۲ ہزار ۶ سو ۷۰ ڈالر تھی۔ اسمبلی کے اجلاس کے دوران میں کچھ اضافے کیے گئے۔ اس لیے رقم بڑھ گئی
اضافی رقم میں دو لاکھ ڈالر نئے ممبروں اور ایسوشی ایٹ ممبروں کی مالی امداد کے لیے شامل ہیں نئے
بجٹ میں سب سے بڑی واحد شق چھوت کی بیماریوں کے استیصال سے متعلق ہے۔ ملیریا کے استیصال سے متعلق
اس مد کی رقم محسوب نہیں کی گئی۔ اس میں رضاکارانہ چندے جمع ہوتے ہیں اور استیصال ملیریا کے عالمگیر پروگرام
پر صرف کیے جاتے ہیں۔ اس اجلاس میں جن موضوعات پر خاص توجہ دی گئی۔ ان میں سے قابل ذکر حسب ذیل ہیں:
ملیریا کا استیصال۔ چیچک کا استیصال۔ تابکاری کے اثرات۔ عالمی ادارۂ صحت اور تخفیف اسلحہ

۱۳ شمارہ ۲] لاہور [جو

اس شمارہ میں

ادارہ تحریر { پروفیسر سراج الدین
پروفیسر میاں نامدار خاں

معاونین { عبدالغفور
فضل احمد
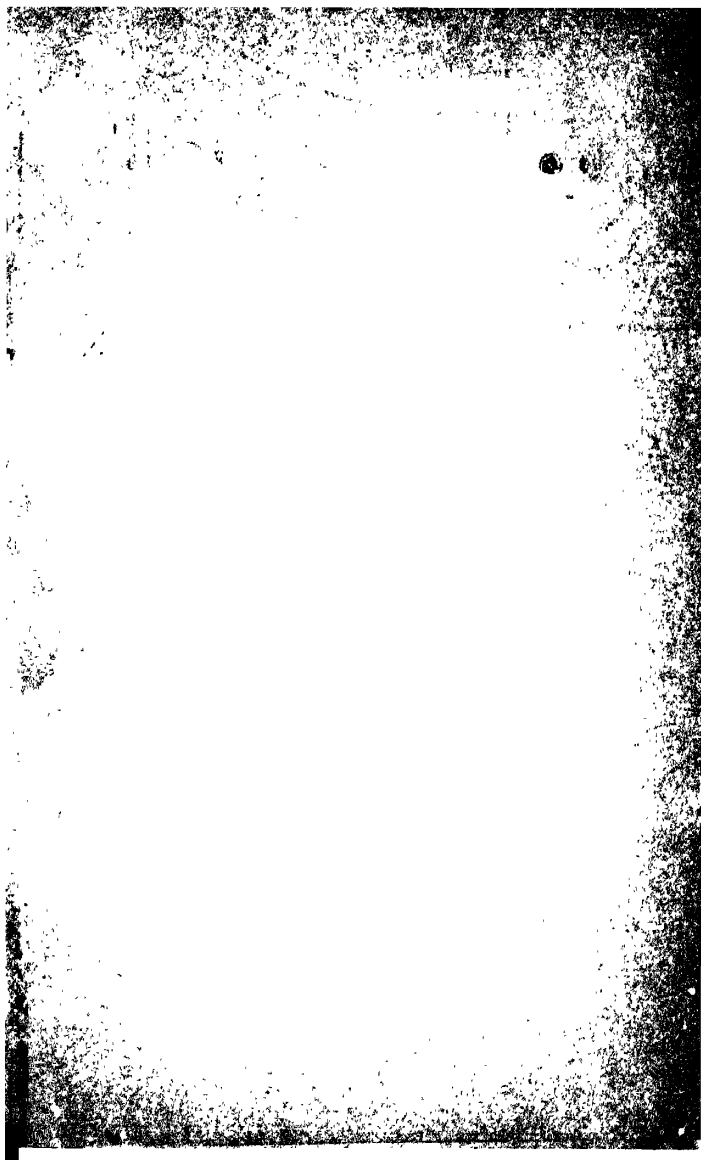
لاہور
جولائی سنہ ۱۹۶۰ء
جلد ۱۳
شمارہ ۴
سالانہ چندہ
پاکستان کے لیے ۶ روپے
غیر ممالک کے لیے ۸ روپے
قیمت فی پرچہ دس آنے
پبلشرز
یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

دوسرا پانچ سالہ منصوبہ

میاں نامدار خاں

موجودہ حکومت نے ملک کی ہمہ جہتی ترقی کے لیے جو سرگرم مہم جاری کر رکھی ہے اس سے ٹھوس اور مستقل نتائج حاصل کرنے کے لیے صدر پاکستان نے ۱۱ جون کی شام کو ایک جامع منصوبہ قوم کے سامنے پیش کیا منصوبے کی تکمیل پر کل انیس سو کروڑ روپیہ صرف ہوگا اور اس کے پایۂ تکمیل کو پہنچنے تک قومی آمدنی میں بیس فی صد اضافہ ہو جائے گا۔

یہ ہمارا دوسرا پانچ سالہ منصوبہ ہے۔ ایک پانچ سالہ منصوبہ اس سے پہلے بھی تیار کیا گیا تھا جس کی مدت پوری ہو چکی ہے مگر جس کے سارے مقاصد پورے نہیں ہو سکے۔ پہلا منصوبہ صرف صنعتی ترقی کے میدان میں ہی اپنا مقررہ نصب العین حاصل کر سکا۔ دوسرے میدانوں اور بالخصوص زراعت اور تعلیم کے میدانوں میں یہ کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس منصوبے کو اول سے ہی نیم دلی کے ساتھ چلایا گیا۔ تاہم اس سے اتنا ضرور ہوا کہ ملک کو اپنے انسانی اور مادی وسائل سے منظم طور پر کام لینے کا تجربہ حاصل ہو گیا۔

قوم کے سامنے دوسرا پانچ سالہ منصوبہ پیش کرتے ہوئے صدر پاکستان نے اپنی نشری تقریر میں کہا۔
پاکستان کے لوگو: میں آپ سے اس لیے خطاب کر رہا ہوں کہ ملک کا مستقبل تعمیر کرنے کے عظیم کام میں آپ کا دلی تعاون حاصل کروں منصوبے کو کامیابی سے پروان چڑھانے کی ذمہ داری آپ کے کندھوں پر ہے آپ کو چاہیے کہ اس ذمہ داری کو پُر عزم جوش کے ساتھ انجام دیں۔ آؤ آج ہم مل کر عہد کریں کہ ہم اپنے اپنے حلقہ ہائے عمل میں اس بات کی ہر امکانی کوشش کریں گے کہ پاکستان اقوام عالم میں محترم مقام حاصل کر کے رہے گا۔

اس منصوبے کے بڑے بڑے مقاصد آپ کو اچھی طرح معلوم ہیں، جیسا میں نے ایک سال پہلے

اپنے خطاب میں کہا تھا پاکستان جیسے ملک میں ہمارا کم از کم نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ ہم میں سے ہر ایک کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانے کو ملے۔ تا کہ یہ ضروریات پیدا کرنے کے لیے کافی کپڑا میسر ہو اور سر چھپانے کے لیے معقول قسم کی جائے پناہ موجود ہو۔ منصوبے کا مقصد لوگوں کی بہبود میں اضافہ کرنا اور ان کے معیار زندگی کو بلند کرنا ہے"۔

تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے صدر پاکستان نے فرمایا :۔

"بہتر تعلیم اور بہتر صحت ہماری قوم کی دو بنیادی ضرورتیں ہیں۔ ملک میں ناخواندگی کی جو شرح موجود ہے وہ ہم سب کے لیے تشویش کا باعث ہے۔ یہ مسئلہ جس قدر اہم ہے اسی قدر اس کا فوری حل مشکل ہے کیونکہ اس کی وسعت بے پناہ ہے۔ اگرچہ ناخواندگی کا مطلب جہالت نہیں تاہم اگر ملک اپنے وسیع انسانی وسائل سے بہترین خدمت لینا چاہتا ہے تو ناخواندگی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ضروری ہے۔ منصوبے کے خاتمے تک قابل تعلیم بچوں میں سے ساٹھ فی صد ابتدائی مدرسوں میں پڑھ رہے ہوں گے اس کے بعد ابتدائی تعلیم اس سے بھی زیادہ تیز رفتار سے پھیلے گی۔ تعلیمی نظام کو من حیث الکل تمام درجوں پر مضبوط بنایا جائے گا اور از سر نو منظم کیا جائے گا۔ ٹیکنیکل تعلیم کی حوصلہ افزائی خصوصیت کے ساتھ ہو گی۔ چھ نئی یونیورسٹیاں قائم کی جائیں گی۔ ان میں سے چار ٹیکنیکل تعلیم کے مخصوص ہوں گی"۔

صدر پاکستان نے دوسرے پانچ سالہ منصوبے کے جو بڑے بڑے مقاصد بیان کیے ہیں اور منصوبے کی تکمیل میں تعلیم کے کردار کی جو وضاحت کی ہے ان دونوں پر ایک ساتھ نگاہ ڈالنے کے بعد کسی کے دل میں یہ شک نہیں رہنا چاہیے کہ منصوبہ عوامی بہبود میں جو اضافہ کرنا چاہتا ہے اس کے حصول کا بڑا ذریعہ تعلیم ہی ہو گی۔ یہ چیز ہمارے تعلیمی اداروں کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز بھی ہے اور ایک بھاری ذمہ داری بھی۔ تاریخ نے پاکستان کے چھوٹے بڑے تعلیمی اداروں کو جو اہم کردار عطا کیا ہے اسے محنت دیانت اور سرگرم جذبے کے ساتھ ادا کرنا آج ہم سب کا ایک مقدس قومی فرض ہے۔

افریقی طلبہ کی کانفرنس

فضل احمد

طلبہ کا آٹھواں بین الاقوامی اجتماع

موجودہ صدی بین الاقوامیت کا زمانہ ہے۔ تیز رفتار ذرائع آمد و رفت نے فاصلے کو بڑی حد تک ختم کر کے کرۂ ارض کے مختلف حصوں کو قریبی پڑوسیوں کا درجہ دیا ہے۔ جیٹ طیاروں کی آمد نے اب یہ ممکن بنا دیا ہے کہ آپ ناشتہ نیویارک میں کریں اور دوپہر کا کھانا پیرس آکر کھائیں۔ سائنس کی اس برق رفتار ترقی نے ان ملکوں اور قوموں کو جو صدیوں سے الگ تھلگ سکون کی نیند سوتی آرہی تھیں یک دم صنعتی تہذیب کے پُرہجوم چوراہے میں لا کھڑا کیا ہے۔ تاریخ کی اس ستم ظریفی نے ان لوگوں کو عجیب و غریب مسائل سے دوچار کیا ہے۔ ان میں سے سب سے بڑا مسئلہ وہ ناقابلِ عبور خلیج ہے جو بیسویں صدی کی صنعتی تہذیب اور ان کی فرسودہ معیشت کے درمیان حائل ہے۔

اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ پسماندہ اور کم ترقی یافتہ لوگوں کے پڑھے لکھے لوگ اپنے مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنے لگے ہیں۔ مغربی تہذیب کی چمک دمک سے سراسیمہ ہونے کی بجائے صاحبِ بصیرت لوگ اس تہذیب کے طفیل پیدا ہونے والے مسائل کا جائزہ لینے لگے ہیں۔ قدرتی طور پر یہ کام وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جنہوں نے جدید علوم و فنون سے حصہ حاصل کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایشیائی اور افریقی ملکوں میں طلبہ بیداری کی تحریک میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ یہ کوئی اتفاقی امر نہیں کہ ترکیہ میں یونیورسٹی طلبہ حکومت کا تختہ الٹنے کا ذریعہ بنے یا جاپانی طلبہ نے وزیرِاعظم کشی کی حکومت کو اپنے مطالبے کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیا۔

براعظم افریقہ میں بیداری اور آزادی کی لہر شب تاریک سے اٹھی ہے۔ مگر اس کا ریلا اتنی تیزی سے زور پکڑ رہا ہے کہ دیکھنے والوں کو اپنی آنکھوں پر دھوکہ ہوتا ہے۔ تاہم یہ ایک خوش گوار حقیقت ہے

کہ افریقہ کے اندھیرے جنگلوں میں بسنے والے نیم وحشی قبیلے بھی آج یہ خواب دیکھ رہے ہیں کہ ایک ہی چھلانگ میں دور وحشت سے موجودہ صدی کی مہذب زندگی میں پہنچ جائیں۔ ان لوگوں کے دلوں میں یہ تڑپ پیدا کرنے میں افریقی طلبہ کا بڑا ہاتھ ہے۔

موجودہ زمانے کی دوسری تحریکوں کی طرح طلبہ کی تحریک نے بھی بین الاقوامی تشکل اختیار کر رکھی ہے۔ آزاد دنیا کے تقریباً ہر ملک میں طلبہ کی قومی انجمنیں موجود ہیں۔ ان قومی انجمنوں کو ۱۹۵۰ء میں طلبہ کی بین الاقوامی کانفرنس کے تحت منظم کیا گیا۔ اس سال دسمبر کے مہینے میں سٹاک ہوم کے مقام پر اس کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ اس کے بعد دنیا کے مختلف مقامات پر طلبہ کی اس بین الاقوامی تنظیم کے سات اور اجلاس ہو چکے ہیں۔ بین الاقوامی سٹوڈنٹ کانفرنس کا آٹھواں اجلاس فروری ۱۹۵۹ء میں پیرو (جنوبی امریکہ) میں ہوا۔ اس میں شرکت کرنے والے افریقی نمائندوں نے زور دیا کہ افریقی طلبہ جن مخصوص مسائل سے دوچار ہیں ان کے مطالعہ کے لیے ایک خاص مجلس مذاکرہ قائم کی جائے۔ کانفرنس نے اس مطالبے پر ہمدردی سے غور کیا۔ نتیجہ اس مجلس مذاکرہ کی شکل میں نکلا جو حبشہ کے صدر مقام عدیس ابابا میں ۱۱ جنوری ۱۹۶۰ء سے ۸ فروری ۱۹۶۰ء تک منعقد رہی۔

دس ملکوں کے نمائندے

اس مجلس مذاکرہ میں مشرقی، مغربی اور وسطی افریقہ کے دس ملکوں نے شرکت کی۔ ان کے نام یہ ہیں:
بلجین کانگو۔ مشرقی افریقہ۔ حبشہ۔ فرانسیسی مغربی افریقہ۔ غنا۔ لائبیریا۔ نائجیریا۔ روڈیشیا۔ نیاسالینڈ۔ سرالیون۔ سوڈان۔

نمائندگی کی صورت یہ تھی کہ ہر ملک کی قومی یونین تین نمائندے بھیجے۔ بعض ملکوں سے تین کی بجائے کم نمائندے آسکے۔ تاہم ان اس ملکوں کے نمائندے موجود تھے۔ عدیس ابابا یونیورسٹی کالج کے طلبہ کو یہ خاص رعایت حاصل تھی کہ مجلس مذاکرہ کے ہر اجلاس میں شرکت کریں۔

مجلس منتظمہ کی منظوری سے شمالی افریقہ کی جمعیتہ طلبہ کے نمائندے جناب مہو کو اجازت دی گئی کہ وہ کانفرنس سے خطاب کریں۔ انھوں نے اپنی ولولہ انگیز تقریر میں الجیریا کی صورت حال پر

مفصل روشنی ڈالی۔

مذاکرات اور ان کے نتائج

مذاکرات کا عام طریق کار یہ تھا کہ کوئی ممتاز عالم صبح کے اجلاس میں افریقی زندگی کے کسی خاص پہلو پر تقریر کرتا۔ اس تقریر پر سوالات ہوتے۔ بعد میں شرکا چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں بٹ کر اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لیتے اور ان کے متعلق نتائج اخذ کرتے۔ اگلے دن یہ نتائج پورے اجلاس کے سامنے پیش ہوتے اور منظور یا نامنظور کر دیے جاتے۔

یہاں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ مجلس مذاکرہ نے اپنے مباحث کو خالص تعلیمی مسائل تک محدود نہیں رکھا۔ یہ بات پہلے سے طے کر لی گئی تھی کہ کسی ملک کے تعلیمی مسائل اس کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کی پیداوار ہوا کرتے ہیں اور جب تک سیاسی اور معاشرتی حالات میں تبدیلی نہ ہو اس وقت تک تعلیم میں کوئی قابل ذکر اصلاح نہیں ہو سکتی۔

اس بنیادی مفروضے کی بنا پر شرکا نے پہلی توجہ افریقہ کی سیاسی زندگی کو دی۔ پھر اس سے پیدا ہونے والے معاشی مسائل پر غور کیا گیا۔ پھر سماجی زندگی زیر بحث آئی۔ پھر مذہبی زندگی۔ ان تمام مسائل کا جائزہ لینے کے بعد تعلیمی مسائل زیر بحث آئے اور سب سے آخر میں افریقی ثقافت پر بحث ہوئی۔ ان تمام مسائل پر بڑی آزادی سے بات چیت ہوئی۔ اور طلبہ نے ان میں سے ہر مسئلہ کے متعلق اپنی جچی تلی رائے واضح الفاظ میں ظاہر کی۔ مجلس مذاکرہ مختلف مسائل کے متعلق متفقہ طور پر جن نتائج پر پہنچی ان کا خلاصہ نیچے درج ہے۔

سیاسی حالات

افریقہ کے بڑے حصے میں آج بھی سامراج اور نوآبادیاتی نظام کا دور دورہ ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ صورت حال بیسویں صدی کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ سامراجی اور نوآبادیاتی نظام غالب قوم کا معاشی مفاد، اس کے سیاسی عزائم اور اس کی بین الاقوامی ساکھ کو تقویت دیتا ہے۔ ہم سامراجی اور نوآبادیاتی نظام کی پرزور مذمت کرتے ہیں۔ کیوں کہ یہ مغلوب قوم کی راہ میں

ایک ناقابلِ عبور دیوار بن کر حائل ہے۔ اس سے جو بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں ان میں سے زیادہ نمایاں یہ ہیں :-

(۱) افریقی مزدوروں کو اتنی تھوڑی اجرت ملتی ہے کہ وہ نانِ شبینہ کی زندگی پر مجبور رہیں۔ یہ اس لیے ہو رہا ہے کہ غالب قوم دولت سے ہاتھ رنگے۔

(۲) افریقہ کے قدرتی وسائل غالب قوم کے ہاتھوں میں سونپے جا رہے ہیں۔ تاکہ اس کے افراد سہولت اور فراوانی کی زندگی گذاریں۔ مگر اس کا خمیازہ اہلِ افریقہ کو بھگتنا پڑتا ہے۔

(۳) قدرتی انسانی حقوق کی نفی یا خلاف ورزی کی جا رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اہلِ افریقہ اقوامِ متحدہ کے منشور میں ذکر کیے گئے حقِ خود ارادیت سے محروم ہیں۔

(۴) افریقی عوام کو اَن پڑھ رکھا جا رہا ہے اور ان کی زبانوں اور ثقافتوں کو تباہ کیا جا رہا ہے

(۵) نسل پرستی اور سفید قوموں کی برتری کے افسانے کو اچھالا جا رہا ہے۔

(۶) افریقہ میں غیر قدرتی حد بندیاں قائم کر کے اہلِ افریقہ میں تفریق پیدا کی جا رہی ہے۔

مندرجہ بالا شکایات کی روشنی میں ہم مندرجہ ذیل مسائل پر اپنی رائے اس طرح ظاہر کرتے ہیں

الجیریا

ہم غیر مشروط طور پر اہلِ الجیریا کی حمایت کرتے ہیں جو پچھلے چھ برس سے فرانسیسی ظلم کے خلاف بہادری سے لڑ رہے ہیں۔ تاکہ نوآبادیاتی نظام کی جگہ آزاد الجیریا وجود میں آئے۔ فرانس اب تک کوئی دس لاکھ الجزائری مجاہدوں کو ذبح کر چکا ہے۔ لہٰذا وہ نسلِ انسانی کے ختم کرنے کے جرم کا مرتکب ہوا ہے۔ فرانسیسی فوج الجزائری قوم کو دبانے کے لیے سفاکانہ اور غیر انسانی طریقوں سے کام لے رہی ہے۔ تاہم ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہے کہ الجزائری قوم کا جذبۂ آزادی ناقابلِ شکست ہے۔

ہم فرانسیسی مظالم کی پُرزور مذمت کرتے ہیں اور فرانسیسی حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ الجزائر کی عارضی حکومت سے فوراً بات چیت شروع کرے۔ بات چیت کا مقصد الجزائر کی مکمل آزادی تسلیم کرنے کے سوا اور کچھ نہ ہونا چاہیے۔

بلجین کانگو

اہل بلجیم نے کانگو کے لوگوں کی سیاسی ترقی کا راستہ جس طرح روک رکھا ہے اور جس نے افریقی رہنماؤں کو گرفتار کر کے اور قبائل میں پھوٹ پیدا کر کے جس طرح فتنہ فساد برپا کیا ہے۔ اس سے قطع نظر ہم بلجیم کے اس اعلان کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ جون ۱۹۶۰ء سے کانگو آزاد ہو جائے گا۔ ہم کانگو کے رہنماؤں کو اس کارنامے پر مبارک باد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آزادی کی بات چیت کامیابی سے انجام پائے گی اور کانگو آزاد افریقی قوموں کے روز افزوں گروہ میں شامل ہوگا۔

برطانوی مقبوضات

وسطی افریقہ کے برطانوی مقبوضات اور بالخصوص روڈیشیا اور نیاسالینڈ کی فیڈریشن کے متعلق کانفرنس کو یہ معلوم کر کے بڑی تشویش ہوئی ہے کہ :-

۱۔ سفید اقلیت کو دولت اور تعلیم کا اجارہ دینے کے لیے جمہوری اصولوں کو بے شرمی سے نظر انداز کیا گیا ہے۔ اور انتخابی قوانین میں جائداد اور تعلیم کی شرائط داخل کر کے افریقی عوام کو بے آواز بنا دیا گیا ہے۔

۲۔ افریقی عوام کو معاشی طور پر بے بس رکھنے کے لیے اجرتوں کی دو شرحیں مقرر کی گئی ہیں۔ گوروں کے لیے بلند شرح اور کالوں کے لیے فاقہ مستی کی شرح۔

۳۔ نظامِ تعلیم کو مختلف شاخوں میں اس لیے بانٹا گیا ہے کہ افریقی عوام کو سیاسی، معاشی اور تعلیمی طور پر پسماندہ رکھا جائے۔

۴۔ برطانیہ کے نوآبادیاتی دفتر نے مٹھی بھر گوروں کو حقِ رائے دہی کا اجارہ عطا کر کے یہ کوشش کی ہے تاکہ افریقی عوام کو مستقل طور پر گوروں کی لوٹ کھسوٹ کا نشانہ بنایا جائے۔

۵۔ گوری اقلیت کو آباد کرنے کے لیے برطانیہ کے دفتر نوآبادیات نے جس سینہ زوری سے افریقی عوام کو ان کی آدھی سے زیادہ زمینوں سے محروم کر دیا ہے وہ برطانیہ کی نوآبادیاتی تاریخ کے تاریک ترین اوراق میں سے ہے۔

۴ - نیاسالینڈ کے افریقی عوام روڈیشیا کے ساتھ فیڈریشن قائم کرنے کے حق میں نہیں۔ اسی طرح خود روڈیشیا کے کئی حصے اس فیڈریشن کے خلاف ہیں۔ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ نیاسالینڈ اور روڈیشیا میں آزاد رائے شماری کرائی جائے اور ان دونوں ریاستوں میں سے کسی کو بھی اس کے لوگوں کی مرضی کے خلاف فیڈریشن میں نہ رکھا جائے۔

ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ نیاسالینڈ اور روڈیشیا میں جمہوری اصولوں کا احترام کیا جائے۔ وہاں کے عوام کو بلاتفریق ووٹ کا حق حاصل ہو اور زمینوں کی ملکیت کے معاملے میں گوروں اور کالوں کو ایک سے حقوق حاصل ہوں۔

ہم ان گورے طلبہ اور دوسرے گورے افراد کی کوششوں کو سراہتے ہیں جو دونوں نسلوں کے تعلقات حق و انصاف پر قائم کرنا چاہتے ہیں۔

جنوبی افریقہ

یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ جنوبی افریقہ میں نوآبادیاتی نظام اپنی بدترین شکل اختیار کر چکا ہے کیونکہ

۱ - اس ملک میں نسلی علیحدگی کے نام پر گوری قوم کی برتری کے افسانے کو بزور شمشیر لوگوں پر مسلط کیا جا رہا ہے۔

۲ - اس ملک میں گوری اقلیت کی ایک لا خدا حکومت نام نہاد حاکمیت کے نام پر اقتدار پر قبضہ جمائے ہوئے ہے اور افریقیوں کو ان کے پیدائشی حق سے محروم کیے ہوئے ہے۔

۳ - اس ملک نے جنوب مغربی افریقہ کے علاقے پر سیاسی طور پر ناجائز قبضہ جما کر اس کے باشندوں کو غلام بنا رکھا ہے اور بڑی ڈھٹائی سے یہ علاقہ اقوام متحدہ کی تولیت میں دینے سے انکار کیا ہے۔

لہٰذا ہم اس بزدلانہ طرز عمل کی مذمت کرتے ہیں جو مغربی طاقتوں نے جنوبی افریقہ کی صورت حال کے متعلق اختیار کر رکھا ہے۔ جنوبی افریقہ دولت مشترکہ کا ایک رکن ہے۔ اس طرح دولت مشترکہ کے بلند مقاصد بھی محض ایک ڈھونگ بن کر رہ گئے ہیں۔

ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ جنوبی افریقہ کی حکومت کو اپنے رویے میں بنیادی تبدیلی کرنے کی فوری ہدایت کی جائے اور یہ ہدایت ایسی زبان میں کی جائے جو وہ سمجھ سکے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو افریقہ کی آزاد حکومتیں

جنوبی افریقہ کے باشندوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنتے چپ چاپ نہیں دیکھیں گی۔ وہ اس ظلم کے خلاف کوئی نہ کوئی قدم اٹھائیں گی جو ممکن ہے دولت مشترکہ سے قطع تعلق کی صورت اختیار کرے۔

جنوبی افریقہ کی حکومت نے دنیا کی رائے عامہ کو جس طرح بیدار کیا ہے اور اس نے اقوام متحدہ کی قرار داد کو جس حقارت سے نظر انداز کیا ہے، اسے دیکھتے ہوئے ہم جنوبی افریقہ کے مال کے بائیکاٹ کی تحریک کی تائید کرتے ہیں۔

پرتگیزی مقبوضات

کانفرنس نے اس امر پر افسوس ظاہر کیا کہ پرتگیزی حاکموں نے اپنے افریقی مقبوضات یعنی موزنبیق انگولا وغیرہ پر اپنے سنسر کی گرفت اتنی مضبوط بنا رکھی ہے کہ ان علاقوں کے متعلق درست معلومات بہت کم حاصل ہوتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے یہ علاقے دنیا کی رائے عامہ سے کٹ کر رہ گئے ہیں۔ تاہم معتبر ذرائع سے پرتگیزی افریقہ کے متعلق جو حالات معلوم ہو سکے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ:-

۱۔ بیگار کا عام رواج ہے جس کے عوض میں یا تو سرے سے کوئی اُجرت دی نہیں جاتی اور اگر دی جاتی ہے تو بہت کم۔

۲۔ پرتگیزی حکمران مزدوروں کی تجارت کرتے ہیں۔ وہ جنوبی افریقہ کی حکومت کے ساتھ مل کر ان سے جنوبی افریقہ کی سونے اور ہیروں کی کانوں میں کام لیتے ہیں۔

۳۔ اہل افریقہ کے سیاسی شعور کو دبانے کے لیے طرح طرح کے مظالم سے کام لیا جا رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان علاقوں میں کوئی سیاسی تحریک موجود نہیں۔

۴۔ نظام تعلیم صرف ابتدائی درجے پر ختم ہو جاتا ہے۔ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی سرے سے کوئی قابل اعتماد سہولتیں موجود نہیں۔

پرتگال نے جس آمرانہ انداز میں اپنے افریقی علاقوں کا گلا گھونٹ رکھا ہے ہم اس کی کھلے الفاظ میں مذمت کرتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ یہ رویہ فوراً ختم کیا جائے۔ ہم افریقہ کی آزاد حکومتوں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ان علاقوں کی زبوں حالی کی طرف فوری توجہ دیں۔

فرانسیسی افریقہ

مغربی اور استوائی افریقہ میں جو فرانسیسی مقبوضات ہیں ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہاں پر سامراجی اور نوآبادیاتی نظام کا زور ٹوٹ رہا ہے۔ ہند چینی اور الجزائر کے لوگوں کے جہاد آزادی، افریقی عوام کی تحریک آزادی اور گنی کی آزادی نے مل کر فرانسیسی سامراج کی کمر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے توڑ دی ہے۔ اس کے نتیجہ میں فرانسیسی حاکم افریقی عوام کے حق خود ارادیت کو دن بدن تسلیم کیے جا رہے ہیں۔ اس سے سماجی تناؤ بھی گھٹ رہا ہے تاہم ابھی نوآبادیاتی نظام کے گھناؤنے اثرات — معاشرتی اونچ نیچ، ہمہ گیر ناخواندگی، مقامی رقابتیں وغیرہ باقی ہیں۔

ہم اس صورت حال پر افسوس ظاہر کرتے ہیں اور ان علاقوں کی آزادی پسند قوتوں اور وہاں کے طلبہ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ جہاد آزادی کو اس وقت تک جاری رکھیں جب تک افریقی عوام کی حاکمیت پوری طرح تسلیم کر لی جائے اور پامال شدہ افریقی قدریں اور افریقی شخصیت پھر سے زندگی حاصل کر لے۔

کنیا

کنیا کی صورت حال کے موجودہ پہلو ہمارے لیے خصوصی تشویش کا باعث ہیں:-

۱۔ افریقی باشندے ہماری اکثریت میں ہونے کے باوجود ملک کی حکومت میں کوئی حصہ نہیں رکھتے

۲۔ ضروری قابلیت اور تعلیم رکھنے کے باوجود انھیں اعلیٰ سول ملازمتوں میں کوئی حصہ نہیں دیا جاتا۔

۳۔ کیکویو قبیلے کی زمینوں کا مسئلہ ایک مدت سے جھگڑے کا باعث بنا آتا ہے۔ اس معاملے میں اہل افریقہ کے حقوق پامال کیے جا رہے ہیں۔

لہذا ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ اہل افریقہ کو مکمل جمہوری حقوق دیے جائیں۔ اعلیٰ ملازمتوں اور حصول زمین کے بارے میں انھیں برابر کے حقوق حاصل ہوں۔ ان کے رہنما قید سے آزاد کیے جائیں اور اہل کنیا کی جائز خواہشات پوری کی جائیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ہمیں یقین ہے کہ کنیا میں حالات بگڑ جائیں گے۔

یوگنڈا

ہمیں یہ دیکھ کر دکھ ہوا ہے کہ اندرونی اختلافات نے یوگنڈا کی آزادی کو التوا میں ڈال رکھا ہے۔

ہماری رائے ہے کہ افریقی باشندوں کے تمام گروہوں کو چاہیے کہ باہمی جھگڑے بھول کر ملکی اور قومی مفاد کے لیے مل کر کام کریں۔ کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوا تو آزادی کی منزل اور دور جا پڑے گی۔ ہمارے خیال میں یہ بہتر ہوگا کہ قبائلی حکمرانوں کے نظام کو جدید جمہوری شکل دے دی جائے۔

ٹانگا نیکا

یہ امر بڑی طمانیت کا باعث ہے کہ ٹانگانیکا میں سیاسی بیداری کی تحریک مستقبل قریب میں آزادی حاصل کرنے کے قابل ہو جائے گی۔ لیکن اس آزادی کو محفوظ بنانے کے لیے ملک کا معاشی استحکام ایک ضروری شرط ہے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے معاشی نظام میں انقلابی تبدیلیاں کرنا پڑیں گی۔

باسوٹولینڈ

باسوٹولینڈ کی سیاسی تحریک نے افریقی باشندوں کو جو خود مختاری عطا کی ہے ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں کیوں کہ یہ چیز جنوبی افریقہ کی عام صورت حال کی ضد ہے۔ ہم نے اس بات کا دل چسپی سے مطالعہ کیا ہے کہ باسوٹولینڈ، بیچوآنالینڈ اور سوازی لینڈ کے معاملے میں برطانوی حکومت اپنی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کی کوشش کر رہی ہے کہ وہ ان علاقوں کو ان کے افریقی باشندوں کی مرضی کے خلاف جنوبی افریقہ کے حوالے نہیں کرے گی۔ جنوبی افریقہ ان علاقوں کو ہڑپ کرنے کے لیے جو ہاتھ پاؤں مار رہا ہے ہم اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور افریقیوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف جنوبی افریقہ کے اداروں سے خبردار رہیں بلکہ اپنے گھریلو معاملات ایسی خوبی سے انجام دیں کہ ان کی مثال دوسری افریقی قوموں کی حوصلہ افزائی کرے۔

عام اپیل

۱۔ اوپر دیے گئے واقعات کی روشنی میں ہم دنیا بھر کے انسانوں کی ضمیر سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ سامراج اور نوآبادیاتی نظام سے پیدا ہونے والی برائیوں کی مذمت کرے۔

۲۔ ہم دنیا بھر کی قوموں سے اپیل کرتے ہیں کہ سامراج اور نوآبادیاتی نظام کی مذمت کرنے میں وہ افریقی عوام کی تائید کریں۔ انھیں انسانی حقوق، جمہوری آزادی اور حق خود ارادیت حاصل

کرنے میں مدد دیں۔

۳۔ ہم افریقہ اور ایشیا کی آزاد قوموں سے اپیل کرتے ہیں۔ اقوام متحدہ میں انھوں نے اہل افریقہ کی آزادی کے لیے جو مہم جاری کر رکھی ہے اسے تیز تر کر دیں۔ نیز وہ محکوم افریقی علاقوں کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے اپنے کمیشن بھیجیں تاکہ دنیا کو سامراج اور نوآبادیاتی نظام سے پیدا ہونیوالی برائیوں سے اچھی طرح آگاہ کیا جا سکے۔ اور اس طرح اقوام متحدہ کے توسط سے اہل افریقہ کی آزادی کو قریب تر لایا جا سکے۔

بین الافریقیت

دوسری عالمی جنگ براعظم افریقہ کی تاریخ میں بلند ترین سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ اس جنگ نے صدیوں سے سوئے افریقی عوام کو سختی سے جھنجوڑ کر ان میں یہ کبھی نہ مٹنے والا احساس پیدا کر دیا کہ وہ مظلوم اور نوآبادیاتی لوٹ کھسوٹ کے شکار لوگ ہیں۔

اس وقت سے افریقی عوام سیاسی اور معاشی غلامی کی زنجیریں توڑنے میں ایسی سرگرمی سے لگے ہیں جس کا اظہار پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ اس جدوجہد نے افریقہ کی کالی آبادی کے دلوں میں اخوت کے ایک مضبوط جذبے کو جنم دیا ہے، جو آج افریقی قوم پرستی اور بین الافریقیت کے رنگ میں جلوہ گر ہے۔ آج تاریک براعظم کے کالے باشندے ایک متحد اور آزاد افریقہ تعمیر کرنے کے درپے ہیں۔ افریقہ کے طول و عرض میں استعماری طاقتوں کے خلاف جگہ جگہ جو جنگیں جاری ہیں انھوں نے افریقی آبادی کو ایک بھائی چارے میں پرو دیا ہے۔ یہ بین الافریقی تحریک اب تک بہت سے اہم نتائج پیدا کر چکی ہے۔ مثلاً:-

ا۔ اکرا اور تیونس میں بین الافریقی کانفرنسیں قائم ہو چکی ہیں۔

ب۔ افریقی رہنماؤں نے استعماری ہتھکنڈوں کا توڑ کرنے کے لیے متحدہ آواز اٹھائی ہے اور اس خطرے کا راستہ روکنے کے لیے وہ ایک مرکزی تنظیم قائم کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔

ج۔ گھنا اور گنی کا ایک یونین میں مدغم ہونا اور مالی فیڈریشن کا قیام دراصل افریقہ کی سیاسی وحدت کی طرف ہی قدم ہیں۔

افریقی طلبہ کی کان فرنس نے اس بین الافریقی تحریک کی سرگرم تائید کی۔ تاہم کان فرنس نے مشورہ دیا کہ اس تحریک کو منظم طور پر آگے بڑھنا چاہیے۔ تاکہ بعد میں کوئی ناخوش گوار نتائج پیدا نہ ہوں۔ لہٰذا کان فرنس نے سفارش کی کہ :-

۱۔ بین الافریقی اتحاد میں شریک ہونے والے ملکوں کی اندرونی آزادی کا پورا پورا احترام کیا جائے۔

۲۔ جمہوری اصولوں کو کسی صورت میں ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔

۳۔ بین الافریقیت کا یہ مطلب کبھی نہ ہونا چاہیے کہ گوری شہنشاہیت کی جگہ کالی شہنشاہیت قائم کر دی جائے۔

۴۔ بین الافریقیت کو ایک نئی قسم کی نسل پرستی سے بچنا چاہیے۔

۵۔ آزادی کی تحریک کا ایک اہم پہلو یہ ہونا چاہیے کہ افریقی عوام میں سیاسی شعور کو ترقی دی جائے اور افریقی ثقافت کی حفاظت کی جائے۔

۶۔ مختلف افریقی ملکوں کو چاہیے کہ ایک دوسرے کی مالی امداد کریں تاکہ تمام ملک آسانی سے آزادی کی تحریک میں حصّہ لے سکیں۔

کان فرنس نے افریقہ کے آزاد ملکوں سے اپیل کی کہ وہ مل کر ایک مضبوط اتحاد قائم کریں تاکہ اپنے دفاعی، خارجی، مالی اور معاشی مسائل کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت حل کریں۔ اس سے نہ صرف افریقہ کی تحریک آزادی کو سہارا ملے گا۔ بلکہ بعد میں آزاد ہونے والے افریقی ملکوں کے اس اتحاد میں شریک ہونا کم و بیش ناگزیر ہو جائے گا۔

کان فرنس نے ان تمام افریقی قوموں کو مبارک باد دی جو اس وقت آزادی کی جنگ لڑ رہی ہیں اور امید ظاہر کی کہ وہ جلد آزادی کی نعمت سے مالا مال ہوں گی۔ جہاد آزادی میں جانیں قربان کرنے والے مجاہدوں کی وفات پر افسوس کا اظہار کیا گیا۔

کان فرنس نے یہ بھی کہا کہ افریقی قوموں کو یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ آزادی بذات خود مقصد نہیں بلکہ یہ محض ایک ذریعہ ہے۔ یہ اس بات کا ذریعہ ہے کہ اہل افریقہ اپنی کوششوں سے

خوش حال اور مضبوط افریقہ تعمیر کریں۔

افریقہ کی معاشی حالت

سمان فرانس نے افریقہ کی معاشی حالت کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے ان حالات کا ذکر بھی کیا جو گوری قوموں کے آنے سے پہلے موجود تھے اور ان حالات کا بھی جو استعماری طاقتوں کے آنے کے بعد پیدا ہوئے۔

زمانہ قبل از استعمار

(۱) گوری قوموں کے آنے سے پہلے افریقہ میں زمین کی ملکیت افراد کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ قبیلے اور کنبے کے ہاتھوں میں تھی۔ قبیلہ یا کنبہ زمین کے ایک وسیع رقبے کا مالک ہوتا اور فرد کو اجازت ہوتی کہ اس رقبے کے جس حصے اور جس قدر حصے کو چاہے استعمال کرے۔ زمین کی یہ مشترکہ ملکیت قبیلے کے تمام افراد کو ایک مضبوط رشتے میں باندھے رکھتی۔ نتیجہ یہ تھا کہ زمین کے جھگڑے بہت تھوڑے پیدا ہوتے۔

(۲) فصلوں کی کاشت تجارتی اغراض کے لیے نہیں بلکہ ذاتی اور قبائلی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کی جاتی۔

(۳) کھیتی باڑی کا زیادہ کام مل جل کر کیا جاتا۔ یہ مشترکہ محنت قبائلی اتحاد کی پیداوار ہوتی تھی۔

۴۔ زراعت کے آلات پرانی وضع کے ہوتے جس کے نتیجے میں صرف ایک محدود رقبہ ہی کاشت کیا جا سکتا۔

۵۔ بیشتر فصلیں محض غذائی ضرورتوں کے لیے بوئی جاتیں اور یہ فصلیں ایک مختصر سے عرصے میں تیار ہو جاتیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ زمین کی مستقل ملکیت کا رواج بہت کم تھا۔ فصلیں بونے کا وقت آتا تو قبیلہ جس جگہ ہوتا اسی نواح میں وقتی طور پر کھیتی باڑی کا سامان کر لیتا۔

۶۔ جانور مثلاً گائیں، گھوڑے، بھیڑیں، بکریاں، اونٹ وغیرہ اس لیے پالے جاتے تھے کہ ان سے غذائی ضرورتوں کے علاوہ لباس اور باربرداری کی ضرورتیں پوری ہوتی تھیں

افریقہ کے بہت سے حصّوں میں فرد کی دولت اور اس کی حیثیت کا اندازہ اس کے جانوروں کی تعداد سے کیا جاتا تھا۔

(۷) مغربی مورخوں کا یہ بیان درست نہیں کہ گوری قوموں کی آمد سے پہلے افریقہ میں تجارت کا نام و نشان تک نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی قوموں کے آنے سے پہلے بھی اہل افریقہ آپس میں وسیع پیمانے پر تجارت کرتے تھے اور برّاعظم کے بڑے بڑے شہر تجارت کے اہم مرکز تھے۔

(۸) یہ تجارت گو زیادہ تر اجناس اور اشیاء کے تبادلے کی شکل میں ہوتی تھی۔ تاہم کرنسی کا استعمال بھی ہوتا تھا، مثلاً سونا اور دوسری دھاتیں بطور ذریعہ مبادلہ استعمال ہوتی تھیں۔

استعمار کی آمد

فرنگیوں کے آنے سے پہلے اہل افریقہ کھیتی باڑی کرتے تھے۔ مویشی پالتے تھے اور تجارت کرتے تھے۔ اگرچہ ان کے طریقے پرانے اور ذرائع آمد و رفت مشکل تھے اس لیے افریقی معیشت کچھ ترقی یافتہ نہ تھی۔ مگر وہ پورے طور پر متوازن بھی تھی اور ایک خوش حال زندگی ضامن بھی۔

فرنگیوں کے آتے ہی افریقی معیشت کا توازن ختم ہوگیا۔ انھوں نے آکر اس معیشت میں انقلابی تبدیلیاں کیں۔ مگر ان تبدیلیوں کا مقصد اہل افریقہ کی خوش حالی میں اضافہ کرنا نہیں تھا۔ بلکہ یورپ کی بڑھتی ہوئی صنعتی ضرورتوں کو پورا کرنا، یہ غایت حاصل کرنے کے لیے ذیل کے ہتھکنڈے استعمال کیے گئے۔

(۱) طرح طرح کے حیلوں بہانوں سے اہل افریقہ کو ان کی زمینوں سے محروم کیا گیا۔ اس مطلب کے لیے پہلے سے سوچی سمجھی چالیں۔ مکاریاں، جعل سازیاں، جعلی عہد نامے اور فوجی قوت استعمال کی گئی۔

(۲) مفتوحہ علاقوں میں ایک ہی قسم کی نقد فصل کو رواج دیا گیا۔ مثلاً گھنا میں کوکو، سوڈان میں کپاس، کینیا اور یوگنڈا میں قہوہ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان علاقوں کی معیشت یکطرفہ اور غیر متوازن بن کر رہ گئی۔ اس سے معاشی زندگی میں عدم یقین اور عدم استحکام پیدا ہوا۔

(۳) یورپ کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے افریقہ کی معدنی دولت کو خود غرضانہ انداز میں

لوٹا کھسوٹا گیا۔

(۴) افریقہ میں بڑے بڑے شہر آباد ہوئے۔ کارخانے قائم ہوئے اور ذرائع آمدورفت کو ترقی ملی۔ مگر ان تمام چیزوں کا مقصد اہل افریقہ کی خدمت نہ تھی بلکہ افریقہ کی قدرتی دولت کو سمیٹ کر یورپ میں پہنچانا تھا۔

(۵) افریقی دولت کی لوٹ کھسوٹ میں گوری قوموں نے مقامی آبادی سے آلۂ کار کی خدمت لی نتیجہ یہ نکلا کہ اہل افریقہ اپنے گورے آقاؤں سے کوئی قابل ذکر علوم و فنون نہ سیکھ سکے۔ اس لیے آج جو افریقی قومیں آزاد ہو رہی ہیں وہ اپنے آپ کو فنی ماہروں کی خدمت سے محروم پا رہی ہیں۔

(۶) مغربی تہذیب نے افریقہ میں جو بڑے بڑے شہر قائم کیے وہ افریقی لوٹ کھسوٹ کے اڈے بن کر رہ گئے۔ ان شہروں کی ہر قسم کی سہولتیں۔ ریسٹورانٹ۔ تھیٹر۔ سینما۔ ہوٹل وغیرہ — اہل افریقہ کے لیے شجر ممنوعہ ہیں۔ ان شہروں میں قدم رکھتے ہی افریقہ کے اصلی باشندے اچھوت بن کر رہ جاتے ہیں۔ انھیں اگر ان شہروں میں جانے کی اجازت دی جاتی ہے تو صرف اس لیے کہ اپنے گورے آقاؤں کے لیے خون پسینہ ایک کر کے کارخانوں یا کانوں میں دولت پیدا کریں۔

معاشرتی حالت

مغربی استعمار کی آمد نے معاشی زندگی کی طرح افریقہ کی معاشرتی زندگی میں بھی دوررس تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ زمانہ قبل از استعمار کی معاشرتی زندگی کی نمایاں خصوصیات یہ تھیں:-

۱ - قبیلہ معاشرتی زندگی کی اکائی تھا۔ قبیلے کا سردار اس کا حکمران، اس کا قاضی اور بعض حالتوں میں وہ اس کا مذہبی رہنما بھی ہوتا ہے۔

۲ - معاشرتی تنظیم اور بھائی چارے میں کنبے کو بنیادی اینٹ کا درجہ حاصل تھا۔

۳ - خدا ترسی اور قبائلی وفاداری کے جذبات پیدا کرنے میں مذہب بڑا اہم کردار ادا کرتا تھا۔

۴ - زمین کی مشترکہ ملکیت کے سبب قبیلے کے ہر فرد کی بہبود ایک مشترکہ ذمہ داری ہوتی تھی۔

۵ - طرح طرح کے جرائم اور دوسری معاشرتی برائیاں نسبتاً نا پید تھیں۔

(٦) قبیلے ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہتے تھے جس سے ذہنی افق اور ہمدردیاں دونوں تنگ ہو جاتی تھیں۔

(٧) قبیلے کے ہر فرد کے مقام کا انحصار اس بات پر ہوتا تھا کہ اس نے اجتماعی بہبود کو کس قدر ترقی دی ہے۔ یہی چیز اس کے عام احترام اور اس کے انسانی مقام کا فیصلہ کرتی تھی۔

(٨) ان تمام باتوں نے مل ملا کر ایک ہمہ گیر معاشرتی سکون اور سلامتی پیدا کر رکھی تھی۔

یہ درست ہے کہ افریقی قبیلوں کے الگ تھلگ زندگی گزارنے سے معاشرتی ترقی کا راستہ رکا ہوا تھا۔ مگر افریقہ کے معاشرتی نظام میں ایسی ناقابل انکار خوبیاں بھی موجود تھیں جو آج بھی نوع انسان کے لیے خیر و برکت کا موجب بن سکتی ہیں۔ مگر مغربی استعمار نے افریقہ کی ان ثقافتی قدروں کی چنداں پرواہ نہ کی اور اس کی معاشرتی سلامتی کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ اس صورت حال کی ذمہ داری زیادہ تر ذیل کے اسباب پر ہے:۔

(١) اہل افریقہ کی زمینیں چھین لی گئیں اور وہ بیچارے معاش کے معاملے میں مستقل طور پر فکرمند ہو گئے۔

(٢) گورے نوآبادکاروں نے افریقہ کی لامحدود قدرتی دولت سے ہاتھ رنگنے اور یہاں کی کالی آبادی کو مستقل طور پر بے بس بنانے کے لیے ایک ایسا نظام محنت رائج کیا جس سے اہل افریقہ کی گھریلو زندگی اور ان کا معاشرتی توازن دونوں تباہ ہو کر رہ گئے۔ کالے مزدوروں کو ان کے گھر بار سے اکھاڑ کر کانوں اور کارخانوں میں دھکیلا گیا اور ان کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے فائدہ اٹھانے کے باوجود ان پر نسلی علیحدگی کے انسانیت سوز قوانین ٹھونس دیے گئے۔

(٣) اہل فرنگ نے کالے محنت کشوں کو مشقت پر لگا کر افریقہ میں جس نئے معاشرتی نظام کی داغ بیل ڈالی ان میں ان محنت کشوں کو کوئی جگہ نہ دی گئی۔

(٤) اہل افریقہ کی دن بدن بڑھتی ہوئی تعداد کو ان کے گھر بار سے اکھاڑنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ جرائم کی رفتار میں خوفناک اضافہ ہوا۔

(٥) مغربی اثرات نے اہل افریقہ کے دلوں کو اس روایتی وفاداری سے محروم کر دیا جو وہ اپنے قبیلہ

یا کنبے کے ساتھ کتنے تھے نتیجہ یہ نکلا کہ ان لوگوں نے مغربی خیالات اور مغربی طور طریقوں کو بلا سوچے
سمجھے اختیار کرنا شروع کر دیا۔

(۶) اہل افریقہ پر فرانسیسی اور انگریزی وغیرہ غیر ملکی زبانیں ٹھونسی گئیں۔ اس میں کلام نہیں کہ
ان زبانوں کے طفیل افریقہ کے مختلف حصوں کے درمیان رابطہ قائم کرنا آسان ہو گیا۔ مگر ان غیر ملکی
زبانوں کی خاطر اکثر اوقات اہم افریقی زبانوں کی ترویج و اشاعت کا گلا گھونٹا گیا۔

یہ درست ہے کہ مغرب کے ساتھ رابطہ پیدا ہو جانے سے افریقہ کو کچھ فائدے بھی پہنچے مثلاً
تعلیم اور تجارت کے میدانوں میں افریقہ نے اچھی خاصی ترقی کی لیکن مغربی تہذیب کے فوائد و نقصانات
کو باہم تولنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے نقصانات فوائد کے مقابلے میں کہیں زیادہ بھاری ہیں۔ ان
حالات میں افریقہ کے نوجوانوں کا فرض ہے کہ وہ تحریک آزادی کے ساتھ ساتھ اہل افریقہ کو پرانا اخلاقی
نقطۂ نگاہ دینے کی کوشش بھی کریں تاکہ اس براعظم کے لوگ اپنی حقیقی شخصیت کو از سر نو پا لیں۔

اہل افریقہ کی معاشرتی سالمیت کا سب سے بڑا دشمن نسل پرستی کا جنون ہے۔ یورپ کے نام نہاد
سائنس دانوں اور ماہروں نے مدتوں تک اپنا سارا زور طبع یہ ثابت کرنے پر صرف کیے رکھا کہ نسلی برتری
ایک تخلیقی اور نسلاً بعد نسلاً منتقل ہونے والی چیز ہے۔ افریقہ کی گوری حکومتوں نے اس اصول کو
بنا عقیدہ قرار دے رکھا ہے۔ اور وہ طرح طرح کے حیلوں بہانوں اور بعض اوقات پوری سینہ زوری
سے گوری نسل کی برتری قائم رکھنے پر اصرار کر رہی ہیں۔ ان کی ساری قوت اس بات پر صرف ہو رہی ہے
اہل افریقہ بلا چون و چرا گوروں کے تفوق کے آگے گردنیں جھکائے رکھیں۔ افریقہ کے جو صاحب بصیرت
اس تفوق کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں انھیں باغی قرار دے کر تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے
صورت حال جمہوریت کا مذاق اور اقوام متحدہ کے منشور کا تمسخر اڑانے کے مترادف ہے ستم ظریفی
یہ ہے کہ امریکہ اور برطانیہ جمہوریت کے سب سے بڑے علمبردار ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود
پرستی کے علم بردار ہیں۔ امریکہ میں حبشیوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ اس کا
سب کو معلوم ہے۔ برطانیہ میں پچھلے چار پانچ سالوں میں کئی نسلی فساد ہو چکے ہیں اور سر

اوسوالڈ موزلے اور ان کے ساتھی کھلم کھلا یہ مہم چلا رہے ہیں کہ جزائر برطانیہ کو ایک گورا ملک رکھا جائے، حالانکہ اس قسم کا نعرہ دولت مشترکہ کے بنیادی تصور کے خلاف ہے۔ ان حالات میں دنیا بھر کے جمہوریت پسند انسانوں کا یہ فرض ہے کہ دنیا کو نسل پرستی کی لعنت سے پاک کرنے کے لیے متحد ہو جائیں اور اس سلسلے میں کسی جائز کوشش سے دریغ نہ کریں۔

مذاہب

شمالی افریقہ میں پہلے عیسائیت اور پھر اسلام نے قدم جمائے۔ مگر تاریک براعظم کے شمالی حصے کو چھوڑ کر اس کے باقی حصے پچھلی صدی تک خارجی مذہبی اثرات سے تقریبًا بالکل غیر متاثر تھے۔ اس براعظم کے وسیع و عریض حصے صدیوں سے ایک دوسرے سے الگ تھلگ زندگی گذارتے رہے۔ باہمی میل جول کی سہولتیں کم ہونے کے سبب مختلف حصوں کی معاشرتی زندگی نے اپنا جداگانہ رنگ پیدا کر لیا۔ یہ اختلاف افریقی باشندوں کے مذہبی عقائد میں بھی پوری طرح نمایاں تھا۔ مگر اس اختلاف کے باوجود افریقہ کے اصل مذاہب اور مذہبی عقائد میں بعض باتیں مشترک بھی تھیں۔ عیسائیت اور اسلام کی آمد سے پہلے اہل افریقہ کے رنگا رنگ مذہبی عقائد میں ذیل کی باتیں مشترک تھیں:۔

(۱) ایک عظیم برتر ہستی میں یقین کیا جاتا تھا اور اسے نظام فطرت کی تخلیق اور اس کے نظم و نسق کے لیے ذمہ دار سمجھا جاتا تھا۔

(۲) توحید کے اس بنیادی عقیدے کے باوجود شرک عام تھا۔ وجہ یہ کہ نظام فطرت کے رنگا رنگ مظاہر کو خدا کا قائم مقام خیال کیا جاتا تھا۔ عام عقیدہ یہ تھا کہ برتر ہستی طرح طرح کے روپ دھار کر کبھی مقدس درختوں میں آن بستی ہے۔ کبھی کسی جھیل یا پتھر میں بسیرا کر لیتی ہے اور کبھی کوئی اور جامہ پہن لیتی ہے۔

(۳) پروہتوں اور پروہتنیوں کو خدائی اسرار کا واقف اور خدا تک پہنچنے کا ذریعہ خیال کیا جاتا تھا اس لیے ان لوگوں کو ہر جگہ بے پناہ اقتدار حاصل تھا۔

(۴) پرانے بزرگوں کو دیوتاؤں کے مقرب خیال کیا جاتا تھا اس لیے ان کی پوجا کم و بیش دیوتاؤں کی طرح کی جاتی تھی۔

(۵) ان مذہبی عقائد کی گرفت زندگی کے ہر گوشے پر تھی۔ باہمی مراسم۔ بڑوں کے احترام۔ بچوں کی تربیت۔ کھیتی باڑی۔ شادی مرگ۔ غرضیکہ زندگی کے ہر کام میں دیوتاؤں کی رضا اور ان کی ناراضگی کا خیال رکھا جاتا تھا۔

(۶) دیوتاؤں کی پوجا پاٹھ کے ساتھ جو رسوم پیدا ہو گئیں ان میں ناچ اور گانا وغیرہ بھی شامل تھے جو افریقی ثقافت کے اہم لوازمات ہیں۔

(۷) ان تمام مذہبی عقائد نے مل ملا کر اہل افریقہ کو زندگی اور نظام فطرت کے متعلق ایک بھولا بھالا مگر معصومانہ نقطۂ نگاہ عطا کر رکھا تھا۔ اس نقطۂ نگاہ کے بارے میں خواہ کچھ بھی کہا جائے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ناقابل انکار ہے کہ اس نے افریقی زندگی کو ایک متوازن سکون عطا کر رکھا تھا۔

بیرونی مذہبی اثرات کے آنے سے اوپر دیئے گئے مذہبی عقائد کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی۔ اگرچہ آج بھی یہ پرانے عقائد پوری طرح ختم نہیں ہوئے۔ تاہم نئے مذہبی میلان کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں:-

(۱) توحید کا عقیدہ زور پکڑ رہا ہے۔

(۲) انسان کو اللہ تعالے کا شاہکار قرار دے کر انسانی احترام اور شرف انسانیت پر زور دیا جا رہا ہے۔

(۳) افریقہ کے پرانے مذہبی عقائد اور مذہبی رسوم کے ساتھ جو چیز بھی کسی نہ کسی طرح کا تعلق رکھتی ہے اسے پلید اور ناقابل قبول خیال کیا جاتا ہے۔ مسیحی تحریک نے اس چیز کو اس حد تک اچھالا ہے، کہ افریقی ثقافت کے بعض اجزا، مثلاً آلات موسیقی، سنگ تراشی اور اس قسم کے دوسرے فنون کو ملیا میٹ کر دینے کی مہم جاری ہے۔

(۴) مسیحی تحریک کے زیر اثر سیاسی اور مذہبی ذمہ داریوں کو دو الگ الگ چیزیں خیال کیا جانے لگا ہے۔ افریقہ کے سوجھ بوجھ رکھنے والے طبقے کو اس بات کا احساس ہے کہ باہر سے آنے والے مذاہب نے

افریقی زندگی میں پسندیدہ قدروں کا اضافہ کیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ احساس عام ہے کہ عیسائیت کی نشرواشاعت اس طور پہ کی گئی ہے جس سے افریقہ کی معاشرتی زندگی میں بعض تشویشناک عناصر پیدا ہوگئے ہیں۔ ان میں سے زیادہ اہم درج ذیل ہیں -

(۱) جن سامراجی طاقتوں نے افریقہ کو اپنے چنگل میں دبوچ رکھا ہے وہ سب کی سب مذہبًا عیسائی ہیں۔ اس سے عیسائی مبلغوں کو بے پناہ سیاسی قوت حاصل ہے۔ یہ چیز اہل افریقہ کے دلوں میں کھٹکتی ہے -

(۲) مختلف عیسائی فرقوں میں سے ہر ایک حقیقی عیسائیت ہونے کا دعویدار ہے۔ یہ چیز افریقی عوام کے دلوں میں پریشانی پیدا کرنے کی موجب ہے -

(۳) مسیحی مشن جن اصولوں کا پرچار کرتے ہیں خود ان پہ عمل نہیں کرتے۔ قول و فعل کے اس تضاد کی سب سے نمایاں مثال نسلی علیحدگی ہے۔ گورے پادری نہ صرف اس علیحدگی کی تائید کرتے ہیں بلکہ گرجے کی عبادات میں بھی اس پہ عمل کرتے ہیں۔

(۴) کئی عیسائی فرقے اہل افریقہ میں پھوٹ کا بیج بونے اور انھیں ایک دوسرے سے توڑنے کی حکمت عملی پہ کاربند ہیں۔

(۵) سامراجی اور نوآبادیاتی طاقتیں افریقہ کے مختلف حصوں میں جو ظلم و ستم ڈھا رہی ہیں مسیحی کلیسا اس کے خلاف آواز بلند کر کے مسیحی اصولوں کی سچائی ثابت نہیں کر سکا۔

(۶) اہل افریقہ کے درمیان مذہب سے بددلی کا میلان بڑھ رہا ہے۔ شہری علاقوں میں یہ صورت حال زیادہ نمایاں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسیحیت قبول کرنے والے افریقی جب اپنے آپ کو معاشی، معاشرتی اور سیاسی میدانوں میں بنیادی انسانی حقوق سے محروم پاتے ہیں تو وہ ایک شدید قسم کے احساس نامرادی کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ انھیں شدت سے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ مذہب کے خوبصورت اصول محض الفاظ ہیں۔ انھیں عملی زندگی سے کچھ واسطہ نہیں۔ چنانچہ وہ مذہب سے ہی بیزار ہونے لگتے ہیں۔

یہ ہیں وہ عوامل جن کے باعث عیسائیت اپنے پورے سیاسی غلبے کے باوجود افریقہ میں بہت بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکی۔ یہی وہ عوامل ہیں جنھوں نے عیسائیت کے مقابلے کا اسلام کا راستہ سہل تر بنا رکھا ہے۔ مگر اسلام کی پشت پر کوئی منظم قوت موجود نہیں۔

تنظیم کے اس فقدان کے باوجود اسلام نے موجودہ صدی میں افریقہ میں جو کامیابی حاصل کی ہے وہ حالیہ تاریخ کا ایک معجزہ ہے۔ زیادہ دیر کی بات نہیں افریقہ میں مسیحی مشنریوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں حالات کا جائزہ لینے کے بعد یہ اعلان کیا گیا تھا کہ افریقہ میں مسیحیت اسلام کا مقابلہ کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اسلام کی حقیقی قوت دراصل اس کی سیدھی سادھی فطری تعلیم میں ہے جو بڑی آسانی سے ان لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتی ہے جو اس وقت دور وحشت سے نکل کر بیسویں صدی میں قدم رکھ رہے ہیں۔ یہ صورت حال دنیا بھر کے مسلمان نوجوانوں کی قوت عمل کو للکارتی ہے انھیں چاہیے کہ افریقہ پہنچیں اور اپنی زندگیاں اسلام کی روشنی پھیلانے کے لیے وقف کر دیں۔

تعلیم

اگرچہ گوری قوموں کے آنے سے پہلے افریقہ میں رسمی تعلیم دینے کے لیے کوئی مدرسے، مکتب یا کالج موجود نہ تھے تاہم نئی پود کو قبائلی رسم ورواج، ضابطہ اخلاق، مذہب اور معاشرتی طور طریقے سکھانے کا تسلی بخش انتظام ہر جگہ موجود تھا۔ اس زمانے کا افریقی معاشرہ بلاشبہ وحشی معاشرہ تھا اور وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا۔ مگر ایک چھوٹے سے چھوٹا اور وحشی سے وحشی معاشرہ بھی اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اس میں پل کر جوان ہونے والے افراد معاشرتی زندگی کے وہ تمام آداب اور راز سیکھ جائیں جو اس معاشرے نے اپنے طویل تجربے سے جمع کیے ہیں۔ نئی پود کو یہ تربیت دینے کے لیے کوئی خاص ادارے قائم نہیں کیے جاتے۔ بلکہ جوں جوں بچے ذرا ہوش سنبھالتے ہیں انھیں اجتماعی زندگی کی سرگرمیوں میں شریک کیا جاتا ہے۔ تاآنکہ سیانے ہونے تک وہ ان تمام باتوں سے واقف اور ان تمام مہارتوں میں ماہر ہو جاتے ہیں جو ان کے بڑوں کو معلوم ہیں۔ یہ غیر رسمی تعلیم جو براہ راست تجربے کو اپنا ذریعہ بناتی تھی افریقی بچوں اور نوجوانوں کو مقامی زندگی میں مؤثر حصہ لینے کے قابل بنا دیتی

ضامن تھی۔ اِس نظامِ تعلیم کے امتیازی نشان مندرجہ ذیل تھے۔

(۱) غیر رسمی تعلیم کے ذمّہ یہ فرض تھا کا فریقہ کی نئی نسلوں کو قانون، طب، صنعت و حرفت، طریق جنگ مجلسی آداب، مذہب، رفاہی کام، تاریخ اور ادب کی تعلیم دے۔

(۲) تعلیم کا ذریعہ عملی تجربہ تھا۔ بڑے بوڑھوں کو عقل و خرد کے سرچشمے خیال کیا جاتا تھا۔ اس لیے ان کا بڑا احترام کیا جاتا تھا اور ان کی ہر بات کو توجہ سے سنا جاتا تھا۔

(۳) مقامی سردار کا گھر قصبہ کے دیوانی اور فوجداری مقدموں کے لیے عدالت کا درجہ رکھتا تھا۔ سردار کے ساتھ دوسرے بڑے بوڑھے بھی مقدمہ سننے بیٹھتے تھے۔ جب دو گھرانوں کے درمیان جھگڑا ہو جاتا تو کنبے کے باپ یہ جھگڑا بڑے بوڑھوں کے پاس لے جاتے جو اپنی مدد کے لیے بعض اوقات فیصلے کے دوسرے بڑے بوڑھوں کو بھی بلا لیتے۔ تاہم دونوں گھرانوں کو یہ حق حاصل رہتا تھا کہ اس فیصلے کے خلاف سردار کی عدالت میں اپیل کریں۔ سردار کا فیصلہ آخری اور قطعی ہوا کرتا تھا۔

(۴) معاشرتی اخلاق و آداب کو تحریری تشکل نہیں دی گئی تھی۔ تاہم اجتماعی شعور میں یہ ضابطے اس سختی سے محفوظ تھے کہ کوئی فرد ان کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل سے بھی روگردانی کرنے کی مجال نہیں رکھتا تھا۔

(۵) مذہب پوجا پاٹھ کے طریقوں اور بزرگوں کی پوجا پر مشتمل تھا۔ یہ مذہبی ضابطہ پورے طور پر مرتب تھا۔ اور بڑی احتیاط سے نئی پود کو سونپا جاتا تھا۔

(۶) شکار کھیلنا نہ صرف پیٹ پالنے کے لیے ضروری تھا بلکہ یہ ایک تفریح بھی تھی اور فوجی تربیت بھی۔ بعض علاقوں میں جنگی تربیت کا باقاعدہ انتظام موجود تھا۔

(۷) لوہار اور جولاہے کے پیشے مخصوص صنعتیں تھیں۔ ان کے علاوہ دوسری دست کاریاں بھی موجود تھیں مگر سب سے بڑی صنعت جس میں ہر شخص کو مہارت حاصل کرنا ضروری تھا زراعت تھی۔ گو موسم پیش گوئی کے لیے کوئی آلے موجود نہ تھے، پھر بھی مختلف علامات مثلاً بادلوں کی بلندی اور رنگ، ہوا کے رُخ، ان کی رفتار، ان کے درجۂ حرارت اور عام درجہ حرارت کے مشاہدے

موسم کے متعلق اچھی قابلِ اعتماد موسمی پیش گوئیاں کی جاتی تھیں۔

(۸) تاریخ پڑھانے کا عام طریق یہ تھا کہ جب کنبہ شام کے کھانے کے لیے آگ کے گرد جمع ہوتا تو گھر کے بڑے چھوٹے بچوں اور نوجوانوں کو قبیلے کے کارناموں سے آگاہ کرتے مجلسی تقریبوں پر جب سارا قبیلہ ایک جگہ جمع ہوتا تو تاریخ کے ماہر لوگ تمام افراد کو قبیلے کی بیتی ہوئی عظمت کے واقعات بڑی صحت سے بتاتے۔ ایسے موقعوں پر اگر کوئی راہ گیر ادھر آن نکلتا تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ وہ مجمع کو دور دراز بسنے والے قبیلوں کے حالات بڑی صحت اور صفائی سے آگاہ کرتا۔ اور اس قبیلے کے حالات اپنے ساتھ لیے جاتا۔ سن و سال کی ترتیب کے لیے کسی خاص یا اہم واقعہ مثلاً قحط یا جنگ یا فطرت کے کسی غیر معمولی کرشمے کو حوالے کے لیے استعمال کیا جاتا۔

(۹) تاریخ کی طرح ادبی ورثہ بھی لوگوں کے حافظوں میں ہی محفوظ تھا۔ جب بڑے بڑے اجتماع ہوتے تو خوش بیان مقرر دل چسپ کہانیوں سے لوگوں کے دل بہلاتے۔ نظمیں اور گیت گائے جاتے۔ اس طرح یہ ادبی خزانہ دن بدن بڑھتا جاتا اور نئی نسلوں کے ذہنوں میں منتقل بھی ہوتا رہتا۔

(۱۰) طب اور علاج معالجہ جادوگروں کے لیے مخصوص تھا۔ یہ لوگ نہ صرف جادو ٹونے استعمال کرتے تھے، بلکہ شفائی جڑی بوٹیوں کی طبی تاثیر میں بھی بڑی گہری نگاہ رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ علم نفسیات میں بھی غیر معمولی دست گاہ کے مالک ہوتے تھے۔ جب وہ کسی عارضے کا بدنی سبب معلوم نہ کر سکتے تو جھٹ مریض کی قوتِ ارادہ سے خدمت لینے لگتے۔ وہ اس کی بیماری کو ہمسائے کی نظرِ بد یا اس طرح کے کسی اور سبب کا نتیجہ قرار دیتے اور اس کے دفعیہ کے لیے طرح طرح کے ٹوٹکے ٹونوں سے کام لیتے۔ جدید سائنس اس طریق علاج کی معقولیت سے منکر نہیں۔

نئے تعلیمی ادارے | نئی پود کو عملی تجربے کی بدولت تعلیم دینے کا جو غیر رسمی نظام صدیوں سے

چلا آتا تھا۔ گوری قوموں کے آنے سے اس کی بنیادیں رفتہ رفتہ ہلنے لگیں۔ یہ اس لیے نہیں کہ مغربی نظام تعلیم اپنے بنیادی فلسفے اور اپنی ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے بہت مختلف تھا۔ کیوں کہ حقیقت یہ ہے کہ گوری قوموں کی ساری دل چسپی معاشی اور سیاسی لوٹ کھسوٹ میں تھی۔ انھیں اہل افریقہ کی تعلیم میں کوئی دل چسپی نہ تھی۔ لیکن افریقہ کی لامحدود قدرتی دولت کو سمیٹنے کے لیے مزدوروں کی ضرورت تھی چناں چہ گورے آقاؤں نے افریقی باشندوں کو اپنے گھر بار سے گھسیٹ کر، کانوں، کھیتوں اور کارخانوں میں جمع کرنا شروع کیا۔ اس سے وہ تعلیمی عوامل ڈھیلے پڑ گئے جو صدیوں سے مؤثر تعلیمی خدمت انجام دے رہے تھے۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا گورے آبادکاروں کو احساس ہونے لگا کہ اگر افریقی مزدوروں کو تھوڑی سی بہت تعلیم دے دی جائے تو اس سے افریقہ کی دولت سمیٹنے کا کام زیادہ سہل ہو جاتا ہے۔ افریقہ میں بری کھلی جدید تعلیم کی اشاعت کا بنیادی اصول پہلے دن سے یہی رہا ہے۔ مسیحی مشنری نے جدید تعلیم پھیلانے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ یہ لوگ افریقہ میں نوآبادکاروں سے پہلے آئے اور مغربی سامراج کے لیے راستہ صاف کرتے گئے۔

ان لوگوں نے بہت جلد یہ نکتہ بھانپ لیا تھا کہ عیسائی دین پھیلانے کے کام میں تعلیم بڑا کام دے سکتی ہے۔ چناں چہ انھوں نے بعض حالتوں میں اپنی حکومتوں کی مدد کے بغیر ایک عرصے تک تعلیم پھیلانے کی ذمہ داری اٹھائے رکھی۔ انھوں نے کوشش کی کہ تعلیمی سہولتیں زیادہ سے زیادہ عام کی جائیں۔

اوپر بیان کیے گئے عوامل کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل افریقہ کو جدید دنیا کے تقاضوں کا احساس ہونے لگا یقین رفتہ رفتہ بڑھنے لگا کہ معاشرتی تبدیلی ناگزیر ہے اور مغربی تعلیم اپنے اندر یقینی طور پر ایسے مثبت اوصاف رکھتی ہے جو ترقی کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ مغربی نظام تعلیم انسان کی علمی میراث میں ایک بنا جگہ رکھتا ہے اور ہر قوم اور ہر ملک کو چاہیے کہ رنگ نسل اور مذہب سے قطع نظر اس علمی میراث سے فائدہ اٹھائے۔ اس احساس کی شدت بڑھتی ہی گئی ہے۔ اور اہل افریقہ جدید تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار نظر آتے ہیں۔

اس صورتِ حال نے افریقہ کے گورے حکمرانوں میں دلچسپ مگر عجیب و غریب ردِّ عمل پیدا کیا ہے۔ اقلیت میں ہونے کے باوجود یہ لوگ حکومت اور نظامِ تعلیم پر چھائے ہوئے ہیں۔ اپنے اس غلبے سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے افریقی نکتۂ نگاہ اور افریقی ضرورتوں کو قریباً قریباً نظر انداز کیے رکھا ہے انھوں نے اس بات کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی کہ مغربی نظامِ تعلیم میں افریقہ کے مخصوص حالات کے پیش نظر کچھ رد و بدل کیا جائے۔ صرف یہی نہیں بلکہ دیدہ دلیری سے کام لے کر اس بات کا فیصلہ بھی وہ خود ہی کرتے رہے ہیں کہ اہلِ افریقہ میں سے کتنے افراد کو تعلیم دی جائے کس درجے تک تعلیم دی جائے اور کس ادارے میں تعلیم دی جائے۔

افریقہ کی بعض گوری حکومتیں ایسی بھی ہیں (جنوبی افریقہ کی یونین کا نام اس زمرے میں سرِ فہرست ہے) جو نسلی جنون میں اس سے بھی کئی منزلیں آگے نکل گئی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جدید تعلیم مغرب الاصل ہے۔ اس لیے وہ اہلِ افریقہ کو کسی طرح راس نہیں آ سکتی۔ اس لنگڑے بہانے کی آڑ میں تعلیم کا حق دار صرف گوری قوم کی اولاد کو سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ کالی آبادی کے ذہنوں کو طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زنجیروں میں جکڑے رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

افریقہ کے مٹھی بھر گورے آبادکاروں اور ان کی سامراجی حکومتوں کا یہ طرزِ عمل اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ وہ افریقہ میں تعلیم کی نشر و اشاعت کو اپنے لیے بہت بڑا خطرہ خیال کرتے ہیں۔ انھیں ڈر ہے کہ تعلیم کی روشنی عام ہو جانے سے ان کی سیاسی اور معاشی اجارہ داری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس خطرے کا راستہ روکنے کے لیے سیاسی ہتھیاروں سے کام لیا جا رہا ہے۔ مغربی افریقہ کی یونین اور بعض دوسرے علاقوں میں کالی آبادی کو رائے دینے کا سرے سے حق حاصل نہیں۔ کچھ اور علاقوں مثلاً روڈیشیا، کینیا وغیرہ میں کالی آبادی کو رائے دینے کا ظاہراً جو حق دیا گیا ہے وہ عملاً بالکل غیر مؤثر ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ نہ افریقی نمائندے منتخب ہو سکتے ہیں اور نہ وہ ان ملکوں کی تعلیمی پالیسی پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

گوری حکومتوں نے کالی آبادی کو زمین کی ملکیت کے حقوق سے محروم کر کے، اسے معاشی طور پر

بکل مفلوج بنا دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اہل افریقہ اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کی مطلق استطاعت نہیں رکھتے۔ لہذا جب گوری حکومت ان نادار بچوں اور نوجوانوں میں سے بعض کو وظیفے دے کر تعلیم دلاتی ہے تو یہ بے چارے ذہنی طور پر حکومت سے اس قدر مرعوب اور اس کے اس قدر احسان مند ہو جاتے ہیں کہ آگے زندگی میں گوری حکومت کے ازلی وفادار ثابت ہوتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ خود اپنی قوم اور اپنے ملک کے بہترین مفاد کے خلاف کام کرنے میں عموماً کوئی برائی نہیں رکھتے۔

اہل افریقہ کی تعلیمی پسماندگی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ گورے اور کالے طلبہ کی تعلیم الگ الگ اداروں میں ہوتی ہے۔ اس پالیسی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ کوئی افریقی استاد یا ماہر تعلیم خواہ لاکھ قابل ہو، اسے آسانی سے نہ اچھی جگہ ملتی ہے اور نہ وہ اپنے اوپر مزید ترقی کے دروازے کھلے پاتا ہے۔

اس افسوس ناک صورت حال سے سب سے اہم نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر اہل افریقہ نوع انسان کی علمی میراث سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو انہیں پہلے سیاسی طور پر آزاد اور خود مختار بننا چاہیے۔ جب تک سیاسی غلامی کا جوا ان کے کندھوں پر موجود ہے، تعلیم کی نشر و اشاعت خاطر خواہ طور پر نہ ہوگی۔ مگر تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے سیاسی سوجھ بوجھ ضروری ہے اور یہ چیز تعلیم ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لیے اہل الرائے افریقیوں کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ جو افریقی علاقے ابھی مغربی سامراج کے چنگل میں پھنسے ہیں وہاں روشن خیال اور قوم پرست لوگوں کا فرض ہے کہ تعلیم پھیلانے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں۔ اور افریقہ کے جو علاقے آزاد ہو چکے ہیں ان کی حکومتوں کا یہ فرض ہے کہ اپنے نظام تعلیم کو جلد از جلد مخصوص افریقی ضرورتوں کے مطابق ڈھالیں۔

ہماری تعلیم

سید احمد مزمل — مسلسل نمبر ۲

دوسری عالمگیر لڑائی

دوسری عالمگیر لڑائی پہلی عالمگیر لڑائی کی نسبت زیادہ عالمگیر تھی۔ اس کا اثر ہندوستان پر براہ راست پڑا۔ جاپانی افواج نے مشرق بعید پر قبضہ کر لیا۔ انڈونیشیا۔ ملایا۔ سیام اور برما جاپانیوں کے زیر اقتدار آ چکے تھے۔ اور اب جاپانی طیارے کلکتہ اور مشرقی گناٹ کے طول و عرض پر مصروف ترک و تاز تھے۔ یہ حالات اتنے اندیشہ ناک تھے کہ حکومت ہند کے جملہ اختیارات گورنر جنرل نے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ مقامی تحریکیں حسب معمول آزادی کا مطالبہ کرتی رہیں۔ اور کہیں کہیں حکومت سے متصادم ہونے کے واقعات بھی ہوتے رہے۔ لیکن جب ۱۹۴۲ء میں کانگریس کی مجلس انتظامیہ نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی قرارداد منظور کی تو حکومت نے زعمائے کانگریس کو گرفتار کر لیا۔ اس گرفتاری کے بعد ملک میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اور طلبہ نے بالخصوص ہر احتجاج اور ہر فساد میں حصہ لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک تند جولاں دریا ہے۔ اور اس کی لپیٹ میں ہندوستان کا ذرہ ذرہ آ گیا ہے۔ مسلم لیگ نے اس احتجاج میں کانگریس کے ساتھ تعاون نہیں کیا۔ اور اس طرح مسلمان طلبہ کی عظیم اکثریت ان فسادات سے دست کش رہی۔

جنگ اور مابعد جنگ کی تعلیمی سرگرمیاں

ان سیاسی ہنگامہ آرائیوں کے باوجود تعلیم کی تعمیر نو کا مسئلہ بھی زیر بحث آتا رہا۔ کانگریس خود ان تعلیمی تقاضوں سے غافل نہ تھی اور اکثر کانگریسی زعما اس موضوع پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ گاندھی جی کی ودیا مندر اسکیم (واردھا اسکیم) دراصل کانگریس کی سرکاری تعلیمی اسکیم تھی۔ ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین خان کی قیادت میں یکے بعد دیگرے دو کمیٹیاں مقرر کی گئیں۔ ان کمیٹیوں کی تشکیل، مقصد واردھا اسکیم کا اس طرح جائزہ لینا تھا کہ ضروری ترمیم کے بعد اسے ہندوستان کی ابتدائی

تعلیم کی بنیاد قرار دیا جائے. چناں چہ انھیں کمیٹیوں کی سفارشات پر بنیادی تعلیم کی تفصیلات طے پائیں اور انھیں سارجنٹ رپورٹ میں من وعن شامل کرلیا گیا۔

دوسری عالمگیر لڑائی میں بھی اگرچہ ہندوستان براہ راست جنگ میں شریک نہ تھا لیکن برطانیہ کی متابعت میں اسے بھی شریک ہونا پڑا۔ جنگ کے ابتدائی چند سال اتحادیوں کے لیے تباہ کن تھے۔ اس لیے اس وقت حکومت ہند کی ساری توجہ لڑائی جیتنے کے لیے برطانیہ کی مالی اور فوجی امداد پر مرکوز رہی، تعلیم یا عوامی مفاد کے کام اس وقت خارج از بحث تھے۔ لیکن ۱۹۴۳ء میں حالات نے پلٹا کھایا۔ اب اتحادیوں کو یہ توقع ہو چلی تھی کہ جنگ کا فیصلہ ان کے حق میں ہوگا۔ اس توقع کے پیش نظر حکومت ہند نے بھی مابعد جنگ کی تعمیر نو کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ چناں چہ ۱۹۴۴ء میں ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن (مرکزی مشاورتی بورڈ) نے ہندوستان میں تعلیم کی تعمیر نو کا ایک خاکہ مرتب کیا۔ اس وقت جان سارجنٹ حکومت ہند کے تعلیمی مشیر تھے۔ اس لیے اس رپورٹ کو بعض اوقات سارجنٹ رپورٹ بھی کہہ دیا جاتا ہے۔

یہ رپورٹ تعلیم کو ایک مربوط کل بنانے کے سلسلے میں دوسری اہم کوشش ہے اور اس میں ابتدائی، ثانوی، ٹیکنیکل اور اعلیٰ تعلیم کا ایک ایسا نظام قائم کرنے کی کوشش کی گئی جو ملک کے مخصوص تقاضوں کی حامل ہو۔ اس کی اہم سفارشات یہ ہیں :-

ابتدائی تعلیم

(۱) چھے سے چودہ سال کی عمر کے بچوں اور بچیوں کے لیے عالم گیر، مفت اور لازمی تعلیم کا نظام جلد از جلد قائم کیا جائے۔ یہ ممکن ہے کہ اچھے اور تربیت یافتہ اساتذہ کی عدم فراہمی کی صورت میں اس مقصد کی تکمیل چالیس سال سے پہلے نہ ہو۔

(۲) بنیادی تعلیم (Basic Education) کو لازمی ابتدائی تعلیم کی اساس قرار دیا جائے

(۳) اچھے اور تربیت یافتہ اساتذہ فراہم کیے جائیں اور ان کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔

(۴) لازمی ابتدائی تعلیم کے اس منصوبے پر دو ارب روپے خرچ ہوں گے۔

ثانوی تعلیم

(۱) ہائی سکول کا نصاب چھ سال ہو اور بچوں کی عمر گیارہ سے سترہ برس۔

(۲) ہائی سکول کا داخلہ انتخابی ہوگا۔ اس میں وہی طلبہ داخل کیے جائیں گے جو تعلیم سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہوں۔

(۳) جو طلبہ منتخب نہ ہوں۔ ان کے لیے اضافی نشستوں کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہوگی یہ اخراجات عوامی فنڈ سے پورے نہ کیے جائیں۔

(۴) ہر پانچ بچوں میں سے ایک بچہ ہائی اسکول کی تعلیم کے لیے انتخاب کیا جائے گا۔

(۵) ہائی سکول دو قسم کے ہوں گے (ا) علمی (ب) ٹیکنیکل۔

دونوں کا مقصد عمومی تعلیم کی فراہمی ہوگی۔ سکول کے آخری سالوں میں اس قسم کی تعلیمی سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔ جو آگے چل کر ان کے پیشوں میں کام آسکیں۔

(۶) ہر صورت میں حالات کے مطابق نصاب مختلف النوع ہوگا۔ اور یونی ورسٹی یا دوسرے امتحانی اداروں کی ضرورت کے تابع نہیں ہوگا۔

(۷) اس خیال کے پیش نظر کہ اچھے مفلس طلبہ اپنے افلاس کی وجہ سے تعلیم سے محروم نہ رہ جائیں۔ ان کے لیے مفت تعلیم یا وظائف کا انتظام کیا جائے گا۔

(۸) اچھے اور اعلیٰ قسم کے اساتذہ کی خدمات حاصل کرنے کے لیے انہیں معقول تنخواہ دی جائے گی

(۹) جب یہ منصوبہ مکمل ہو جائے گا تو ثانوی تعلیم پر پچاس کروڑ روپے خرچ ہوں گے۔

یونی ورسٹی تعلیم

(۱) ہندوستانی یونی ورسٹیوں کے بعض بڑے اچھے پہلو بھی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک قومی نظام تعلیم کے تقاضوں کو بوجوہ احسن پورا نہیں کر رہی ہیں۔

(۲) یونی ورسٹی تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کے لیے داخلے کی شرائط پر نظر ثانی کی ضرورت ہے تاکہ یونی ورسٹی میں صرف وہی طالب علم آئیں جو اعلیٰ تعلیم سے استفادہ کر سکیں۔

(۳) نادار طلبہ کے لیے معقول مالی امداد کا انتظام کیا جائے گا۔

(۴) موجودہ انٹرمیڈیٹ کلاس ختم کردی جائے اور اس کا سارا کورس سکول ہی میں ختم ہو جایا کرے لیکن فوری طور پر اس کا پہلا سال ہائی سکول میں اور دوسرا سال یونیورسٹی میں منتقل کر دیا جائے۔

(۵) یونیورسٹی ڈگری کے لیے کم سے کم مدت تعلیم تین سال ہونی چاہیے۔

(۶) یونیورسٹی سسٹم کی توسیع کی جائے اور اساتذہ اور طلبہ کے درمیان قریبی تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

(۷) اعلیٰ تعلیم اور تحقیق کے معیار کو بلند کرنے کی طرف بالخصوص توجہ دی جائے۔

(۸) یونیورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ کی ملازمت کی شرائط کو بہتر بنایا جائے۔

(۹) ایک انڈین یونیورسٹی گرانٹ کمیٹی قائم کی جائے جو یونیورسٹیوں کو ان کی ضروریات کے مطابق گرانٹ دیتی رہے۔ اور ان کے کام میں ایک خاص قسم کا تطابق پیدا کرتی رہے۔

(۱۰) یونیورسٹی تعلیم کی اس توسیع پروگرام پر تقریباً چھے کروڑ بہتر لاکھ روپے خرچ ہوں گے۔

ٹیکنیکل ایجوکیشن

(۱) زمانہ مابعد جنگ میں ملک کی صنعتی ضروریات میں اضافہ ہو جائے گا۔ انھیں مزید ماہر کارکنوں کی ضرورت ہو گی جن طلبہ کو صنعت و حرفت سے دلچسپی ہو گی وہ ٹیکنیکل تعلیم کے نصاب سے خاصہ فائدہ اٹھا سکیں گے۔

(۲) ملک میں ضرورت کے مطابق جونیئر ٹیکنیکل سکول ٹیکنیکل ہائی سکول اور سینئر ٹیکنیکل ہائی سکول قائم کیے جائیں گے۔

قیام پاکستان اور تعلیم

یہ سفارشات بجائے خود ایک مربوط نظامِ تعلیم کی ضامن تھیں لیکن ابھی ان پر عمل درآمد کی نوبت نہیں آئی تھی کہ ملکی سیاست نے اپنا ایک رُخ بدلا۔ اختتامِ جنگ کے بعد ملک کے طول و عرض میں انتخابات ہوئے اور ان انتخابات میں مسلم لیگ کی سیاسی حیثیت مسلّم ہو گئی۔ اور اب یہ کہنا کہ مسلم لیگ مسلمانوں

مدنمائندہ جماعت ہے۔ محض عقلی یا پروپاگنڈا نہ تھا، بلکہ حقیقت تھی۔ ہند مسلم انتشار بڑھتا گیا۔ کرپس یکابینہ مشن دونوں ناکام رہے۔ لیکن اس کے بعد بھی آپس میں سمجھوتے کی کوششیں ہوتی رہیں۔ اور اگرچہ ناکوششوں میں کسی کی نیک نیتی پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن پھر بھی کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور بالآخر ملک تقسیم ہو گیا اور پاکستان اور ہندوستان کی دو مملکتیں وجود میں آگئیں۔

تقسیم ملک کے بعد پاکستان کا نظام تعلیم کیا ہوگا؟ کیا وہی نظام تعلیم جو ہمیں آنایان فرنگ سے ورثے میں ملا ہے یا ہم خود اسے اپنی ضروریات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں گے؟ یہ ایک اہم مسئلہ تھا۔ چناں چہ حکومت نے ۱۹۴۷ء ہی میں ایک تعلیمی کانفرنس بلائی کہ اب ہمارا تعلیمی موقف کیا ہوگا۔ کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے جناب فضل الرحمٰن وزیر تعلیم نے فرمایا:۔

ہمارے سامنے اس وقت اپنی تعلیمی حکمت عملی کی تعمیر نو کے بڑے امکانات ہیں۔ ایسی تعمیر نو کے جو ایک طرف وقت کے تقاضوں کو پورا کر سکے اور دوسری طرف اس میں ان نظریات کی عکاسی ہو جس کی پاکستان بحیثیت ایک اسلامی ریاست کے ترجمانی کرتا ہے۔"

ان چند الفاظ سے ہمارے موقف کی توضیح ہو جاتی ہے۔ ایک طرف تو تعلیم کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ اور دوسری طرف اس کا مقصد یہ ہوگا کہ اس نظام تعلیم کی اساس اسلام ہو۔ تعلیم کو اگرچہ اس نہج پر قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن عملاً اس وقت تک ہم وہی ہیں جہاں سے تقریباً سو برس پہلے چلے تھے۔ ایک بحرانی سی کیفیت ہے۔ اور ہر شخص اس بحران کا شاکی ہے۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر اس وقت تک بے شمار کانفرنسیں ہوئیں۔ اور ہر کانفرنس میں ہم نے بآواز بلند اپنے اس موقف کا اعلان کیا۔ لیکن کانفرنس کی ہنگامہ آرائیاں ختم ہوئیں اور سند و بین دانش ور کی بلند آہنگی میں ایک سکوت پیدا ہوا تو اس کے ساتھ ساتھ اس عزم اور حوصلے پر بھی سکرات کا عالم طاری ہو گیا۔ مرکزی مشاورتی بورڈ کی پہلی، دوسری تیسری، چوتھی اور پانچویں کانفرنس چھ سالہ منصوبہ ان سب میں بہت ہی عمدہ اور کارآمد باتیں کہی گئی ہیں۔ لیکن اس کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس پر سنجیدگی سے عمل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

ابتدائی تعلیم

ابتدائی تعلیم منہو نا اپنی ابتدائی منزلوں میں ہے جس عمر کے بچے دوسرے متمدن ملکوں میں زیرِ تعلیم ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اس عمر کے بچے گلی کوچوں میں قوم کی بے بسی کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ اسکی کیا وجہ ہے؟ اس کی سب سے بڑی وجہ ہماری پس ماندگی بتائی جاتی ہے۔ لیکن جس ملک میں افراطِ زر کے مظاہرے مختلف شکلوں میں روزانہ ہوتے ہوں۔ جی نہیں مانتا کہ مالی پس ماندگی والی بات ایسے ہی من وعن تسلیم کر لی جائے۔ دوسری وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اسے اب تک عوامی تعاون حاصل نہیں ہوتا۔ لوگ اپنے بچوں کو پڑھنے کے لیے بھیجتے ہی نہیں۔ یہ دونوں اور اس قسم کے دوسرے اسباب بنیادی سبب بن سکتے ہیں۔ لیکن ہماری تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ نہیں کہ ہمارے پاس مال و دولت کی کمی ہے یا یہ کہ عوام اس وقت تک اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کے حق میں بیدار نہیں ہو سکے۔ سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اب تک تعلیم کو تعلیم سمجھ کر اس کی منصوبہ بندی قومی ضروریات کے مطابق نہیں کی گئی۔ اور اگر اس قسم کی منصوبہ بندی کی گئی ہے تو اس پر عمل ہماری غفلت شعاری کی نذر ہو گیا۔

ابتدائی تعلیم ہمارے تعلیمی ایوان کی اساس نہیں بن سکی۔ ہم تعلیم کی ابتدا یونیورسٹی سے کرنے والے اور ضرورت کے مطابق نیچے اترتے رہتے ہیں۔ پہلے یونیورسٹی تعلیم۔ پھر ثانوی تعلیم اور پھر ابتدائی گویا درخت کی بالائی شاخ پر بیٹھے ہیں۔ اور ہمیں یہ معلوم نہیں کہ درخت کے پھیلاؤ کے نیچے کیا ہے؟ تازہ تازہ سبز ٹہنیاں یا افعی و عقرب۔ اس سے ایک خرابی یہ پیدا ہو گئی کہ ثانوی تعلیم یا یونیورسٹی کی ضروریات کے تابع ہو گئی اور ابتدائی ثانوی کے۔ اور ان مدارج کا جو نصابِ تعلیم مرتب ہوتا رہا اس نے کبھی ایک مربوط کل کی شکل اختیار نہ کی۔ موجودہ کمیشن نے اگرچہ ابتدائی تعلیم پر خاصہ زور دیا ہے لیکن فکری لحاظ بھی اس گروہ میں شامل ہیں۔ جو ایک جست میں درخت کی چوٹی پر پہنچ جانا چاہتے۔ لازمی ابتدائی تعلیم قومی ترقی کے لیے اتنی ضروری ہے جیسے انسانی زندگی کے لیے پانی، ہوا، خوراک۔ اس کے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہیں۔ صنعت و حرفت، تجارت ہر چیز تعلیم کے تابع ہے۔ جنہ

وہ جمہوریت اور وہ اسلامی اقدار جس کے ہم اتنے بڑے علم بردار ہیں۔ صحیح تعلیم کے بغیر ممکن نہیں لیکن لازمی ابتدائی تعلیم کا مسئلہ کسی فرد واحد کا مسئلہ تو ہے نہیں، یہ تو پوری قوم کا مسئلہ ہے اور اسے انفرادی نہیں اجتماعی طور پر حل کیا جا سکے گا۔ لیکن اس اجتماعی حل سے مراد تعلیمی مرکزیت نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنے اپنے حلقے میں ہر گروہ یا ہر جماعت اس کی توسیع و ترقی میں حصہ لے اور مرکزی اور صوبائی حکومتیں نہ صرف یہ کہ ان کے لیے مشعل ہدایت ثابت ہوں بلکہ مالی امداد بھی کریں۔

لازمی ابتدائی تعلیم کی جو کوششیں اس وقت تک کی گئی ہیں۔ ان کی ناکامی کی ایک وجہ والدین کے معاشی اور اقتصادی حالات ہیں۔ اس کا ایک حل گاندھی جی کی ودیا مندر اسکیم کا ہے کہ طلبہ کو صنعت و حرفت کی تعلیم دی جائے اور وہ جو سامان تیار کریں اسے فروخت کرکے سکول کے اخراجات پورے کیے جائیں۔ نظری لحاظ سے یہ بات بڑی اونچی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن عملی لحاظ سے اتنی ہی غلط۔ بچوں کی تیار کردہ چیزیں یقیناً اتنی اچھی نہیں ہوں گی کہ بازار میں انھیں دوسروں کی تیار کردہ چیزوں کے مقابلے میں بیچا جا سکے اور ابھی ہم اپنے ملک میں یہ رواج قائم نہیں کر سکے کہ جو کچھ ہم اندازہ کرتے ہیں۔ اس میں سے قومی تعلیم کا بھی کچھ حق ہے۔ اکثر والدین اپنے بچوں کو اس لیے مدرسوں میں نہیں بھیجتے کہ وہ تعلیم کو غیر منفعت بخش سمجھتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ ابتدائی مدارس کے نصاب کا مقامی ضروریات سے عاری ہونا ہے۔ اگر نصاب میں کچھ ایسی چیزیں شامل کر دی جائیں کہ آگے چل کر بچہ اپنی روزی بطریق احسن کما سکے تو اس کی طرف والدین کی عدم رغبت میں تبدیل ہو جائے گی۔

قومی تعلیمی کمیشن نے ابتدائی تعلیم کے مقاصد یہ بیان کیے ہیں:-

(۱) بچے کو عملی طور پر لکھا پڑھا بنانا۔

(۲) اس کی شخصیت کے اخلاقی، جسمانی اور ذہنی قوائی کو ترقی دینا۔

(۳) بنیادی علوم اور مہارتوں سے اس طرح آراستہ کرنا جو ایک فرد اور ایک شہری کے لیے ضروری ہوتا ہے اور پھر انھیں تعلیم مزید کے لیے تیار کرنا۔

(۴) اس میں شہری ذمہ داری اور ملک سے محبت کا شعور پیدا کرنا۔ اور انھیں اس حد تک

آمادہ کرنا کہ وہ از خود اس کی ترقی وتوسیع میں حصہ لیں۔

(۵) ان میں سخت کوشی، سالمیت کردار اور تجسس کے اوصاف پیدا کرنا۔

(۶) انھیں جسمانی عنایت اور کھیل کود سے رغبت دلانا۔

ان مقاصد کی توضیح کے بعد کمیشن نے ابتدائی تعلیم کے نصاب اور نظم ونسق کے متعلق کی ہے۔ ابتدائی تعلیم کا نظم ونسق اس وقت مقامی حکومتوں کے پاس ہے اور یہ انھیں ہے کہ اپنے اپنے حلقوں میں اسے عام کرنے کی کوشش کریں۔ کمیشن نے اس موضوع پر وبسط سے اس لیے نہیں لکھا کہ جب تک بنیادی جمہوریتیں بالعمل میدان میں نہ آجائیں اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن قرائن سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی تعلیم کے چھوٹے واحدے ہوں گے اور ہر واحدہ اپنی ضرورت کے مطابق اس کا انتظام کرے گا۔ اگر ان واحد اختیارات کے ساتھ ساتھ نصاب کی ترتیب وتدوین کی بھی آزادی دی جائے تو زیادہ بہتر کام کمیشن نے نصاب کو ترتیب وتدوین کے سلسلہ میں جو سفارشات کی ہیں ان کا مقصد یہی ہے بچہ پڑھائی جائے وہ ان کے مزاج اور عمر کے مطابق ہو اور یہ باتیں انھیں اس انداز اور پڑھائی جائیں کہ باتوں باتوں میں بہت سی کام کی باتیں بتا دی جائیں۔ کھیل کھیل میں انھیں سکھا دیا جائے۔ اس سلسلے میں یہ ضروری ہے کہ مدرس میں خود تخلیقی اہلیت ہو۔ اختر عادی ہو اور مقامی ساز وسامان سے ضرورت کی چیزیں بنا سکتا ہو۔ نصاب کی دوسری ما دینی تعلیم اور قومی زبان کی تحصیل وتکمیل پر زور دینا ہے۔ اور یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب آزادی حاصل ہو۔

نصاب اور نظم ونسق سے قطع نظر ابتدائی تعلیم میں سب سے نمایاں حیثیت مدرس کی اس وقت ابتدائی مدارس کے مدرسین کی جو حالت ہے اسے اطمینان بخش ہرگز نہیں کہا تعلیمی حالت اتنی اچھی ہوتی ہے اور نہ مالی۔ لیکن وہ پڑھا بھی لیتے ہیں اور زندہ بھی رہتے ہیں اپنی زندگی کی معراج سمجھ رہے ہیں۔ کمیشن نے اساتذہ کی تربیت پر بالخصوص خاصی توجہ دی

سفارش کی ہے کہ اساتذہ کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے۔ اور چند اچھے اساتذہ کی خدمات کو سرکاری طور پر تسلیم کر کے انھیں انعام بھی دیا جائے۔

ابتدائی تعلیم کی توسیع و ترقی کا مسئلہ آتنا اہم مگر آتنا پیچیدہ ہے کہ اس کے لیے حکومت اور قوم کو بڑی جانکاہی سے کام لینا ہوگا۔ حکومت خود آتنا روپیہ صرف نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے دوسرے وسائل سے روپیہ جمع کرنے کی ضرورت ہوگی۔ کمیشن نے سفارش کی ہے کہ ابتدائی تعلیم کے لیے مقامی لبستی، زمین، عمارت، فرنیچر، سامان تدریس، اساتذہ کے مکانات خود فراہم کرلے۔ حکومت محض بعض پسماندہ علاقوں کی امداد کیا کرے گی۔ اس کے بعد جو اخراجات ہوں گے انھیں پورا کرنے کے لیے مقامی تعلیمی حکومت دو ذریعوں سے رقم حاصل کر سکے گی۔ پچاس فی صد براہ راست محصول سے اور پچاس فی صد سرکاری خزانے سے۔

کمیشن نے ابتدائی تعلیم کی مدت عبوری دور میں پانچ سال مقرر کی ہے۔ اس کے بعد یہی مدت آٹھ سال ہو جائے گی۔ یعنی جو بچہ ۵+ کی عمر میں داخل ہوگا وہ ۱۲+ کی عمر تک ابتدائی مدرسے میں تعلیم حاصل کرے گا اور ۱۳+ میں کسی ثانوی مدرسے میں داخل ہوگا اور ۱۶+ کی عمر تک تعلیم حاصل کرتا رہے گا۔ اس طرح نئے نظام تعلیم میں تعلیمی زینہ (Education Ladder) اس قسم کا ہوگا۔

ابتدائی	۵+ تا ۱۲+	کل مدت	۸ سال	}	۱۵ سال اور اس وقت طالب علم کی عمر ۲۰ سال ہوگی۔
ثانوی	۱۳+ تا ۱۶+	کل مدت	۴ سال		
اعلیٰ	۱۷+ تا ۱۹+	کل مدت	۳ سال		

ابتدائی تعلیم لازمی مفت اور عالم گیر ہوگی۔ پہلا عبوری دور دس سال کا ہوگا۔ اور اس میں لازمی تعلیم کی مدت پانچ سال ہوگی۔ دوسرا دور پانچ سال کا ہوگا۔ اس میں مدت تعلیم بڑھا دی جائے گی۔ حتیٰ کہ پانچویں سال کے آخر میں مدت تعلیم آٹھ سال ہو جائے گی۔

ثانوی تعلیم

ثانوی تعلیم کا نظام بھی انھی خرابیوں کا حامل ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اسے اس طرح یونیورسٹی کے تابع بنا دیا گیا کہ اس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی اور اس کا تمام تر مقصد طلبہ کو یونیورسٹی میں

اغلے کے لیے تیار کرنا رہ گیا۔ یہ صورت حال پچھلی صدی میں شروع ہوئی اور ہنوز جاری ہے۔ جو طالب علم
سکول میں پڑھتا ہے اور اس کے وسائل اسی قسم کے ہیں کہ وہ تعلیم جاری رکھ سکتا ہے تو وہ کسی کالج
میں داخل ہو جاتا ہے اور لیس۔ اس سے نہ آج تک مقاصد کی تعیین ہو سکی ہے اور نہ یہ تعیین ہو سکا
ثانوی تعلیم کس قسم کی اور کس طرح دینی چاہیے۔ اس طرح تعلیم کا ڈھانچہ ایک سار یا یعنی خالص علمی —
اس میں ٹیکنیکل مضامین کو دخل نہ حاصل ہو سکا۔ ٹیکنیکل مضامین کے شامل نصاب نہ ہونے کی ایک
وجہ یہ ہے کہ خود انگلستان میں ان مضامین کو خارج از نصاب سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ
ہندوستان میں کوئی نئی ریت کیونکر پڑتی تھی۔

ثانوی تعلیم پر ایک بڑا اعتراض یہ رہا ہے کہ یہ ہماری قومی ضروریات کو پورا نہیں کرتی۔ اور اگر اس
ضمن میں کوئی کوشش کی گئی تو یونیورسٹی کے سخت اصولوں کے پیش نظر مجوزہ اصلاح، اصلاح کی حد سے
آگے نہ بڑھ سکے۔ اس طرح ان ثانوی مدارس میں کلرکوں کی قوم پلتی رہی اور انھی میں اکادکا ایسے
طالب علم بھی مل جاتے تھے جو بعض دوسرے پیشوں میں نکل جاتے تھے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ثانوی
مدارس کا نصاب نہ کثیر الفروع ہے اور نہ پیشہ ورانہ ضروریات کا حامل۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر طالب علم
بے مقصد اعلیٰ ڈگری کے حصول کے لیے پڑھتا رہا۔ ڈگری مل گئی لیکن جب وہ بازار عمل میں پہنچا تو معلوم ہوا
کہ یہ کوئی ایسی جنس گراں مایہ نہیں کہ اس کے اچھے دام لگیں اور جب اسے مایوس ہونے لگتی ہے تو ادنے
پونے بیچ کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ اس سے ایک نقصان یہ ہوتا کہ جن طلبہ کو اپنی توقعات کی مسند سے اتر کر
نیچے آنا پڑتا ہے وہ محض مجبور ہو کر ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ اور کسی کام کو اس انداز سے نہیں کرتے کہ یہ
ان کا فرض ہے۔ بلکہ ان کا مقصد محض وقت گذاری ہوتا ہے۔

تعلیمی کمیشن مجریہ ۱۸۸۲ء سے لے کر اس وقت تک ثانوی تعلیم کو زندگی سے قریب تر لانے کی
متعدد کوششیں کی گئیں۔ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن نے اس کا تفصیلی جائزہ لیا اور اس کے لیے ایک راہ عمل تجویز کی
ہارٹاگ کمیٹی نے بھی اس کی تعمیر نو کے متعلق کچھ سفارشات کیں۔ لیکن ان تجویزوں اور سفارشوں کے باوجود
ثانوی تعلیم کے نظام میں کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔ اس کے بہت سے اسباب تھے۔ کچھ سیاسی اور کچھ مالی۔

ور اقتصادی زندگی اس ڈگر پر یوں ہی چلتی رہی۔ تا ایں کہ ۱۹۴۴ء میں مرکزی مشاورتی بورڈ نے اپنی تجویزیں پیش کیں۔ دراصل ثانوی تعلیم کو تنظیم نو کی یہ تجویز بہ بعض لحاظ سے منفرد تھیں کہ اس سے پہلے حکومت نے اسے اپنی حکمت عملی کے طور پر کبھی اپنانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن اصلاح و تعمیر کی یہ آواز اب خود حکومت کے ایوان سے بلند ہوئی تھی۔ اس سے کچھ اور فائدہ ہوا یا نہیں۔ لیکن اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ثانوی تعلیم میں جو جمود پیدا ہو چکا تھا وہ ٹوٹ گیا اور لوگوں نے پرانی متعینہ راہ سے ہٹ کر بعض دوسرے امکانی راستوں کی جستجو شروع کر دی۔

مرکزی مشاورتی بورڈ کی ان تجویزوں میں ہنوز عمل کا آب و رنگ نہ بھرا جا سکا تھا کہ ملک تقسیم ہو گیا۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر اس وقت تک پاکستان میں تعلیمی اصلاح کے متعلق معلوم نہیں کتنی کانفرنسیں ہوئیں اور ہر کانفرنس میں بلند بانگ قرارداد منظور کی گئی۔ لیکن ان پر نیک نیتی سے کبھی عمل نہ ہو سکا، حتیٰ کہ اس کی زد میں پانچ سالہ منصوبے کا تعلیمی پروگرام بھی آ گیا۔ اور پچھلے پانچ سال میں بھی ثانوی مدارس مختلف النوع نصاب سے متعارف نہ ہو سکے۔

قومی تعلیمی کمیشن مجریہ ۱۹۵۹ء نے بھی ثانوی تعلیم کی تعمیر نو کے متعلق کچھ تجویزیں پیش کی ہیں۔ ان میں سے بعض تجویزیں ایسی ہیں کہ اگر ان پر نیک نیتی سے عمل کیا گیا تو نہ صرف یہ کہ ثانوی تعلیم کے مزاج و آہنگ میں تبدیلی پیدا ہو جائے گی بلکہ اس کا براہ راست اثر اعلیٰ تعلیم پر بھی پڑے گا۔ اس وقت تک ثانوی تعلیم کی اپنی علیحدہ کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کمیشن نے اسے بجائے خود ایک درجہ تسلیم کر کے اسے ایک حیثیت دی ہے اور یہ سفارش کی کہ ثانوی تعلیم کا علمی اور انتظامی لحاظ سے یونیورسٹی سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ یونیورسٹی میں صرف وہی طلبہ جائیں گے جو اعلیٰ تعلیم سے منفعت بہ فائدہ اٹھا سکیں گے۔ باقی دوسرے طلبہ کی تعلیم یہیں ختم ہو جائے گی اور وہ مختلف پیشوں میں کھپ جائیں گے۔

چار سالہ ثانوی مدرسہ

ہمارے نظام تعلیم میں انٹرمیڈیٹ کو ایک عجیب مقام حاصل ہے۔ چناں چہ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن سے لے کر قومی تعلیمی کمیشن تک اس موضوع پر بحث ہوتی آئی ہے۔ دراصل انٹرمیڈیٹ ایک تاریخی حادثے

کی یادگار ہے۔ انیسویں صدی کے ربع سوم میں جب ہندوستان میں یونی ورسٹیاں قائم ہوگئیں تو برطانوی یونی ورسٹی کے اتباع میں ان کے یہاں بھی میٹرکولیشن کے بعد بی۔ اے کا کورس چار سال کا کر دیا گیا لیکن کچھ دنوں بعد یہ محسوس کیا گیا کہ طالب علم جو کچھ پہلے تین سال پڑھتا، چوتھے سال بھول جاتا ہے اس کی ایک وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ چوں کہ طلبہ کو انگریزی پر اتنی دسترس حاصل نہیں ہوتی، اس لیے ایسا ہو جائے۔ چناں چہ اس صورت حال کو ختم کرنے کے لیے یہ تجویز پیش کی گئی کہ بی اے کا امتحان دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ پہلا امتحان دو سال بعد ہوا اور دوسرا چار سال بعد۔ طالب علم دوسرے امتحان میں اس وقت شریک ہو سکتا ہے جب اسے پہلے میں کامیابی حاصل ہو جائے۔ یہ پہلا امتحان ایف۔ اے یا فرسٹ ایگزیمینیشن ان آرٹ (First Examination in Arts) کہلایا اور بعد میں یہی انٹرمیڈیٹ بن گیا۔

کلکتہ یونی ورسٹی کمیشن نے انٹرمیڈیٹ کو ڈگری کلاسوں سے الگ کرکے ایک دو سالہ ادارہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ سارجنٹ رپورٹ میں انٹرمیڈیٹ کے ایک سال کو اسکول اور دوسرے سال کو یونی ورسٹی میں شامل کر دیا۔ قومی تعلیمی کمیشن نے اس کا صحیح جائزہ لیا اور عبوری دور گذرنے کے بعد ایک چار سالہ ثانوی مدرسے کے قیام کی سفارش کی۔ یہ چار سالہ مدرسہ مروجہ نویں، دسویں، گیارھویں اور بارھویں جماعتوں پر مشتمل ہوگا۔ اور اس کا نصاب کثیرالنوع اور کثیرالفروع ہوگا۔

ہمارے نظامِ تعلیم میں اس وقت جن مدرسوں پر تعلیم کا بار امانت ہے وہ خالص علمی ہیں۔ کمیشن نے ان خالص علمی مدرسوں پر تجدد کی روح پھونکنے کی کوشش کی ہے تاکہ آگے چل کر یہ مدرسے مقصود بالذات بن جائیں اور انھیں اپنے پیشے میں پوری پوری کامیابی حاصل ہو اور وہ بے جا طور پر محض یونی ورسٹی ڈگری کے حصول کے لیے یونی ورسٹی میں داخلے کی کوشش نہ کریں۔ بلکہ اپنے ذوق کے مطابق ایسی چیز میں مکمل دسترس یا ملکہ حاصل کرلیں کہ وہی ان کا پیشہ بن جائے۔ برطانیہ اور امریکہ میں ثانوی تعلیم کا انتظام ہمارے ثانوی مدارس سے بالکل مختلف ہے۔ انتظامی لحاظ سے یہ ثانوی مدارس کاؤنٹی کونسل یا مقامی تعلیمی حکومت کے تابع ہوتے ہیں لیکن نصاب کے لحاظ سے ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل خود صاحب اختیار

ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اساتذہ کی تقرری بھی ادارے کے سربراہ کا براہ راست ہاتھ ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات جو انھیں اوروں سے ممتاز بنا دیتی ہے ان کا ذوق تجربہ ہے۔ تعلیمی، تدریسی اور علمی تجربے ان اداروں کے معمولات میں سے ہے۔ ظاہر ہے کہ تحقیق و تجسس میں خسارہ نہیں ہوتا۔ ہمارے یہاں اس قسم کا ایک تعلیمی تجربہ بہاولپور مکتب اسکیم کا کیا گیا ہے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ محکمے کے بعض انگریز پرست طبقے نے اس کی مخالفت کی۔ انگریزی کی روح تجربہ ہے۔ لیکن وہ اپنی نادانی میں اس کی روح کو سلب کرنے کے در پے ہے۔

امریکی مدرسے بالعموم کثیر الفراغ ہوتے ہیں۔ برطانیہ میں ابھی تین قسم کے علیحدہ علیحدہ ادارے قائم ہیں۔ گریمر اسکول۔ سکینڈری ماڈرن اسکول، اور ٹیکنیکل اسکول۔ اب ایک چوتھی قسم کا اسکول وجود میں آرہا ہے جسے ان تینوں اداروں کا مجموعہ کہنا چاہیے۔ یہ جامع مدرسہ یا (Comprehensive School) ہے اور امریکہ کے کثیر المقاصد ادارے کا ترمیم شدہ تجربہ۔ قومی تعلیمی کمیشن نے بھی اس ملک میں جامع مدرسہ یا کثیر المقاصد مدرسے کے قیام کی سفارش کی ہے۔ اس کے لیے حکومت نے دونوں صوبوں میں علیحدہ علیحدہ ایجوکیشن، اکسٹنشن سنٹر (Education Extension Centre) قائم کیے ہیں۔ ان دونوں سنٹرز کا کام ہیڈ ماسٹروں اور انسپکٹروں کے لیے تجدیدی کورس کے اہتمام کے علاوہ کثیر المقاصد پائلٹ اسکول قائم کرنا اور ان کے اساتذہ کو جدید تدریسی تکنیک کی تربیت دینا ہے۔ مغربی پاکستان میں اس سال چھے ہائی سکولوں کو پائلٹ سکولوں میں تبدیل کرنے کی تجویز ہے۔ ان چھے میں وحدت کالونی لاہور کے بچوں اور بچیوں کے اسکول بھی شامل ہیں۔ دس سال کی مدت میں توقع کی جاتی ہے کہ ہر مدرسہ جامع مدرسہ بن جائے گا۔

ثانوی مدارس کے عمومی نصاب میں قومی زبان، سائنس اور ریاضی پر بالخصوص توجہ دینے کی سفارش کی گئی ہے۔ اس نصاب میں دینی تعلیم اور انگریزی زبان بھی شامل ہوگی۔ لیکن اب اس کا مقصد انگریزی ادب پڑھانا نہیں ہوگا۔ بلکہ کاروباری انگریزی زبان جس کی بدولت طالب علم اچھے مضمون کے متعلق انگریزی زبان میں کتابیں پڑھ سکے۔

نظم ونسق اور مالیات | اس وقت نظم ونسق کے لحاظ سے ثانوی مدارس کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک

حکومت کے اپنے مدرسے، دوسرے مقامی انجمنوں کے، تیسرے ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل بورڈ کے ان تینوں قسم کے مدرسوں کا نظم ونسق مختلف ہے۔ سرکاری مدرسوں میں تو ایک قسم کی انتظامی یک جہتی نظر آتی ہے کہ یہ سب محکمۂ تعلیم کے ماتحت ہوتے ہیں۔ لیکن دوسرے مدارس میں سوائے اس کے کہ ایک قسم کا نصاب پڑھایا جاتا ہے اور کوئی مماثلت نظر نہیں آتی۔ سرکاری مدرسوں کے اخراجات کی کفالت حکومت کی ذمہ داری ہے۔ دوسرے قسم کے مدرسوں کو حکومت صرف امداد دیتی ہے۔ باقی خرچ فیسوں اور مخیر حضرات کے عطیات سے پورے ہوتے ہیں۔ کمیشن نے ثانوی مدارس کی تنظیم نو کے سلسلے میں یہ سفارش کی ہے کہ سکول کے جملہ اخراجات کی کفالت کے لیے تین ذرائع ہوں گے اول فیس (جو ضرورت کے وقت بڑھائی جا سکتی ہے) دوم انتظامیہ کے عطیات اور سوم سرکاری زر امداد جس میں فیس سے ۷۰ فی صد، انتظامیہ کے عطیات سے ۲۰ فی صد اور سرکاری زر امداد سے ۱۰ فیصد رقم حاصل کی جا سکے گی۔

ٹیکنیکل تعلیم

ٹیکنیکل تعلیم بھی ثانوی تعلیم کا ایک جزو ہے اور اسے اس سے علیحدہ نہیں کرنا چاہیے۔ اس وقت ملک صنعت وحرفت کے لحاظ سے ترقی کر رہا ہے۔ ملکی صنعت اور تجارت کو فروغ دینے کے لیے ہمیں اچھے صنعت کاروں اور ریپک دست تاجروں کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو ہمیشہ محسوس کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے اہتمام والتزام کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ کمیشن نے ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ تعلیم کی اہمیت کے پیش نظر پالی ٹکنکس، ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ اور پیشہ ورانہ سکول قائم کرنے کی سفارش کی ہے جس میں مختلف پیشوں کی تربیت کا معقول انتظام ہوگا۔ کمیشن نے ۲۵ پیشوں کا فرداً فرداً ذکر کیا ہے۔ اور وضاحت سے بیان کیا ہے کہ ایک طالب علم اپنی پیشہ ورانہ تربیت کی طرح مکمل کرکے اپنی روزی کما سکتا ہے۔

ان اداروں کی مدت تعلیم تین سال ہوگی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی ایک خصوصیت یہ ہوگی کہ ان میں طلبہ شام کو بھی تعلیم حاصل کر سکیں گے۔ اور ان طالب علموں کے پڑھنے کا بھی انتظام ہوگا۔

جو اپنی تعلیم پر پورا وقت صرف نہیں کر سکتے. بلکہ اپنی کفالت کے لیے انھیں کمانا بھی پڑتا ہے.

ان پیشہ ورانہ اداروں کو مغربی پیشہ ورانہ اداروں کے نمونے پر قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ خیال بُرا نہیں ہے. لیکن اس وقت ملک صنعت و حرفت کے لحاظ سے اتنا ترقی یافتہ نہیں ہے کہ ہم اسے اس نہج پر قائم کر سکیں. اس میں وقت لگے گا اور کافی وقت۔

یونی ورسٹی تعلیم

جب سے اس ملک میں جدید قسم کی یونی ورسٹیاں قائم ہوئی ہیں. ان یونی ورسٹیوں کے فارغ التحصیل طلبہ کا منتہائے نظر سرکاری ملازمت رہا. اس عمومی رجحان کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کا نصاب تعلیم ہی اس قسم کا تھا کہ انھیں اس کے سوا کوئی اور کام کرنا سکھایا ہی نہیں جاتا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کی اصلاح کے لیے وقتاً فوقتاً کمیشن اور کمیٹیاں مقرر ہوتی رہیں اور غالباً سب سے زیادہ کمیشن بازی یونیورسٹی تعلیم ہی کے سلسلے میں ہوئی. لیکن ان کمیشن کی سفارشات کے باوجود یونی ورسٹی کے نظم ونسق اور اعلیٰ تعلیم کے مقاصد میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔

یونی ورسٹی ڈگری ہنوز ملازمت کی سند سمجھی جاتی ہے اور ہر شخص اندھا دھند پڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس خرابی کی سب سے بڑی وجہ ثانوی تعلیم کا ناقص انتظام اور تعلیم کا ملک کی اقتصادیات اور ملازمت کے مسائل سے بے تعلق اور بے نیاز ہونا ہے. اگرچہ پچھلے پانچ چھے سال سے منصوبہ بندی کا رواج ہو گیا ہے اور ملک کے مختلف مسائل کو قومی ترقی پر صرف کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے. لیکن ہنوز ہم تعلیمی ضروریات کی منصوبہ بندی نہیں کر سکے۔ ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ ہمیں انجنیر یا تعلیمی کارکنوں کی ضرورت ہے. لیکن اب تک ہم یہ تعین نہیں کر سکے کہ کسی شعبۂ زندگی میں کس قسم کے آدمیوں کی کتنی ضرورت ہے اور اس کی تعین ہو جائے تو اعلیٰ تعلیم کی یہ بے مقصدی ختم ہو جائے اور وہ اچھے کارکن پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ علمی تحقیق و تدقیق پر بھی توجہ دے جو ہر یونی ورسٹی کا ایک اہم اور ضروری کام ہے۔

قومی تعلیمی کمیشن نے اعلیٰ تعلیم کو اتنی فوقیت دی ہے کہ ترتیب کے لحاظ سے اس پر ثانوی اور ابتدائی تعلیم سے پہلے بحث کی گئی ہے. اگرچہ کسی ایک خاص ترتیب کا ملحوظ رکھنا ضروری نہیں ہوتا

لیکن پھر بھی پہلے باب میں اعلیٰ تعلیم کا ذکر نظریہ تعاط کی تہ تنقید کہ ہماری تعلیم ایک منقلب اہرام ہے
ہم نے گویا اس امر پر مہرِ توثیق ثبت کردی۔ ہم پہلے عمارت کے کنگرے اور بام و در بنانے کے آرزومند
ہیں۔ بنیاد بعد میں رکھ لیں گے۔

کمیشن نے اعلیٰ تعلیم کی اصلاح کا جو خاکہ پیش کیا ہے۔ اس میں بعض باتیں تو وہی ہیں جن کا ذکر
کلکتہ یونیورسٹی کمیشن اور مرکزی مشاورتی بورڈ کی رپورٹ کے تحت آ چکا ہے۔ بعض اصولاً وہی ہیں لیکن
ان کی تفصیلات میں اختلاف ہے۔ ڈگری کورس کی مدت تین سال تجویز ہوتی آئی۔ مگر اس پر کبھی عمل
نہیں ہوا تھا۔ کمیشن نے بھی ڈگری کورس کی مدت تین ہی سال تجویز کی۔ اور اگرچہ ابھی اس کی بعض سفارشات
پر عمل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ لیکن یونیورسٹی نے ڈگری کی موجودہ مدت میں ایک سال کا
اضافہ کر دیا ہے۔ اور اب بجائے دو سال بعد امتحان ہونے کے ہر سال امتحان ہوا کرے گا۔

یونیورسٹی ڈگری کا علمی معیار بڑھانے کا یہ ایک طریقہ ہے لیکن واحد طریقہ نہیں۔ اس کے لیے
نصاب کا معیاری ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ اور نصاب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ جو لوگ
اس نصاب کو پڑھا رہے ہیں وہ کس معیار کے ہیں۔ اس وقت بی۔ اے اور ایم۔ اے کے مدارج
تعلیم کا جو معیار ہے وہ بہرصورت مستحسن نہیں اور ایک مختصر سی اقلیت کے علاوہ عمومی طور پر علم
پختگی پیدا ہونے نہیں پاتی۔ امتحان پاس کرنے کے کچھ گُر ہوتے ہیں اور انہی گُروں کی بدولت وہ امتحان
میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

سیمینار اور ٹیوٹوریل۔

کمیشن نے طلبہ کی تشویقِ ذہنی کو قائم رکھنے کے لیے سیمینار اور ٹیوٹوریل پر خاص توجہ دی ہے۔
اور ٹیوٹوریل کا ایک فرسودہ سا نظام تو اس وقت بھی قائم ہے مگر وہ اتنا رسمی ہوتا ہے اور اس کے لیے
اتنا تھوڑا وقت ہوتا ہے کہ اس میں کوئی مفید کام نہیں ہو سکتا اور کم از کم طالب علم اور استاد کے
درمیان کوئی ذہنی ارتباط قائم نہیں ہونے پاتا۔ اس ذہنی ارتباط کے قائم ہونے میں وقت لگتا
اور یہ اس وقت ممکن ہے جب دونوں ایک دوسرے کے موقف کو سمجھنے کے لیے آمادہ

اس وقت استاد کی صورت یہ ہے کہ اسے اپنے طالب علم سے کوئی لگاؤ نہیں۔ شاید وہ اسے بڑھتا پھیلتا نہیں دیکھ سکتا ہے تو اس کی کیفیت اس باغبان کی سی ہے جو ہر پودے کو اپنے طور پر بڑھنے کی اجازت دے دیتا ہے اس کی قطع برید سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ اگر اس کی ایک شاخ ٹیڑھی ہو گئی ہے تو اس سے اس کی خوش مذاقی کو ٹھیس نہیں لگتی۔ اس کے ساتھ ساتھ طالب علم کی روش بھی کچھ زیادہ قابل ستائش نہیں۔ اول تو اسے پڑھنے سے رغبت ہی نہیں ہوتی اور بالفرض اگر ہوتی ہے تو وہ تہہ آب سے موتی نکالنے کی بجائے کنارآب خزف ریزے چنتا رہتا ہے۔ اور انھیں موتی سمجھ کر اپنی کلاہِ تفاخر میں ٹانک لیتا ہے۔

کمیشن نے اس صورتِ حال کو دور کرنے کے لیے سیمینار اور ٹیوٹوریل سسٹم کی از سرِ نو تنظیم کا خاکہ پیش کیا ہے۔ اس سے دونوں کے مابین زیادہ گہرے روابط قائم ہونے کی توقع ہو سکتی ہے۔ اس سے علمی معیار بھی بڑھ جائے گا اور طالب علم کی عمومی تربیت پر بھی خوش گوار اثر پڑے گا۔

امتحانات

یونی ورسٹی کا نام آتے ہی امتحان کا تصور ذہن میں آجاتا ہے۔ گویا یونیورسٹی امتحان اور امتحان یونی ورسٹی ہے۔ اور یہ امتحان کچھ اتنے عجیب و غریب ہوتے ہیں کہ اگر طالب علم تین گھنٹے بیٹھ کر کچھ لکھ گئے تو عالم اور اگر بعض اسباب کی بنا پر نہ لکھ سکے تو جاہل۔ اسی طرح ایک نہیں سینکڑوں طلبہ کی زندگی خراب ہوتی رہتی ہے۔ لیکن یونیورسٹی نے یہ کبھی نہیں دیکھا کہ طالب علم نے کیا کام کیا ہے؟ کتنا کام کیا ہے؟ اس کی ذہنی اور تخلیقی صلاحیتوں کا معیار کیا ہے؟ کمیشن نے امتحان کے اس نظام کو یکسر مسترد تو نہیں کیا۔ لیکن ہر پرچے میں ۲۵ فی صد نمبر اساتذہ کے لیے مخصوص کر دیے ہیں۔ یہ ایک اچھا اقدام ہے۔ بشرطیکہ اس پر نیک نیتی سے عمل درآمد ہوا۔

علمی تحقیقات

یونی ورسٹی کا سب سے اہم کام علمی تحقیقات ہے۔ ڈگری کورس کی ترتیب و تدوین اور اس کی تدریس بھی ایک کام ہے۔ لیکن علم کے مختلف موضوعات پر تحقیق کرنا اس سے کہیں زیادہ اہم

کام ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں میں تعلیم کا منتہا محض ڈگری کورس کا پڑھا دینا ہی سمجھا جانے لگا تھا اس سے ایک قباحت یہ پیدا ہو گئی کہ علمی تحقیق کا کام کم و بیش موقوف ہو گیا۔ کہیں دو تین سال بعد کوئی تحقیقی مقالہ منظر عام پر آ گیا تو اس لیے نہیں کہ یونی ورسٹی نے اس کے لیے خاص اہتمام کیا تھا۔ اس کے منظر عام پر آنے کی وجہ خود طالب علم اور اس کا ذوق کار ہے۔ کمیشن نے تدریس و تحقیق کو لازم و ملزوم قرار دے کر اسے یونی ورسٹی کا سب سے بڑا فرض قرار دیا ہے۔

کتب خانے اور تجربہ گاہیں۔

تعلیم و تدریس اور تحقیق کا کام اس وقت تک صحیح معیار پر قائم نہیں کیا جا سکتا جب تک اچھے اساتذہ کے ساتھ ساتھ اچھا کتب خانہ اور اچھی تجربہ گاہ نہ ہو۔ ہماری یونی ورسٹیوں میں دونوں کے متعلق خاصی شکایت رہتی ہے۔ لیکن اب توقع کی جاتی ہے کہ کتب خانوں اور تجربہ گاہوں کا انتظام پہلے کی نسبت زیادہ بہتر ہوگا۔ اور اگر ایسا ہو جائے تو یہ قومی تعمیر و ترقی کی بہت بڑی ضمانت ہے۔

ذریعہ تعلیم

ذریعۂ تعلیم انگریزی ہو یا اردو یہ ویسے تو ایک متنازعہ فیہ مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن اسے متنازعہ فیہ بنا دیا گیا ہے۔ آج سے تقریباً سو برس پہلے انجمن پنجاب نے لاہور میں ایک اردو یونی ورسٹی کے قیام کی تحریک چلائی تھی۔ لیکن چوں کہ حکومت اردو کو فروغ دینے کے حق میں نہ تھی، اس لیے پنجاب میں اس وقت تک یونی ورسٹی کے قیام کی تجویز کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ جب تک خود خواستگاران اردو نے اپنے مطالبے پر نظر ثانی نہیں کی۔ چناں چہ ۱۸۸۲ء میں جو یونی ورسٹی قائم ہوئی اس کا ذریعۂ تعلیم اردو نہیں انگریزی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس وقت سے لے کر اس وقت تک لاہور کو اردو کے ایک بہت بڑے مرکز ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔

کمیشن نے اپنا فیصلہ قومی زبان کے حق میں دیا ہے۔ مگر یہ فیصلہ "اگر اور لیکن" کی قیود میں اس طرح جکڑ دیا گیا ہے کہ اس سے اردو کو ذریعۂ تعلیم بننے میں خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پھر بھی یہ توقع ہے کہ ہماری اپنی ضروریات ہمیں اردو کے حق میں فیصلہ دینے پر مجبور کر دیں گی۔ اردو کو

آج تک کسی حکومت کی سرپرستی حاصل نہیں رہی۔ لیکن اسے عوامی سرپرستی ضرور حاصل رہی اس لیے اس نے اپنا حق سب سے منوا لیا۔ ان سے بھی جو اس کے منکر ہیں اور اس سلسلے میں بھی وہ ایک دن اپنا حق ضرور منوا لے گی۔

تعلیم کا یہ مختصر سا خاکہ ہماری فتح و شکست کی داستان ہے۔ اس کی اصلاح کے لیے فرزانوں کے ساتھ ساتھ دیوانوں کی بھی ضرورت ہے۔ بلکہ فرزانوں سے زیادہ دیوانوں کی جو اس کے بے روح جسم کو زندگی کی توانائی کے ساتھ ساتھ اپنا جذبۂ شوق اور اپنا سوز و ساز بھی بخش دیں ؛

تعلیم و تربیت

رحمت الٰہی منوّر

اچھی سیرت اور اعلیٰ کردار کی تعمیر ہمیشہ سے اچھی تعلیم کے مقاصد میں شامل رہے ہیں۔ لیکن موجودہ دور میں ہمارے نظامِ تعلیم میں سب سے بڑی خامی یہی ہے کہ اس میں تربیت کا پہلو مفقود ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ بڑے بڑے تعلیم یافتہ حضرات بھی علم سے مراد صرف تعلیم لیتے ہیں۔ حالانکہ علم ایک وسیع اصطلاح ہے۔ تعلیم اگرچہ علم کا ایک پہلو ضرور ہے۔ لیکن صرف تعلیم کو ہی علم کا نام نہیں دیا جا سکتا تعلیم کے علاوہ علم کا ایک دوسرا پہلو بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اول الذکر پہلو اور وہ ہے تربیت وہ علم، علم کہلانے کا مستحق نہیں جس میں موخر الذکر پہلو کو نظر انداز کر دیا جائے۔ تعلیم و تربیت کا آپس میں تعلق جسم اور روح کے تعلق کے مصداق ہے۔ اگر تعلیم کو جسم فرض کیا جائے اور تربیت کو روح کی مشعل قرار دیا جائے تو یہ چیز زیادہ واضح ہو جاتی ہے جس طرح انسانی زندگی کے لیے جسم میں روح کا ہونا لازمی ہے اسی طرح صحیح معنوں میں علم کے حصول کے لیے تعلیم کے ساتھ تربیت کا تعلق بہت اہم ہے تعلیم سے ہم اسی وقت استفادہ کر سکتے ہیں جب ہم تربیت کو اس کا لازمی جزو قرار دیں وگرنہ بقول سعدی رحمۃ اللہ علیہ

الٰہی صد دبیقی و دیبا   گر ہمہ علم عالمیت باشد

گر بپوشد خری امست عتابی   بے عمل مدعی و کذابی

ظاہر ہے کہ ایک جاہل انسان اپنے آپ کو زرق برق لباس میں ملبوس کرے تو وہ عالم نہیں بن سکتا۔ اس طرح بے عمل شخص دنیا کے تمام علوم پر دسترس رکھنے کے باوجود بھی عالم نہیں کہلا سکتا اگر وہ اس کا دعویٰ کرتا ہے تو سراسر جھوٹ ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی   یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

ہمارے ملک کے تعلیمی اداروں میں تعلیم کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ بچوں کو تعلیم دیتے وقت تربیت کو طاق نسیاں بنا دیا جاتا ہے۔ وہ عقلمند شخص جسے خداوند تعالیٰ نے صحیح قسم کی بصیرت عطا کی ہے کبھی اس چیز کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ تعلیم کا واحد مقصد یہ ہے کہ جب ہمارے نوجوان فارغ التحصیل ہوں تو وہ صحیح معنوں میں انسان بن جائیں وہ اعلیٰ کردار کا نمونہ ہوں۔ وہ قوم ملت کے لیے قابل فخر انسان ہوں جنھیں ہر وقت اپنے سے زیادہ دوسروں کی بھلائی کا خیال رہتا ہو، جو اپنے مفاد کو دوسروں کے مفاد پر قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ جو بڑوں کا احترام کریں اور چھوٹوں سے شفقت سے پیش آئیں اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ایسے مثالی کردار کیوں کر پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ خود ایسے کردار کا حامل ہو جو دوسروں کے لیے قابل رشک ہو۔ ایک ستھرا معاشرہ اسی وقت تخلیق ہو سکتا ہے جب بچوں کی تعلیم کے ساتھ ان کے کردار کو سنوارا جائے۔ ان میں زمانہ طالب علمی سے ہی اچھی عادتیں ڈالی جائیں۔ تاکہ وہ بڑے ہو کر دیانتدار، محنتی، فرض شناس اور کامیاب شہری بن سکیں ہماری قومی اصلاح کا مرکز صرف مدرسہ ہے اور اس قومی اصلاح کے ذرائع کا سب سے اہم کردار خود استاد ہے۔ پاکیزہ معاشرہ اسی وقت تیار ہو سکتا ہے جب استاد خود اعلیٰ کردار کا مجسم نمونہ ہو اور وہ طلبہ کی تعلیم کے ساتھ ان کی تربیت کا بھی خاطر خواہ دھیان رکھے ورنہ قومی اصلاح کا یہ خواب کبھی بھی تعبیر نہیں ہوگا۔

جو تعلیم ذہنی ادراک پر ختم ہو جائے وہ صحیح قسم کے کردار کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ مختلف علوم کی ماہیت کو سمجھ لینا اور ان کو ازبر کر لینا اس بات کی دلالت نہیں ہے کہ موزوں قسم کا عمل بھی پیدا ہوگا بلکہ یہ قسم کا ردّعمل پیدا کرنے کے لیے لازمی ہے کہ تعلیم کے ساتھ بچوں کی جذباتی تربیت بھی کی جائے کسی بات کی واقفیت دلاتے وقت ایسا طریقہ اختیار کیا جائے، جو بچوں کے طرز عمل کو متاثر کرے اور وہ اُس کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ ورنہ ایسا علم جو کہ عمل سے خالی ہو اس کے دماغ پر ایک ناقابل برداشت بوجھ بن کے رہ جاتا ہے۔ جسے وہ امتحان دینے کے فوراً بعد سر سے اتار پھینکتا ہے اور پھر کورے کا کورا ہو جاتا ہے۔ ایسا علم انسان کے دماغ میں کبھی راسخ نہیں

ہوسکتا۔ وہ آہستہ آہستہ اُس کے ذہن سے نکل جاتا ہے۔ ہمارے اکثر اداروں میں حالات اس سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہیں۔ استاد مقررہ نصاب کے ساتھ سختی سے چپٹے رہتے ہیں۔ ان کی اکثر کوشش یہ ہوتی ہے کہ طلبہ محکمے کے مقرر کردہ نصاب پر پوری طرح دسترس حاصل کرلیں۔ اور اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ زجرو توبیخ کے علاوہ جسمانی سزا تک کو جائز قرار دے دیا جاتا ہے۔ انھیں امتحان میں متوقع سوالات کے خلاصے لکھوا دیے جاتے ہیں اور سختی سے اِس طرح یاد کروائے جاتے ہیں کہ طالبہ پر فر فر سنا دیتے ہیں اور یہ حیا امتحان میں کامیابی کے ساتھ اُگل دیتے ہیں اور اِس طرح ممتحن کی آنکھوں میں دھول ڈال کر کامیابی کی سند حاصل کر لیتے ہیں لیکن بنظر غائر دیکھا جائے تو ایسے نوجوان حقیقی طور پر اِس کے لائق نہیں ہوتے۔ جب وہ زندگی میں قدم رکھتے ہیں اور ذمہ دارانہ عہدے ان کے سپرد کیے جاتے ہیں تو وہ اُن کے اہل ثابت نہیں ہوتے۔ اس طرح حکومت کے کاروبار میں خلل پیدا ہوتا ہے۔ اور معاشرے کا نظام درہم برہم ہوجاتا ہے۔ اس کا ذمہ دار استاد ہے یا مدرسہ جس نے بچوں کی تربیت کا خاطر خواہ انتظام نہ کیا۔

اس الم ناک صورتِ حال کا حل صرف اسی میں ہے کہ ہم تعلیم کے ساتھ تربیت کا دامن بھی مضبوطی سے پکڑے رکھیں۔ اس کا خوش گوار نتیجہ یہ نکلے گا کہ جب ہمارے نوجوان سکولوں یا کالجوں سے فارغ التحصیل ہوکر نکلیں گے تو وہ اخلاقی لحاظ سے بہترین انسان اور دنیوی لحاظ سے کامیاب شخص ثابت ہوں گے۔ بہترین تعلیم کی وجہ سے وہ زندگی کے جس شعبے میں بھی طبع آزمائی کریں گے کامیابی اور کامرانی ان کے پاؤں چومے گی اور اچھی تربیت کے باعث اہل دنیا ان کے قدر شناس ہوں گے۔ ان کے قول و فعل میں یگانگت ہوگی۔ اس لیے ہر کوئی ان کا احترام اپنا فرض سمجھے گا۔ اس لیے آج سے ہمارا نصب العین صرف تعلیم نہیں بلکہ تعلیم و تربیت ہونا چاہیے ؎

بچّہ اور تقلید

صوفی گلزار احمد

ہر انسان کی زندگی میں تقلید ایک اہم حصّہ لیتی ہے۔ محض نوجوان ہی تقلید کا مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ بچوں میں بھی تقلید کو نمایاں دخل ہے۔ ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تقلید سے کیا مراد ہے؟ تقلید دوسرے لوگوں کے خیالات، جذبات، اور اُن کے افعال کی ہو بہو نقل کرنے کا نام ہے۔ تقلید کی حقیقت اس امر سے واضح ہے کہ ہم روزمرہ زندگی میں والدین کے اخلاق اور مذہبی عقائد کو بڑی خوبی سے اپنا لیتے ہیں اور اُن کی اندھادھند پیروی کرتے ہیں۔ ہم اُن کی عادات و اطوار ان کے طرزِ گفتگو کی ہو بہو نقل کرنے لگتے ہیں۔ اس قسم کا رجحان بچوں کے روزمرہ کردار و افعال سے بخوبی واضح ہے۔ اور اُن کے جذباتی اور ذہنی نشوونما میں ہمیشہ کارفرما رہتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تقلید انسانی شخصیت کی تشکیل میں نمایاں کام انجام دیتی ہے۔ اکثر نفسیات دان اس بات پر متفق ہیں کہ تقلید بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں کافی حد تک مدد ثابت ہوتی ہے۔ اس مضمون میں ہم اسی موضوع پر قلم اٹھا رہے ہیں۔

آپ نے اکثر بچوں میں اس بات کا مشاہدہ کیا ہوگا کہ وہ نوجوانوں کے کردار و افعال کو اپنانے میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ یہ سب کچھ تقلید کی بدولت ہے۔ آخر بچے ایسے کردار کا کیوں مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہر بچہ اپنے والدین کے کردار و افعال سے مطابقت پیدا کر لینے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ اس مطابقت میں وہ دراصل اپنے جذبۂ برتری کو تسکین دینا چاہتا ہے۔ چناں چہ ہر بچہ اس جذبہ برتری کی تسکین کی خاطر والدین کی طرزِ گفتگو، عادات و اطوار اور مختلف کردار و افعال میں مطابقت پیدا کر لیتا ہے۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ بچے اپنے ساتھیوں کو حکم دینے میں بڑی خوشی محسوس کرتے ہیں اور پھر یہ بھی چاہتے ہیں کہ اُن کے ساتھی اس حکم کی تعمیل کریں۔ بچے اکثر اوقات ایک دوسرے سے الجھ بھی جاتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ ساتھیوں کو اپنے

حکم پر چلائیں اور اُن کے دلوں پر حکمرانی کریں بعض اوقات تو بچے کا طرز عمل والدین سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ وہ ان کے افعال کو ہو بہو اپناتا اور بالکل اس جیسی شکل و صورت کا مظاہرہ کرتا ہے الغرض بچوں کی روزمرہ زندگی میں تقلید جو اہم کام سرانجام دیتی ہے والدین کو اسے کسی صورت بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔

والدین کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ ان کا اپنا کردار اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنا بچے کا کردار۔ اس لیے اگر وہ اپنے کردار اور عادات و اطوار کا مطالعہ کرتے ہیں تو بہتر ہو۔ جو والدین اپنے کردار و افعال میں اخلاقی اقدار کو مدنظر نہیں رکھتے اور اچھی عادات اور اچھے طور طریقوں کو نہیں اپناتے، اُن کے بچے بھی بُری عادات سیکھ جاتے ہیں اور بُرے اخلاق کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ بچوں میں اچھا اخلاق اور اچھے خصائل پیدا کرنے کے والدین ہی ذمہ دار ہوتے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ اپنی ذات میں وہ تمام اوصاف پیدا کریں جن اوصاف کو وہ اپنے بچوں میں پیدا کرنے کے متمنی

بچے کی تعلیم و تربیت گھر سے شروع ہوتی ہے۔ اس لیے والدین کا یہ فرض اولین ہے کہ وہ اپنے بچے کے سامنے مثالی کردار کا نمونہ پیش کریں اور اچھے طور طریقوں کو اپنائیں۔ اس بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھیں کہ بچے روزمرہ زندگی میں ان کے کردار کی نقل ضرور کرتے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ وہ بچوں کے سامنے نرم دلی اور سلیقہ شعاری کا مظاہرہ کریں اور روزمرہ زندگی کے معاملات میں دیانت داری اور سچائی سے کام لیں۔ اس کے علاوہ انھیں ہمیشہ ہر ایک کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنا چاہیے۔ یہ وہ اوصاف ہیں جو ایک عظیم اور ہر دلعزیز شخصیت کی تعمیر میں نمایاں حصہ لیتے ہیں۔

اگر والدین ان تمام اوصاف کو اپنائیں تو گھر میں ایک خوش گوار ماحول پیدا کیا جا سکتا اچھے طور طریقوں اور عمدہ عادات و اطوار کو اپنانا ہی والدین کے لیے مفید ثابت ہوتا ہے اس کے برعکس بُرے طور طریقے اور گندی عادات بچوں کے کردار کی تعمیر میں مضر ثابت ہوتی ہیں والدین کو دوسرے لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ روا رکھنا چاہیے۔ تاکہ بچے بھی دوسرے لوگوں

اچھا برتاؤ روا رکھنا چاہیے۔ تاکہ بچے بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا سیکھ جائیں۔ اس کے علاوہ والدین کو بچوں کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ روا رکھنے کی ضرورت ہے۔ انھیں چاہیے کہ وہ بچوں کے ساتھ نرم رویہ روا رکھیں۔ ان کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آئیں۔ اگر وہ ایسا سلوک نہیں کریں گے تو یہ عین ممکن ہے کہ بچے برا برتاؤ کرنے کے عادی بن جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ترش کلامی پر اتر آئیں اور غصیلے بن جائیں۔ بچہ بڑے نازک دل و دماغ کا مالک ہوتا ہے۔ ایک معمولی بات یا حادثہ اس کے دل پر فوری اثر کر جاتا ہے۔ اگر کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف ہو جائے تو وہ اسے بری طرح محسوس کرتا ہے مثال کے طور پر اگر آپ اپنے بچے کے ساتھ اس کے سکول کے کام کاج کے متعلق مصروف گفتگو ہیں یا اس کے روزمرہ مشاغل کے متعلق پوچھ گچھ کر رہے ہیں تو یقیناً آپ کا بچہ اس میں بڑی دلچسپی لے گا۔ اور آپ کی باتوں کو بڑے غور سے سنے گا۔ لیکن اس اثنا میں اگر آپ فوراً گھر سے باہر سودا سلف لینے چلے جاتے ہیں اور بچے سے کوئی معذرت نہیں کرتے تو یقیناً یہ ناانصافی ہوگی۔ اگر ایسے موقع پر بچے سے معذرت کی جائے اور ایسے الفاظ بول دیے جائیں۔ "میں کچھ دیر کے لیے گھر سے باہر ضروری سودا سلف خریدنے جا رہا ہوں مجھے امید ہے کہ تم میری غیر موجودگی کو محسوس نہیں کرو گے" تو یہ الفاظ بچے کے دل بہلانے کے لیے کافی ہوں گے۔ اور اس کے آئندہ کردار پر بھی خوشگوار اثر ڈالیں گے۔۔

اگر والدین اپنے بچوں کو دیانتدار بنانا پسند کرتے ہیں تو ان کا یہ فرض ہے کہ وہ دوسرے لوگوں اور بچوں کے ساتھ دیانتداری سے کام لیں۔ غیر دیانتداری کسی صورت بھی مفید ثابت نہیں ہوتی۔ اکثر والدین روزمرہ زندگی میں اپنی دیانتداری کے رویے کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ بچے تیز مشاہدہ کے مالک ہوتے ہیں اور ہر اس چیز کی تقلید کرنے لگتے ہیں جو ان کے گردوپیش ہو رہی ہے۔ فرض کیجیے کہ آپ اپنے بچے کو سینما دکھانے کا وعدہ کر چکے ہیں اور اس وعدہ کے باوجود آپ وقت آنے پر بچے کی پروا نہیں کرتے اور گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ سینما دیکھنے روانہ ہو جاتے ہیں۔ آپ غور کیجیے کہ آپ نے بچے کے ساتھ کس قدر ناانصافی سے کام لیا ہے اور اس کے احساسات کو کس قدر ٹھیس پہنچائی ہے۔ آپ کو اسی کردار کا مظاہرہ کرنا چاہیے جو کردار آپ بچوں میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اسی میں انکی

بہتری کا راز مضمر ہے۔

نرمی اور خوش کلامی ایسی صفات ہیں جن کا والدین کو اپنی ذات میں پیدا کر لینا بہت ضروری ہے انھیں ہر فرد کے ساتھ ہی نہیں بلکہ بچوں کے ساتھ بھی نرمی اور خوش کلامی کا رویہ روا رکھنا چاہیے۔ جب والدین ان صفات سے متصف ہوں گے تو لازماً بچے بھی ایسا رویہ اختیار کریں گے۔ اس طرح گھر میں ایک خوش گوار ماحول پیدا ہو جائے گا۔

والدین کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خوش و خرم رہیں اور ہر ایک کے ساتھ خندہ پیشانی اور مروّت سے پیش آئیں۔ بعض والدین گھر کے اکثر معاملات میں بڑی تلخی اور بے مروّتی کا سلوک روا رکھتے ہیں اور اس بات کا بالکل خیال نہیں کرتے کہ اخلاق اور ۔۔۔ کا برتاؤ گھر میں کتنا خوش گوار اثر ڈال سکتا ہے اور بچوں کے دل کو موہ لینے میں کتنا موثر ثابت ہو سکتا ہے۔

بچے صرف والدین کی ہی تقلید نہیں کرتے بلکہ اپنے عزیز اساتذہ کے کردار و افعال کی بھی ہو بہو نقل کرتے ہیں۔ جب تک بچہ گھر میں رہے بچے کی تربیت والدین کے سپرد ہوتی ہے اور اُس کی تمام تر ذمہ داری والدین پہ عاید ہوتی ہے۔ لیکن جوں ہی بچہ سکول میں داخل ہو جائے تو اس ذمہ داری کا بوجھ اساتذہ پر بھی پڑنے لگتا ہے۔ ہر بچے میں چوں کہ تقلید کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ ہر بات کی ہو بہو نقل کرتا ہے جو اس کے گرد و پیش ہو رہی ہو۔ اس لیے استاد کی شخصیت بچے کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے استاد کا بچوں میں ہر دل عزیز ہونا بہت ضروری ہے۔ اُس میں ان تمام صفات کا مجتمع ہونا ضروری ہے جو ایک شخص اپنے بچے میں پیدا کرنے کا متمنی ہوتا ہے۔ والدین کی طرح ہر استاد کا یہ فرض ہے کہ وہ بچے کے سامنے ایک عظیم کردار پیش کرے اور اپنے اندر وہ تمام اوصاف پیدا کرے جو اس کردار کے لیے لازمی ہیں۔

ہر استاد کا یہ فرض اولین ہے کہ وہ اپنی ذات میں اوصاف حمیدہ پیدا کرے۔ کیوں کہ اگر کسی بچے کو تقلید کرنے کا موقع بھی ملے تو اُس کے پیش نظر ستودہ صفات ہوں۔ جہاں تک بچے کی تعلیم و تدریس کا تعلق ہے، عمدہ کتابوں کا انتخاب بہت ضروری ہے۔ بچوں کے لیے ایسی کتابیں مہیا

کرنی چاہئیں جن میں جان بازوں اور جنگجوؤں کے قصے ہوں۔ بعینہٖ بچوں کو دلیری اور جانبازی کے قصے بھی سنانے چاہئیں۔ اِس طرح بچے عمدہ اور مثالی کردار کے مالک بن جائیں گے۔

بعض والدین یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ اُستاد کا فرضِ اولین ہے کہ وہ عمدہ اخلاقی کردار کا مظاہرہ کرے اور اِس طرح بچوں کی اخلاقی اور روحانی نشوونما میں ممد و معاون ثابت ہو۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے ہمیں بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں تمام تر ذمہ داری استاد پر ہی نہیں چھوڑ نی چاہیے۔ دراصل بچے کی تربیت میں استاد اور والدین دونوں برابر کے حصہ دار ہیں۔ بچے کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں والدین اور اساتذہ جہاں اخلاقی اصولوں پر عمل پیرا ہوتے ہیں وہاں انھیں اپنے لباس اور اپنی ظاہری شخصیت کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے۔ جہاں تک ہو سکے ان کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ صاف ستھرا لباس زیبِ تن کریں اور روزمرہ زندگی میں صفائی اور نفاست سے کام لیں۔ تاکہ بچوں میں تقلید کی بدولت صفائی اور نفاست کی عادات پیدا ہوں۔

بچہ جب سکول میں داخل ہوتا ہے تو اُس کی سماجی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہمجولیوں کی صحبت میں اٹھتا بیٹھتا اور ان کے مشاغل میں پوری دلچسپی اور انہماک دکھاتا ہے۔ اور تقلید کی بدولت ان کے کردار کی پیروی بھی کرنے لگتا ہے۔ ایسے موقع پر والدین اور اساتذہ کا یہ فرض ہے کہ وہ بچے کی مصروفیات کا دھیان رکھیں اور اِس بات کا پورا پورا خیال رکھیں کہ ان کا بچہ اچھے لڑکوں کی اچھے لڑکوں کی صحبت اختیار کرتا ہے یا نہیں؟

معلومات عامہ

طاقت کے نئے وسائل سے متعلق ماہرین کا اجتماع

اس سال یورپ کے تین بڑے شہروں میں شہرۂ آفاق ماہرین کے اجلاس ہوں گے جو طاقت کے نئے وسائل معلوم کرنے کی فکر میں ہیں۔ نئی طاقت سورج، ہوا یا حرارت زمین سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ ان الگ الگ جلسوں کے بعد سارے موضوع پر اقوام متحدہ کی ایک کانفرنس اگلے سال منعقد ہوگی۔

مذکورہ بالا کانفرنس اگلے سال ۲۱ سے ۳۱ اگست تک یورپ میں منعقد کی جائے گی۔ لیکن ٹھیک جگہ کا فیصلہ ابھی نہیں ہوسکا ہے۔ یہ کانفرنس ایک تجویز کی تعمیل میں ہوگی جو اقتصادی اور معاشرتی کونسل نے پچھلے سال اپریل میں منظور کی تھی۔ اس کا مقصد طاقت کے نئے وسائل معلوم کرنا ہے۔ تاکہ کم ترقی یافتہ ملکوں کی ترقی میں ممد و معاون ہوسکیں۔

کانفرنس کی ابتدائی کارروائی کے سلسلے میں گذشتہ ایک سال کی رپورٹ پچھلے مہینے شائع ہوئی ہے اس میں سکرٹری جنرل نے لکھا ہے کہ ماہرین کے تین اجلاس منعقد ہوں گے جن کی تفصیل یہ ہے۔ میڈرڈ میں ۲۲ سے ۲۵ مئی تک (یہ ہو چکا ہے) گرینوبل ۱۴ سے ۱۷ جون تک۔ اور روم میں ۲۷ جون سے ۲ جولائی تک۔

یہ تینوں اجلاس علی الترتیب سورج کی طاقت۔ ہوا کی طاقت اور حرارتِ زمین کی طاقت کے بارے میں ہوں گے۔

میڈرڈ کا اجلاس اس بین الاقوامی کانفرنس سے بالکل پہلے ہوا ہے۔ جو طاقت کی عالمی کانفرنس کے ماتحت وہاں جون میں ہوتی ہے۔ یہ انجینروں کا ایک بین الاقوامی ادارہ ہے جو برقی قوت اور طاقت کی دوسری قوتوں سے عملی طور پر تعلق رکھتا ہے۔

گرینوبل کا اجلاس حکومت فرانس کی مالی امداد سے منعقد ہونے والا ہے۔ وہ اقوام متحدہ اور گرینوبل

یونیورسٹی کے مشترک اہتمام سے ہوگا۔

دوم کا اجلاس ادارۂ خوراک وزراعت کے صدر مقام پر ہوگا۔ حرارتِ زمین کو ترقی دینے میں اٹلی سب سے آگے ہے۔ اور پیسیہ کے قریب جو طاقت کا ایک کارخانہ قائم ہے وہ دنیا میں حرارتِ زمین سے طاقت پیدا کرنے والا سب سے بڑا کارخانہ ہے۔

رپورٹ میں لکھا ہے کہ ہر اجلاس میں پانچ سے آٹھ تک منتخب شہرۂ آفاق ماہرین کی جماعت زیرِ غور موضوع پر تبادلۂ خیالات کے لیے حصّہ لے گی۔ ہر اجلاس میں شریک ہونے والوں کے فرائض حسبِ ذیل ہوں گے۔

(الف) فنیات کے اعتبار سے حالیہ ترقیوں پر تبصرہ، خاص طور پر اس لحاظ سے کہ کم ترقی یافتہ ملکوں میں ان کو کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔

(ب) اس سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں اقتصادی مسائل کا مختصراً جائزہ، خصوصاً کم ترقی یافتہ ملکوں میں۔

(ج) آئندہ منعقد ہونے والی کانفرنس کے لیے وسائل کے موضوع پر مفصل ایجنڈے کی ترتیب و تشکیل۔

(د) کانفرنس کے انتظامات کے بارے میں تبادلۂ خیالات۔

جنرل سکریٹری اگلے سال منعقد ہونے والی کانفرنس کے دعوت نامے جاری کریں گے۔ اور اس کے لیے چندوں کا انتظام کریں گے۔ اس ضمن میں وہ اس مشورے کو مدِّنظر رکھیں گے جو ماہرین کے جلسوں سے ملیں گے۔ تاہم انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ کانفرنس کی کامیابی بڑی حد تک شریک ہونے والے ماہرین کی فنی اور اقتصادی صلاحیتوں پر منحصر ہوگی۔ لہٰذا مستند اور تجربہ کار ماہرین منتخب کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تاکہ وہ کانفرنس کو پوری طرح فائدہ پہنچا سکیں۔

رپورٹ کے ساتھ کانفرنس کا ایک ابتدائی ایجنڈا منسلک ہے۔ زیرِ بحث لانے کے لیے یہ موضوع تجویز کیے گئے ہیں۔

حرارت پہنچانے، کھانا پکانے، سرد کرنے اور اشیائے خوراک کو محفوظ کرنے کے لیے اور

دوست تازہ پانی، عام نمک اور دوسری کیمیاوی اشیاء کے لیے سورج کی طاقت کا استعمال۔ پمپ کے ذریعے پانی نکالنے، اناج دلنے اور پھٹکنے وغیرہ کے لیے ہوا کی طاقت کا استعمال۔ برقی قوت پیدا کرنے صنعتی اداروں اور گھروں میں حرارت پہنچانے اور معدنی بھاپ کے لیے حرارت زمین کی طاقت کا استعمال۔

اگرچہ کانفرنس بلائے جانے کی اصل وجہ تو وہ قرارداد ہے جو اقتصادی اور معاشرتی کونسل نے پچھلے سال منظور کی تھی لیکن طاقت کے نئے وسائل سے فائدہ اٹھانے کا جہاں تک سوال ہے اقوام متحدہ کو ۱۹۴۹ء سے اس سے دلچسپی ہے۔ اس وقت لیک سکس میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس نے اس وقت تک کی تحقیقات پر ابتدائی تبصرہ کیا تھا۔

منشیات کی بین الاقوامی روک تھام کے مسائل

نشہ آور ادویات سے متعلق اقوام متحدہ کے کمیشن کا سالانہ اجلاس جنیوا میں تین ہفتے جاری رہنے کے بعد ختم ہوا جس میں ان امور پر غور کیا گیا:۔ منشیات کی لت میں کمی۔ اس موضوع سے متعلق مختلف بین الاقوامی معاہدوں کی تکمیل۔ ان ماہرین کے وفد کی رپورٹ جنھوں نے پچھلے سال ستمبر اور اکتوبر میں مشرق وسطیٰ کا جائزہ تیار کیا تھا۔

منشیات کے اس کمیشن میں ان پندرہ ملکوں کے نمائندے شامل ہوتے ہیں، کنیڈا، چین، فرانس، ہنگری، بھارت، ایران، میکسیکو، نیدرلینڈز، پیرو، ترکی، روس، متحدہ عرب، جمہوریہ، ریاست ہائے متحدہ اور یوگوسلاویہ۔ اس اجلاس کے لیے ان عہدیداروں کا انتخاب اتفاق رائے کیا گیا، کنیڈا کے مسٹر کے سی ہوسک بحیثیت صدر، ترکی کے مسٹر اوزکول اور متحدہ عرب جمہوریت کے مسٹر امین اسمٰعیل بحیثیت اول و دوم، نائب صدر اور فرانس کے مسٹر جے میبلو بحیثیت وقائع نگار۔ مذکورہ بالا پندرہ ملکوں کے علاوہ کچھ ایسے ملکوں کے مبصرین جن کو ایجنڈے کی مخصوص شقوں سے تعلق تھا۔ نیز عالمی ادارۂ صحت، جرائم کی بین الاقوامی پولیس اور قانون دان خواتین کے بین الاقوامی وفاق وغیرہ کے نمائندے بھی شریک ہوئے۔

ایک موضوع جو کمیشن کے ایجنڈے میں بطور خاص شامل نہیں تھا۔ لیکن اجلاس کے ابتدائی دنوں

ایک سے زیادہ مقررین نے حوالہ دیا۔ اس سفارتی کانفرنس کے بارے میں تھا جو منشیات سے متعلق واحد ضابطہ قانون کا مجوزہ مسودہ منظور کرنے کے لیے اگلے سال منعقد ہوگی۔ اس ضابطے کا مقصد یہ ہے کہ منشیات سے متعلق موجودہ معاہدوں کی بجائے صرف ایک دستاویز ہو جو اس ضمن میں بین الاقوامی قوانین کو مجتمع ہی نہ کرے بلکہ احتساب کے طریقۂ کار کو آسان بھی کر دے اور اس وقت جو بعض خامیاں ہیں وہ دور ہو جائیں۔

ضابطے کا مسودہ تیار کرنا مدوّن قوانین کے ان بڑے منصوبوں میں سے ایک ہے جن کی ذمہ داری اقوام متحدہ نے لی ہے۔ نشہ آور ادویات کے کمیشن نے اسے ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۹ء کے درمیان تیار کیا تھا۔ چناں چہ اگلے سال جب کانفرنس میں شرکت کے لیے اراکین جمع ہوں گے تو ان کے سامنے کمیشن کا آخری مسودہ اور اس پر حکومتوں کا تبصرہ ایک ساتھ پیش ہوگا۔

موجودہ منصوبے کے مطابق جس کی انتظامی منظوری اقتصادی اور معاشرتی کونسل سے حاصل کرنی باقی ہے۔ موجودہ کانفرنس نیویارک میں ۱۶ یا ۲۳ جنوری کو منعقد ہوگی اور تقریباً آٹھ ہفتے جاری رہے گی۔ تاہم پچھلے مہینے جنیوا میں دو نمائندوں یعنی ترکی کے مسٹر ایم اوزکول اور بھارت کے مسٹر ایم کرشنا سورتی نے اندیشہ ظاہر کیا کہ اس اہم کام کے لیے آٹھ ہفتے کی مدت کافی نہیں ہوگی۔ انھوں نے زور دیا کہ انتظامات میں اتنی لچک رکھنی چاہیے کہ مدت میں اضافہ کیا جا سکے۔ تاکہ اگر پہلی کانفرنس میں کام ختم نہ ہو سکے تو دوسری منعقد کرنے کے لیے وقت اور روپیہ ضائع کرنا نہ پڑے۔

ناجائز خرید و فروخت کے موضوع پر کمیشن کو بتایا گیا کہ پچھلے سال کے دوران میں افیون، افیون کے مرکبات، کوکین، بھنگ کے مرکبات۔ مثلاً ماریجوانا، حشیش وغیرہ کی ناجائز خرید و فروخت ہوئی۔

ناجائز خرید و فروخت سے متعلق کمیٹی کے صدر مسٹر ڈی سی گرین نے جو برطانیہ کے نمائندے ہیں اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ افیون کی ناجائز خرید و فروخت مشرق بعید سے اور مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ سے بھی ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ اہم مقدار میں جو افیون پکڑی گئی وہ مشرق بعید کی تھی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہیروئن کی خرید و فروخت بڑھتی معلوم ہوتی ہے۔ بیشتر مقدار شمالی امر

جارہا ہے۔ اطلاع دہی کے طریقے بہتر ہو جانے کے باعث یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کوکین کی ناجائز خرید و فروخت خاص اہمیت رکھتی ہے اور اس کا مرکز جنوبی امریکہ ہے۔

منشیات کی ناجائز خرید و فروخت میں خصوصاً جنوبی امریکہ میں ہوائی جہازوں کے بڑھتے ہوئے استعمال کا ذکر بھی مسٹر گرین نے کیا اور بتایا کہ مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے بعض حصوں سے بھی ایسی اطلاعات ملی ہیں جہاں کشتیوں سے مال اتارنے کے بہت سے پوشیدہ مقامات ہیں۔

کمیٹی کی رپورٹ پر بحث کے دوران میں ایک یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ کیا عوامی جمہوریت چین بھی ناجائز خرید و فروخت کا ذریعہ ہے۔ ہنگری کے نمائندے مسٹر امرے ورتس نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ کمیشن میں عوامی جمہوریت چین کا کوئی نمائندہ شامل نہیں ہے۔ اس صورتِ حال نے دنیا کی تقریباً ایک چوتھائی آبادی کو ناجائز خرید و فروخت کے خلاف جدوجہد میں شرکت کرنے سے روک رکھا ہے

ریاست ہائے متحدہ کے نمائندے مسٹر چارلس سراگوسا نے کہا کہ میرا ملک ہیروئن کی اس ناجائز فروخت کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے جس کی ابتدا اشتراکی چین، ہانگ کانگ اور مکاؤ سے ہوتی ہے اور یہ مال جاپان اور مشرق بعید کے دوسرے علاقوں کی راہ ہمارے مغربی ساحل کی بندرگاہوں پر ناجائز طور سے لایا جاتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ریاست ہائے متحدہ کے مغربی ساحل کی بندرگاہوں پر مشرق وسطیٰ سے بھی ناجائز طور پر ہیروئن کی بڑی مقدار لائی جاتی ہے۔

چین کے مسٹر سی کے لیانگ نے اپنی حکومت کی طرف سے یقین ظاہر کیا کہ ۹۹ فی صد افیون سرزمین چین سے برآمد ہوتی ہے جس پر آج کل اشتراکیوں کا قبضہ ہے۔ ان الزامات کی تردید روس کی نمائندہ مسز وینشیا ویسیلیفا نے کی اور تائیوان کے ارباب اقتدار کی لگائی ہوئی تہمتوں کے خلاف احتجاج کیا۔ انھوں نے مسٹر سراگوسا کے بیان پر بھی اعتراض کیا اور کہا کہ کمیشن کی منظور شدہ ایک قرارداد کے بموجب ایسے الزامات صرف قابل یقین اور ٹھوس ثبوت کی بنیاد پر ہی کیے جا سکتے ہیں اور متعلقہ حکومتوں سے صلاح و مشورے کے بعد ایسا ہونا چاہیے۔ مسٹر سراگوسا نے کہا کہ اس معاملے پر صرف اسی چینی حکومت سے مشورہ کر لیا گیا تھا۔ جسے ہم تسلیم کرتے ہیں اور وہ چین کی حکومت ہے۔

جاپان کے نمائندے مسٹر کادو توشی ہاسے گاوا نے مطالبہ کیا کہ نشہ آور ادویات سے متعلق عالمی ادارۂ صحت کے ماہرین کی کمیٹی ایک نئی مرکب دوا کا جائزہ لے جو "ایس پی اے" کے نام سے جاپان میں ۱۹۵۸ء سے رائج ہے۔ یہ دوا اعصابی دردوں کو کم کرنے کے لیے تیار کی گئی تھی لیکن اب زیادہ تر نشے باز اسے استعمال کرنے لگے ہیں۔

کمیشن نے اقوام متحدہ کے سکرٹریٹ کی اس رپورٹ پر بھی غور کیا جو کوکا نامی پودے کے پتے چبائے جانے کے موضوع پر تیار کی گئی ہے۔ اس لت کو دور کرنے کے لیے ارجنٹائن، بولیویا، چلی، کولمبیا اور پیرو میں جو کام ہوا ہے، اس سے کمیشن کو مطلع کیا گیا۔

افیون اور مرکبات افیون پر بحث و تمحیص کے دوران میں حاضرین اجلاس نے اقوام متحدہ کی لیبارٹری کے کاموں کا جائزہ لیا۔ یہ پانچ سال پہلے جنیوا میں قائم ہوئی تھی۔ اس تجربہ گاہ میں منشیات کے ان نمونوں کا جائزہ لے کر جو حکومتیں اس کے پاس بھیجتی ہیں ان کی جغرافیائی ابتدا کا کھوج لگایا جاتا ہے۔

تمام مقررین نے لیبارٹری کی خدمات کو سراہا اور تسلیم کیا کہ وہ تحقیقات کا ایک بین الاقوامی مرکز بن گیا ہے۔

اجلاس ختم ہونے سے پہلے کمیشن نے کئی تجاویز منظور کیں جن میں سے کئی ماہرین کے ایک وفد کی رپورٹ سے متعلق تھیں۔ اس وفد نے گذشتہ موسم خزاں میں مشرق وسطیٰ کے ملکوں میں جا کر چھپے بکنے میں نشہ آور ادویات کا جائزہ لیا تھا۔

کمیشن نے اتفاق رائے سے ایک تجویز منظور کی جس کے ذریعہ مشرق وسطیٰ کی متعلقہ حکومتوں کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ منشیات کی روک تھام کے ذہن میں اپنے مشترک مقاصد کی جلد تحصیل کے لیے علاقائی کانفرنسیں منعقد کرنے کی خواہش پر غور کریں۔

ایک اور تجویز بھی اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔ اس کے ذریعہ بھی تمام حکومتوں کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ منشیات کی روک تھام سے متعلق علاقائی جلسوں کو فروغ دینے کے امکانات پر غور کریں، جلسے خود ان کے اشارے پر ہوں یا اقوام متحدہ کے ذریعہ عمل میں آئیں۔

کسی مخالفت کے بغیر یہ موافق اور صرف ترکی کے غیر جانبدار ووٹ کے ذریعے کمیشن نے ایک تجویز منظور کی جس کے ذریعے پانچ ماہرین پر مشتمل وفد کے اراکین کا شکریہ ادا کیا گیا کہ انھوں نے اعلیٰ خدمات انجام دی ہیں اور ان کے تعاون سے بڑا فائدہ پہنچا ہے۔ تجویز میں حکومتوں کی ذمہ داریاں پر بھی توجہ مبذول کی گئی ہے۔ مثلاً یہ کہ عین وقت پر رپورٹیں اور اعداد و شمار پیش کرنے سے بڑا فائدہ پہنچا ہے۔ قرارداد میں خاص طور پر وفد کے اس مشورے پر بھی زور دیا گیا ہے کہ ماہرین کی چھوٹی چھوٹی جماعتیں وقتاً فوقتاً مشرق وسطیٰ کا دورہ کیا کریں اور اس علاقے کی حکومتوں سے ان کے مشترک مسائل کے بارے میں پوچھ گچھ کیا کریں۔ یہ دورے متعلقہ حکومتوں کی مرضی سے ہوا کریں۔

وفد کی رپورٹ پر ابتدائی بحث کے دوران میں متعدد مقررین نے اس کی خدمات کو سراہا اور اس کی سفارشات پر عام منظوری کا اظہار کیا جس میں ماہرین کے دوروں کی تجویز بھی شامل ہے۔ ان مقررین میں متحدہ عرب جمہوریہ، ایران، ریاست ہائے متحدہ، عراق، نیدرلینڈز، برطانیہ اور فرانس کے نمائندے شامل تھے۔

تاہم ترکی کے نمائندے مسٹر مظہر اوزکول نے شدید اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ اس رپورٹ میں کوئی نئی بات نہیں ہے، اور مشرق وسطیٰ کے دورے پر کسی کے جائے بغیر صرف جنیوا میں بیٹھ کر لکھی جا سکتی تھی۔ انھوں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ ترکی اور لبنان جیسے ملکوں کو اس رپورٹ میں کیوں نمایاں طور پر الگ کیا گیا ہے جبکہ دوسرے ملکوں میں بھی منشیات کا مسئلہ رنگ جمائے ہوئے ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں وفد کے صدر کنیڈا کے نمائندے کرنل لیونارڈ نکلسن نے کہا کہ ترکی اور لبنان کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا گیا ہے کیوں کہ وہاں یہ مسئلہ زیادہ پریشان کن ہے۔ البتہ رپورٹ میں اور ملکوں کا ذکر بھی موجود ہے۔

اسرائیل کے مبصر مسٹر مناہل کاہانی نے بھی ایک اعتراض کیا، وہ کمیشن کے رکن نہیں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں رپورٹ کے صرف ان جملوں کی وجہ سے اسے منظور کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ جن کا مطلب یہ ہے کہ اسرائیل کی سرحدوں پر محض سیاسی اسباب کی بنا پر تعاون کا فقدان رہا اور اس لیے

کوئی تبصرہ کرنا وقد کے دائرہ عمل سے الگ ہے۔ اسرائیلی ممبر نے خیال ظاہر کیا کہ محض سیاسی وجوہ پر پو
افسروں کے فنی تعاون میں رکاوٹ نہیں ڈالی جاسکتی تھی۔ اگر عرب ملکوں نے اسرائیل کا بائیکاٹ کر
ہے تو منشیات کی ناجائز خرید و فروخت پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔

نشے کی لت کے اعداد و شمار سے متعلق کمیٹی کی رپورٹ میں جو نتائج درج کیے گئے ہیں انھیں کمی
نے قبول کر لیا۔ اس میں حکومتوں سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ کنابس کے استعمال پر مکمل اطلاعات
کریں۔ یہی چیز حشیش اور ماریجوانہ کے نام سے بھی مشہور ہے۔ حکومتوں سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ زی
مدت تک طبی مقاصد کے تحت اس کے استعمال کے بارے میں خیال ظاہر کریں کہ کیا اس طرح استعما
کرنے والوں کو اس کی عادت تو نہیں ہو جاتی۔

درخت کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔ یہ پودا افریقہ اور مشرق وسطیٰ کے بعض حصوں میں پیدا ہوتا ہے۔ او
بعض جگہ اس کا استعمال ایک پریشان کن مسئلہ بن گیا ہے۔ تاہم کمیشن نے اس پر زیادہ بحث مناسب
نہیں سمجھی اور اس پر غور و خوض کی کارروائی کو اس لیے ملتوی کر دیا کیونکہ عالمی ادارۂ صحت نے اس چیز
اثرات کا پوری طرح جائزہ نہیں لیا ◆

لد ۱۳ شمارہ ۱۰ ، ۱۱ | لاهور | جنوری ، فرور

۶۲

اس شمارہ میں

ادارہ تحریر . سپل اے جی بٹ

معاونین { شیخ عبدالحق / سید کوثر حسین

آموزش

لاہور

جنوری، فروری ۱۹۶۲ء

جلد ــــــــــــ ۱۴

شمارہ ــــــــــــ ۱۰ و ۱۱

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ باسٹھ پیسے

پبلشر

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں چھپوا کر
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۱۹۲ انار کلی لاہور سے شائع ہوا

اداریہ

امتحان ایک ناپسندیدہ چیز سہی لیکن تعلیمی دنیا میں اس سے مفر بھی نہیں۔ کونسا نظامِ تعلیم ہے
جس میں امتحان کی کوئی نہ کوئی صورت ایک ناگزیر ضرورت نہ سمجھی گئی ہو۔ تعلّم کی تشخیص ہو یا تعلیم کی
یمائش امتحان کے بغیر ممکن نہیں۔ پھر طلبہ کی گروہ بندی، ایک جماعت سے دوسری جماعت میں ترقی،
لف پیشوں کے لیے موزوں افراد کا انتخاب اور ملکی و معاشری ذمہ داریوں کی تفویض کا کام امتحانات
ی کے ذریعے سے انجام پاتا ہے۔ یہ نہ صرف طلبہ کی قابلیت کو ماپنے کے پیمانے ہیں، بلکہ معلمین کی
اقت اور معلمانہ مہارت بھی انہی آئینوں میں منعکس ہوتی ہے۔ چنانچہ معلّم و متعلم دونوں کو امتحانات کے
نائج کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔

تعلیم و تربیت کی بدولت طلبہ کی سیرت و کردار اور ذہنی استعداد میں جو تبدیلیاں راہ پاتی ہیں
ن کا جائزہ بھی تمام تر امتحانات ہی کا رہینِ منت ہے۔ علاوہ ازیں تحصیل علم اور اکتساب فن کی منزل
یں امتحان ہی اُس شوق کو مہمیز کرتا ہے جس سے مسابقت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور طلبہ درسیات
کے مشکل سے مشکل حصوں پر عبور حاصل کر لیتے ہیں۔

امتحان کی یہ ضرورت، اہمیت اور افادیت اسی وقت تک قائم ہے جب امتحان کو امتحان
سمجھا جائے اور کامیابی کا حصول لیاقت سے اور امتحان کا محنت سے قدیم رابطہ اُستوار ہے۔
وہ کامیابی جو استحقاق کی بجائے محض حسنِ اتفاق پر مبنی ہو نظامِ امتحانات کی کھلی توہین اور نظامِ تعلیم
سے بغاوت کے مترادف ہے۔

سوئے اتفاق سے آج کل کچھ ایسے عناصر پیدا ہو گئے ہیں جو امتحانات کی اہمیت کو کم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ درسی کتابوں کے بے شمار خلاصوں کی طباعت اور گیس پیپرز کی اشاعت نے کم از کم میٹرک کے طلبہ کی نظروں میں امتحان کو مذاق بنا دیا ہے۔ طلبہ کی اکثریت سال بھر درسیات میں مصروف رہنے کی قائل نہیں رہی۔ اب انہیں بہترین مدرس یا بہترین درس گاہ کی بجائے مختصر ترین خلاصے اور بروقت شائع ہونے والے گیس پیپرز کی آرزو رہ گئی ہے۔ جو والدین کی محبت، اساتذہ کی مصلحت اور ناشرین کے بے پناہ جذبۂ خدمت کی بدولت آخر پوری ہو کر رہتی ہے اور آہستہ آہستہ ہمارے نظامِ تعلیم کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہی ہے۔

ناشرین نے اپنے تیار کردہ خلاصوں اور بالخصوص گیس پیپرز کی شہرت کے لیے جو طریقۂ کار اختیار کیا ہے وہ انتہائی افسوس ناک ہے۔ عجیب و غریب عنوانات سے مزین اشتہارات شائع کیے جاتے ہیں اور طلبہ کو طرح طرح سے یقین دلایا جاتا ہے کہ یہ خلاصے یا گیس پیپرز امتحانی مشکلات کو دور کرنے کے پوری طرح ضامن ہیں۔ ان کے ذریعے سے ہزاروں امیدوار کسی استاد یا کالج کی مدد کے بغیر امتحان پاس کر چکے ہیں۔ گویا مدرسوں میں سال بھر باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ان گیس پیپرز کی تعریف میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کے ذریعے فلاں سن میں امتحان کے پرچے آؤٹ ہو چکے ہیں، جس کی تفتیش کے سلسلے میں پولیس کو گیس پیپرز کے دفتر پر چھاپہ مارنے کی ضرورت پڑتی تھی۔

ظاہر ہے کہ نشر و اشاعت کا یہ رنگ قوم کے نونہالوں کے حق میں نہایت گمراہ کن اور نظامِ تعلیم کے لیے انتہائی تشویش ناک ہے۔ اس طرح طلبہ میں سہل انگاری راہ پاتی ہے، اور ان کی نظر میں مدارس، اساتذہ اور منتظمِ تعلیم کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی۔ طلبہ سوچتے ہیں کہ جب امتحان کے موقع پر صرف گیس پیپرز پڑھ کر پاس ہو سکتے ہیں تو مدرسے میں تمام سال پڑھنے کی کیا ضرورت ہے اور وہ صرف سوچتے ہی نہیں بلکہ غیر شعوری طور پر ترکِ مطالعہ پر عمل بھی شروع کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ صرف اس امتحان میں ناکامی کا منہ دیکھتے ہیں، بلکہ اپنی تمام زندگی کو ناکام بنا لیتے ہیں، کیونکہ

نعین ضبطِ نفس اور محنت کی عادت نہیں پڑتی، جو کامیاب زندگی کے لیے نہایت ضروری ہے۔

گیس پیپرز تیار کرنے اور انہیں ذریعۂ کامیابی سمجھنے کا میلان حلقۂ معلمین میں بھی عام ہوتا جاتا ہے جس سے مدارس میں تدریسی کام بُری طرح متاثر ہوا ہے۔ اور تعلیم و تعلّم کا جذبہ سرد پڑ گیا ہے گیس پیپرز کے استعمال کی ایک وجہ یہ ہے کہ پرچہ بنانے والے حضرات ہر سال پرچے میں ایک ہی وضع کے رسمی اور غیر متبدل سوالات رکھ دیتے ہیں، جس سے قیاس آرائی کو تقویت پہنچتی ہے، اور متعلمین کی طرح معلمین کو بھی گیس پیپرز کا سہارا لینے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔

گیس پیپرز سے قطع نظر، درسی کتابوں کے خلاصے بھی مقاصدِ تعلیم کے حصول میں بُری طرح حائل ہیں۔ چناں چہ قومی تعلیم کے کمیشن نے خلاصوں کی اشاعت پر پابندی عائد کرنے کی سفارش کی ہے بلکہ ان کی فروخت ایک قابلِ سزا جرم قرار دیدی گئی ہے۔ کیوں کہ خلاصے رٹ کر امتحان پاس کر لینا اکتسابِ علم و فن کی شرط کو پورا نہیں کرتا۔ کمیشن نے سفارش کی ہے کہ طلبا کو سارے سال پڑھنے اور کام کرنے میں مصروف رکھا جائے۔ اور سارا زور مضمون کو سمجھنے اور اخذ کرنے پر دیا جائے نہ کہ رٹنے اور اگل دینے پر۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کچھ طلبہ خلاصوں، شرحوں اور امتحان کے قیاسی پرچوں کی مدد سے کامیاب بھی ہو جائیں تو یہ ادنےٰ درجے کی اتفاقی کامیابی تعلیمی ترقی میں کسی طرح ممد نہیں ہوتی۔ کالج کی پہلی دو جماعتوں کے ناگفتہ بہ نتائج اس کا واضح ثبوت ہیں۔

طلبہ کو خلاصوں کی مضرت سے محفوظ رکھنے کے لیے کمیشن کی سفارشات پر فوری عمل کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں اساتذہ بھی نمایاں خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ اگر ثانوی مدارس میں تمام سال مقررہ مضامین پر پوری توجہ صرف کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مدرسے کے طلبہ میں تحصیل علم کے ساتھ ساتھ خود اعتمادی کا جذبہ پیدا نہ ہو۔ معلمین اپنی لیاقت اور مہارت کو بروئے کار لا کر طلبہ کو تعلیم کے صحیح راستے پر ڈال سکتے ہیں۔

ہیڈ ماسٹر بطور رہنما

...ر عمر خاں

ایک ماہر تعلیم کا قول ہے کہ سکول میں ہیڈ ماسٹر کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو گھڑی میں بال کمانی
. بلا شبہ مدرسہ چلانے کی تمام تر ذمہ داری ہیڈ ماسٹر پر براہ راست عائد ہوتی ہے. لیکن مدرسہ کی
شینری میں ہیڈ ماسٹر کا مقام سب سے اہم پرزہ کا سا ہے اور اسے مدرسہ کو خوش اسلوبی سے
انے کے لیے اپنے رفقائے کار کی کارکردگی کا مرہون منت ہونا پڑتا ہے. اس سلسلے میں ہیڈ ماسٹر
یے تقسیم کار کے وقت ہر ایک کام کے لیے موزوں شخص کا انتخاب پہلی منزل ہے اور نیا دکھ
ہ اشتراکِ عمل کا اہتمام دوسری منزل ہے۔

دوسروں سے کام لینے کا سنہری اصول یہ ہے کہ ان کے جذبۂ فرض شناسی کو مسلسل ابھارا جائے
ں سے اساتذہ کے دل میں مدرسہ کی فلاح و بہبود کے لیے جوش و خروش پیدا کرنا ایسے رہنما کا کام
ہ جو اپنی بصیرت اور قوتِ عمل کے زور پر اساتذہ کے خون کو گرماتا رہے اور تعلیم کے صحیح مقاصد
صول کے لیے بدنی اور ذہنی قوتوں کو بیدار کرتے ہوئے انہیں صحیح سمت میں منعطف کر سکے. القصہ
، ہیڈ ماسٹر کی کامیابی کا راز اس کے اندر قائد بننے کی صلاحیت میں مضمر ہوتا ہے. لیکن

این سعادت بزورِ بازو نیست ٭ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مطلب یہ ہے کہ ہر انسان میں لیڈر بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی. اور ہیڈ ماسٹر کے لیے
ں لیڈری کا سکہ اپنے ہمدا ساتذہ کے دل میں جمانے کے لیے سب سے بڑی دقت یہ ہوتی
. کہ بالعموم اس کا ماتحت عملہ علمی اور تدریسی تکنیک کے اعتبار سے ہیڈ ماسٹر سے کم تر نہیں
ا، بلکہ اپنے مخصوص مضامین میں بعض مدرسین کو ہیڈ ماسٹر پر فوقیت حاصل ہوتی ہے. ظاہر ہے
یسی جماعت کا رہنما ہیڈ ماسٹر غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہی ہو سکتا ہے. جو اپنی بیدار مغزی
جمع النظری، فرض شناسی. بلند حوصلگی، قوت برداشت. خوش خلقی اور خلوص و ہمدردی کے ذریعہ

لوگوں کے دلوں پر حکومت کر سکے۔ جسے اپنے زیردستوں کی مشکلات کا پورا پورا احساس ہو۔ جو
ان کے حقوق کی حفاظت کا ضامن سمجھا جاتا ہو، جو ناسا عد حالات میں بھی اپنے نیک ارادوں
میں متزلزل نہ ہو سکے۔ جسے اپنے مقاصد کی صداقت کا یقین ہو۔ اور جس کا ایمان ہو کہ :۔

جاء الحق وزہق الباطل ان الباطل کان زھوقا

ظاہر ہے کہ ان اوصاف کی موجودگی میں ہیڈ ماسٹر کو لیڈر بننے کی ضرورت نہیں پڑتی
وہ لیڈر ہوتا ہے اور لیڈر مانا جاتا ہے۔ بقول شخصے

حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

ان نظریاتی پہلوؤں سے ہٹ کر آئیے۔ اب تدریسی کام میں رہ نمائی کی عملی صورتوں پر غور کریں
ہم جانتے ہیں کہ کسی تعلیمی ادارے کا وجود بچوں کی تعلیمی بہبود اور تشکیل سیرت کی غرض سے عمل میں
لایا جاتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ایک اچھے معلم کو نفس مضمون پر عبور ہونے کے ساتھ ساتھ
اس مضمون کو بچوں کے ذہن نشین کرانے کے آسان ترین طریقوں سے بھی واقفیت ہونی چاہیے ا
اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ آج کے ایٹمی دور میں دنیا میں نت نئی تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی
ہیں، جس سے مضامین کی حدود بھی بڑھتی رہتی ہے۔ ان حالات میں وہی معلم حق تدریس ادا کر
سکتا ہے، جسے اس پیشے سے دلی لگاؤ ہو۔ جو اپنے خاص مضمون سے متعلق نئی اور معیاری کتب کا باقاعدہ
مطالعہ کر رہا ہو۔ اور جو علم کا اتنا بھوکا ہو کہ ہر نئی کتاب اس کے جذبۂ مطالعہ کو اور بھڑکا دے۔ علا
ازیں ترقی یافتہ ممالک میں طریقۂ تدریس کے نئے نئے تجربات ہوتے رہتے ہیں۔ ایک اچھا استا
ان تجربات سے فائدہ اٹھا کر اپنے حالات کے مطابق مناسب تبدیلیوں کے بعد ان طریقوں کو آز
ہے۔ ریفریشر کورسز میں شریک ہو کر نئے اور آزمودہ طریقہ ہائے تدریس سے روشناس ہو
رہتا ہے۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ کسی کام میں رہنمائی کی شرط اول اس کی تکمیل کے سلسلے میں پیدا ہونیو
مشکلات کا صحیح اندازہ ہے۔ اور یہ اندازہ نظریاتی نہیں عملی ہونا چاہیے جس کا مقصد یہ ہے

سرمعلم کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ معلم پہلے ہے اور سرمعلم بعد میں۔ یعنی اسے اعلیٰ قسم کا منتظم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قابل معلم بھی ہونا چاہیے۔ اور ایسے ہیڈ ماسٹر صاحبان اساتذہ میں علمی روح پھونکنے اور ان کی رہنمائی کرنے کے قابل نہیں جو انتظامی امور میں محو ہو کر اپنی تدریسی صلاحیت کو کھو بیٹھتے ہیں۔ پس سرمعلم کو نہ صرف اپنے پسندیدہ مضمون سے متعلق واقفیت میں اضافہ کرتے رہنے کی ضرورت ہے بلکہ اسے تعلیم سے بحیثیت مجموعی بہرہ ور ہونا چاہیے۔ گویا اس کا فرض ہے کہ وہ تعلیم میں جدید اور قابل عمل رجحانات سے باخبر ہو کر متعلقہ حضرات کو اس کی طرف توجہ دلائے اور اپنی بساط کے مطابق ایسی سہولتیں بہم پہنچائے کہ اساتذہ از خود نئے تجربات کر کے فن تدریس میں خوش گوار اضافے کرنے کے قابل ہو جائیں

چناں چہ لازم ہے کہ ہیڈ ماسٹر:-

(۱) اپنے وسائل کے مطابق تعلیمی رسائل اور طریقہ ہائے تدریس کے متعلق نئی کتب لائبریری میں منگوائے۔

(۲) نئے تجربات کے سلسلہ میں ماتحت عملہ کو مفید مشورے دینے کے ساتھ ساتھ ان کی حوصلہ افزائی بھی کرے۔

(۳) اپنی جماعت کا سلیبس تیار کرنے میں برابر کا شریک ہو۔

(۴) اپنے مضمون میں وقتاً فوقتاً نمونہ کے اسباق دے کر دکھائے۔

(۵) دوسرے مضامین میں تجربہ کار اساتذہ سے نمونہ کے اسباق دلائے۔

(۶) اپنی جماعت کے تحریری کام کی باقاعدگی سے تصحیح کرے۔

(۷) مناسب وقفوں کے بعد ٹیسٹ لیتا رہے۔

(۸) نمونے کی تفویضات تیار کرے۔

(۹) سبق پڑھانے کے لیے امدادی اشیا خود تیار کرائے۔

(۱۰) اپنے مضمون میں امتحان کا ایک آدھ پرچہ خود بنائے، اور سالانہ امتحان کے تمام پرچے MODERATE کرے۔

(۱۱) پرچہ دیکھنے میں اسی جفاکشی کا مظاہرہ کرے جو باقی اساتذہ سے توقع کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ معلم کو تعلیمی بہبود کے سلسلے میں اپنے آپ کو ایک ایسا مثالی استاد ثابت کرنے کی ضرورت ہے جو دوسروں کے لیے مشعل راہ ہو۔ اور جس کی خوشنودی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ فنا فی التدریس ہونا ہو۔ مندرجہ بالا تجاویز کا یہ مقصد قطعی نہیں ہے۔ کہ ہیڈ ماسٹر مدد اساتذہ پر رعب گانٹھنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دے۔ یہ تخریب ہے اور قیادت ہمیشہ تعمیری ہونی چاہیے۔ دراصل ضرورت اس امر کی ہے کہ ہیڈ ماسٹر مشکل سے مشکل منزل میں سے گزر کر دکھائے۔ تاکہ اس کا عملی نمونہ ناتجربہ کار اور کمزور اساتذہ کی دست گیری کا سبب بنے۔ اور وہ بھی اسی روش پر چل کر خود اعتمادی سے معروف کار ہو جائیں۔

ایک اچھے ہیڈ ماسٹر کو یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اگرچہ صلاحیتوں کے اعتبار سے سب لوگ ایک سے نہیں ہوتے۔ لیکن اس کے باوجود کمزور سے کمزور شخص بھی اپنے ساتھیوں میں نکو نہیں بننا چاہتا۔ چناں چہ ان کی کمزوریوں کی پردہ پوشی کرتے ہوئے ہر ایک پر اس کی استطاعت کے مطابق بوجھ ڈالے اور ایک دوست کی حیثیت سے سب کی عزت کا پاس رکھے۔ تاکہ مدرسے کا ہر کارکن اپنے آپ کو مدرسہ کی تعمیر میں برابر کا حصہ دار سمجھنے لگے۔ تدریسی کام میں خاطر خواہ نتائج اسی وقت پیدا ہو سکتے ہیں، جب ہر قسم کے تعلیمی پروگرام کی ترتیب و تنظیم میں اساتذہ کے صلاح و مشورہ کو دخل ہو اور کسی نئی سکیم پر بحث کے درمیان سر معلم ایسا طریقہ اختیار کرے کہ اس کی اپنی سکیم دوسروں کی طرف سے پیش ہو، اور اس کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے مدرسہ کا ہر کارکن اس کی افادیت کا قائل ہو۔ تاکہ اشتراک عمل پیدا ہو اور اس کی کامیابی کو ہر آدمی اپنی کامیابی خیال کرے۔

ایک لیڈر کی حیثیت سے ہر ہیڈ ماسٹر کا فرض ہے کہ جہاں وہ ہر نئے تجربے کی کڑی نگرانی کرے۔ اور ضرورت کے مطابق مشورہ کی صورت میں تنقید کرتا رہے۔ وہاں مستحق افراد کی کارکردگی کی تعریف کرنے میں بخل سے کام نہ لے۔ البتہ کسی کے اچھے کام کی داد دیتے وقت دوسرے کے احساسات کو ٹھیس نہ پہنچائے۔ بلکہ ایسا طریقہ اختیار کرے کہ یہ تحسین و آفرین اساتذہ میں صحت مند مقابلہ کا سبب بن جائے۔

متذکرہ بالا نظریات اور طریقۂ کار کی صحت اور افادیت سے شاید کسی کو بھی انکار نہ ہو۔ البتہ عملی دنیا میں کسی دشوار گذار راستے پر گامزن ہونے میں مشکلات محسوس ہوتی ہیں۔ لیکن اس اہم ذمہ داری کو سنبھالنے کے ساتھ خود فراموشی ضروری ہے۔ تاکہ قوم کو ایسے معمار مل جائیں جو اس لیے زندہ رہنا چاہیں کہ وہ قوم کے خدمت گذار ثابت ہو سکیں۔ اگر ہم یہ قربانی نہیں کر سکتے تو ہمیں ہیڈ ماسٹر بننے کی جرأت ہی نہیں کرنی چاہیے۔ بقول غالب ؎

جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

❖

وسطانی جماعتوں میں اُردو تدریس

اور

ہمارے تعلیمی مسائل کا حل

نعمان عارف برنی

یہ مقالہ اُردو تدریس کانفرنس کے اجلاس مورخہ ۲۹ دسمبر بروز جمعۃ المبارک ۱۹۶۲ء منعقدہ مینارڈ ہال، زیر اہتمام پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں پڑھا گیا (مدیر

جہان تازہ کی، افکار تازہ سے، ہے نمود
کہ سنگ و خشت، سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

اُردو زبان، جو جاپان سے لے کر مصر کی بندرگاہوں تک آسانی سے بولی اور سمجھی جاتی ہے، ا
دنیا کی اکثر یونیورسٹیوں میں جس کی تدریس کا باقاعدہ انتظام ہے۔ اِس کے متعلق ہم اپنے گھر میں نہیں۔ بلکہ خ
اُردو کے مرزبوم میں، یہ سوچنے کے لیے جمع ہوئے ہیں، کہ اس کی تدریس کے وسائل کیا کیا ہونے چاہئیں

یہ ایک حیران کن حقیقت ہے کہ ہم اور ہمارے بچے، جب کتم عدم سے عالم وجود میں آتے
تو، اُن کے کانوں میں اللہ اکبر اور صلاح و فلاح کے بول سنائے جاتے ہیں۔ اور ان کے گہوارے میں ما
اردو اور دیسی زبانوں کی رس بھری لوریاں گاتی ہیں۔ لیکن آگے چل کر یہی بچے، تحتانی، وسطانی، اور فوقانی جما
سے گذرتے ہوئے جب کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پہنچتے ہیں تو مادری زبان کے میٹھے بول کا جادو ان
سے اتر چکا ہوتا ہے۔ اور وہ اعلیٰ تعلیم کے ماحول میں، کیک کھا کھا کر سویّوں کا مزہ بالکل ہی بھول چکے ہوتے
ہیں۔

ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارا وطن، زرعی ملک ہے۔ تعلیم کے لحاظ سے بھی اوسط خواندگی بیس فیصد

مشکل سے ہوگا۔ ان حالات میں زیادہ تعداد ایسی ہے، جو پرائمری جماعتوں تک ہی حرف شناس ہو کر علم کو سلام کہہ دیتی ہے۔ اس کے بعد عوام کا اہم حصہ، وسطانی اور فوقانی جماعتوں میں داخل ہوتا ہے۔ میٹرک تک آتے آتے خاصی تعداد کم ہو جاتی ہے۔ اس سے آگے کا حال کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نتائج سے ظاہر ہے لہٰذا تعلیم کی دنیا میں وسطانی جماعتیں ہی، بدن میں ریڑھ کی ہڈی کی طرح اہم حیثیت رکھتی ہیں۔ جن کی بہتری اور مہارت کے لیے ملک کے بہترین دماغوں کو اس طرف زیادہ توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔

ان جماعتوں میں دینیات، ریاضی، معاشرتی علوم، سائنس، حفظانِ صحت اور زراعت وغیرہ تمام مضامین اردو میں پڑھائے، سمجھائے، لکھائے اور یاد کرائے جاتے ہیں۔ بلکہ غیر ملکی زبانوں میں سے فارسی، عربی اور انگریزی کی تدریس بھی اردو کے ذریعہ ہی عمل پذیر ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں، جب کہ یہ سب مضامین اردو کے ذریعے ہی پڑھے اور سمجھے جا رہے ہوں۔ یہ نہایت ضروری ہو جاتا ہے کہ اس زبان کی بنیاد اور طالب علم کی ذہنی بلندی اور پختگی، اتنی ارفع اور ٹھوس ہونی چاہیے کہ وہ تمام مضامین کے ساتھ کما حقہٗ طور پر عہدہ برآ ہو سکے۔

وسطانی جماعتوں میں اردو تدریس کے وسائل اور طریق کار پر چند گذارشات پیش کرنے سے قبل اس ماحول یعنی استاد، طالب علم، درسی کتب اور اسکولوں کا مختصر طور پر جائزہ لینا ضروری سمجھتا ہوں۔ جس میں ام المضامین، یعنی اردو، ترسیلِ تعلیم و تدریس ہے۔

استاد کبھی معمار قوم کہلاتا تھا، لیکن دنیا کے انقلابات، اخلاقی اقدار کی تبدیلی اور کساد بازاری نے اسے ہل جوتنے والے بیل سے بھی بدتر بنا دیا ہے۔ آمدنی کم ذرائع محدود، سفید پوشی کا دکھاوا۔ اخلاق کی علمبرداری اور ایسی ہی سماجی اور معاشرتی الجھنیں، اس کو ہر وقت پریشان رکھتی ہیں۔ اسکول کی چار دیواری میں جب داخل ہوتا ہے تو سو، سوا سو بچوں کا گلہ اس کی ہنر کاری کے لیے تیار ملتا ہے۔ تس پر فیس وصول کرنا اور منشیانہ کام کی بھرمار الگ۔ غرض کلاس میں اس طرح مجوزہ پروگرام میں سے نصف وقت بھی مشکل سے تعلیم پر خرچ ہو پاتا ہے۔ اس کے برعکس کلرک، ہر روز دفتر آتا ہے اپنا کام ختم کر کے چلا جاتا ہے۔ افسر اور تاجر اپنا اپنا کام وقت کے ساتھ ساتھ ادا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن استاد ہر روز سکول بھی آتا ہے۔ کام بھی کرتا

لیکن اِس کا اصل معاوضہ سارے سال کی محنت کے نتائج ہیں۔ یعنی اس کی داڑھی کی لاج بچوں کے ہاتھ میں ہے اگر نتائج خراب ہیں تو چند روپے کی سالانہ ترقی بھی بند۔ اور دوسرے نااہلی کے خطابات مزید برآں۔ اگر اعداد و شمار فراہم کیے جائیں، تو ان اساتذہ میں یا تو وہ لوگ ملیں گے جنھیں دوسرے محکموں میں جانے کا موقع میسر نہیں آسکا ہے۔ یا ایسے لوگ ہوں گے جن کی سوائے اِس پیشے کے اور کہیں کھپت... نہیں ہو سکتی کیوں کہ تدریس کی دنیا ہوشمند دماغوں کے خیال میں کوئی آبرومندانہ پیشہ اختیار کرنے کے لیے مجبوری زینے کا کام دیتی ہے۔

اس قسم کے ناخوش گوار ماحول کی بنا پر اساتذہ کے علم کا معیار زوال پذیر ہے۔ اکثر اوقات ان کی علمی وسعت، صرف ان چند باتوں تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ جو آٹھویں یا دسویں جماعتوں میں رٹ رٹا کر ذہن کے کسی گوشے میں ڈال لی تھیں۔ اور ایسے ہی لوگ قوم کے پروان چڑھنے والے نوخیز دماغوں کی توڑ پھوڑ میں بہترین منتظم ہونے کی ڈفلی بجا رہے ہوتے ہیں۔

ایک استاد کے فرائضِ علمی کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اردو، فارسی، عربی۔ انگریزی، سائنس، علمِ ریاضی، علمِ جغرافیہ۔ علمِ معاشیات، علمِ قراءت و تجوید یا حسنِ تحریر، اور اعلیٰ ترین کردار و عمل کا نمونہ، سادہ مزاج و سادہ لباس اور سادہ عادات لیکن محدود اور علمی معروفیات کا حامل ہوتا۔ لیکن یہاں تو مادری زبان کے استاد کا میسر آنا بھی اندھے کے ہاتھ بٹیر لگنے کے مرادف معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے ملک میں مغربی طرز کی یونی ورسٹیوں میں، جب علومِ مشرق کے امتحانات کی بے سروپا قسم کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی تو سب سے پہلے علامہ شبلی نے اِس کے خلاف آوازِ حق بلند کی تھی کہ اس انداز میں جب مشرقی زبانوں کے فاضل بنائے جائیں گے تو وہ علامۂ وقت بننے کے بجائے، فاضل دیبکا لیتے چلے جائیں گے۔ تمام یونیورسٹیوں سے قطع نظر صرف پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی زبانوں میں سے فارسی، پنجابی، ہندی، پشتو، عربی، سنسکرت اور اردو کے جو امتحانات منعقد ہوتے رہے ہیں۔ ان میں سے اردو زبان کے تینوں امتحانات کے نتائج کا آغاز سے لے کر اب تک جائزہ لینے پر یہ بات پورے طور پر ثابت ہے کہ اردو کے فاضل کو امتحان پاس کرنے کے لیے سوئی کے ناکے میں سے اونٹ کی طرح، اپنے آپ کو نکالنا پڑتا ہے۔ اور اس کے باوجود اِس امتحان کے نتائج دو تین فی صدی سے لے کر پندرہ بیس فی صدی تک ہی رہا ہے۔

اگر کوئی قسمت کا دھنی یہاں سے کامیابی لے بھاگتا ہے تو وسطانی مدارس میں تدریس کے دروازے اس پر بند ہیں کیوں کہ منشی فاضل پاس، اردو فارسی دو زبانیں جانتا ہے۔ وہ زیادہ ترجیح کے قابل ہے اگر ڈ کے دانے پر سپیدی اور سیاہی میں بھی کوئی نہ کوئی نسبت ہوتی ہے۔ لیکن اردو زبان اور اس کی تدریس کے لیے اساتذہ کی موجودگی میں تو نسبت کا کوئی پہلو بھی سامنے نہیں آتا۔

طالب علم خواہ پہلی جماعت کے ہوں یا منتہی کلاسوں کے، سب ایک ہی ڈگر پر چل نکلتے ہیں یا یہ کہہ لیجیے کہ حالات انہیں قعرِ گمراہی کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ اصولی طور پر تو طالب علم کے دماغ کی لوح پر دقت، ماحول، والدین، استاد، تعلیم اور معاشرہ جو بھی نقوش کھینچیں گے وہی مرتسم ہوں گے۔ اس لیے طالب علم کو اس کی کج رویوں سے بری الذمہ قرار دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ کیوں کہ یہ معصوم بھیڑیں، گائیں اور بکریاں ایسے اصطبل میں لے جاکر باندھ دی جاتی ہیں، جہاں پر نہ گھاس ہوتی ہے نہ دانہ۔ وہ پہلی سے آٹھویں نویں کلاس تک اچھلتے اور پھلانگتے چلے آتے ہیں۔ لیکن یونیورسٹی کے امتحان میں شرکت کر کے، چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ اور ماں باپ بھی بچے کے ناکام ہونے پر ایک جھرجھری لیتے ہیں۔ اور آٹھ سال تک گہری نیند سوتے رہنے کے بعد، ٹیوشن پر ٹیوشن رکھ رکھ کر، اس مستقل بیمار کی جاں بخشی کی کوششیں کرنے لگتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ طلبا میں، ابتدا سے ہی تن آسانی۔ درسی کتابوں سے فرار۔ مزیدار کہانیوں کی چاٹ۔ خلاصوں اور شرحوں کی لت گائیڈوں اور گیس پیپروں کا لپکا، اور ناجائز ذرائع سے پاس ہونے کی دوڑ دھوپ، جیسی غیر تعلیمی مزمن بیماریاں لگ جاتی ہیں۔

درسی کتابوں میں سے، اردو زبان میں پڑھائے جانے والے مضامین میں، دینیات کو لیجیے۔ سابق حکومتوں نے دینیات پڑھانے کی اجازت تو دیدی، لیکن بے دلی کے ساتھ اجازت بھی چل نکلی اور بے دلی بھی رنگ لاکر رہی سوال پیدا ہوا کہ کون سا دین پڑھائیے؟ آخر لے دے کر فیصلہ ہوا کہ بس قرآن۔ اس کی رہ نمائی کے لیے ایک عربی قاعدہ اور سیرت النبیؐ کے سلسلے میں حسبنہ حالات و واقعات، یہ نکلا خلاصہ اس عظیم سمندر کا، جس نے

سوں اور مذہبوں کی تاریخ، راستے اور کتابیں بدل ڈالی تھیں۔ اس کی تبلیغ اور نشر و اشاعت کا
ۂ کیا مختصر سوچ لیا گیا۔ قاعدے لکھوائے گئے۔ نئے نئے ماہرینِ تعلیم اور علم کے روپ
طلبِ زر کا بہروپ بھرنے والوں نے پچھلے تمام قاعدوں پر خطِ تنسیخ پھیر دیا۔ سنا ہے کہ
بڑھ سو قاعدوں اور سیرت کی کتابوں میں سے صرف چھپے چھپے، سات سات کتابیں
رینِ تعلیم اور مشیرانِ علم و ہنر کی نئی عینکوں پر درست اتر سکیں۔ کتابیں منظور ہو گئیں۔ عوام
خریدلیں۔ نئی تجویز پاس ہوئی کہ سکولوں کے ہیڈ ماسٹر صاحبان کی صوابدید پر منحصر ہے کہ چاہے
یات کا امتحان لیں یا اسے نظرانداز کر دیں۔ پھر بھلا کون امتحان دے، اور کون ایسے فالتو
نمون کے لیے دردِ سری مول لے۔ دینیات کے لیے الگ استاد مقرر کرنے کا تو سوال ہی پیدا
یں ہوتا۔ بعض ہیڈ ماسٹروں کی معکوس فہمی نے ٹائم ٹیبل میں ایسی بندر بانٹ شروع کی کہ بس
نہ پوچھیے۔ سائنس، انگلش اور فزیکل ایجوکیشن کے ماسٹر صاحبان بھی دینیات کے تین پیریڈ
لگانے کے لیے لگا دیے گئے۔

یہ کیا نکلا! وہی جو اپنی ڈگر سے ہٹ کر کام کرنے کی عادت سے نکلتا ہے۔ یہ تو تھا مڈل تک
حال۔ نویں، دسویں جماعتوں میں نصاب موجود ہے۔ کتاب غائب۔ بی۔ اے تک بھی کچھ ایسا ہی حال ہے
۔ اے میں جا کر اسلامیات کا مضمون پھر آنمودار ہوتا ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچنا دو چار ہی کی قسمت میں
ہے۔ ورنہ تمام قوم تو بس نیچے ہی ادھر ادھر ہو جاتی ہے۔ مقامِ فکر ہے کہ ان حوصلہ افزا حالات
برعکس، موجودہ فعال حکومت نے پاکستان کی صحیح آئیڈیالوجی اور اسلامی علوم کو نئی نسلوں کے اذہان میں
کرنے کے لیے عملی اقدامات کی جن پیش بندیوں کا آغاز کیا ہے وہ فیہ المراد کا مظہر نہیں گی۔

وسطانی جماعتوں میں تدریس کا ایک خاص دور، یہ بھی رہا ہے کہ تمام مضامین انگریزی میں پڑھائے
تے تھے۔ اس وقت طلبا، سائنس اور اردو میں سے، اردو ہی سیکھنے لگاتے تھے، لیکن جب
مضامین اردو میں منتقل کر دیے گئے، یعنی جب سائنس کا کافر مسلمان ہوا۔ تو اردو کا مسلمان کافر
لیا۔

یونیورسٹی اور بورڈ کے نتائج میں سائنس اور اردو کے نتائج کا تقابل کر کے دیکھیے۔ معاملہ حقائق کی دنیا میں برعکس ہی ملے گا۔

اردو میں پڑھائے جانے والے دوسرے مضامین سے قطع نظر خود اردو کی درسی کتابوں کا معیار دن بدن زوال پذیر ہے۔ اس کے علاوہ ٹائم ٹیبل میں دوسرے مضامین کی نسبت کم پیریڈ دیئے جاتے ہیں۔ اور ان میں سے بھی اکثر پیریڈ انگریزی اور ریاضی کے اساتذہ ہڑپ کر لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ سال ختم ہونے تک کتابوں کے عدم تکمیل پانے کی شکایات عام ہیں۔

اسکولوں پر نظر ڈالیے تو ان کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ پہلی قسم انگریزی طرز کے کانونیٹ اسکول جن میں اردو کے لیے دروازے قطعاً بند ہیں، دوسرے سرکاری مدارس، جہاں پر ہر چیز سرکاری ہو جانے کے بعد، گہرے انہماک اور قومی لگن کے بجائے، تن آسانی اور فرائض منصبی سے فرار اور دھڑلے بندیاں نظر آتی ہیں۔ تیسری قسم امدادی اسکولوں کی ہے۔ ان میں بھی اے ٹائپ اور بی ٹائپ اور سی ٹائپ تینوں قسم کی درجہ بندی کی ہوئی ہے 'اے' ٹائپ اسکول معائنے اور بازپرس سے ماورا ہیں۔ بی ٹائپ کے اسکول سال دو سال میں ایک بار اور سی ٹائپ صرف منظوری حاصل کرنے کے آغاز میں۔

ان اسکولوں میں سے وہ اسکول جو منظور شدہ بھی ہوتے ہیں اور امداد سے بھی بے نیاز۔ ان کے ہاں تعلیم و تدریس کا جو ڈھڑا بنتا ہے وہ ناگفتنی ہے۔ ذرا غور فرمائیے جس اسکول میں پہلی سے دسویں جماعت تک تین چار ہزار کے قریب طلبا کی آبادی ہو۔ ہر کلاس کے دس دس، بارہ بارہ، ڈویژن ہوں۔ ہر فریق میں سو ڈیڑھ سو بچے ہوں تو وہاں پر فیسوں کی رقم سے بوریاں اور تجوریاں بھرنے کے علاوہ اور کیا ہوتا ہوگا؟ ان کے طلبا اس وقت تک ان اداروں کے مکمل طالب علم نہیں بن پاتے جب تک محکمانہ طور پر درسی کتابوں کے علاوہ دو گنی تگنی غیر درسی کتابوں کا پشتارہ بستہ میں ٹھونس کر پانچ سات سیر وزن، روزانہ بغل میں دبائے ہوئے، کمہار کے گدھے کی طرح اسکول اور گھر کی ہیرا پھیری کے عادی نہ بن جائیں۔

سال میں تین سو پینسٹھ دن ہوتے ہیں۔ اسکولوں کے رجسٹروں میں طلبا کی حاضری

تقسیم سے پہلے اور بعد میں دو وقت دکھائی جاتی ہے۔ محکمانہ پابندی یہ ہے کہ اسکول کم از کم دوسو دن ضرور لگا ہو۔ یعنی سال میں سات ماہ تعلیم پر ضرور صرف ہوئے ہوں۔ لہٰذا اس کی خانہ پُری کیلیے وہ حاضریاں کسی نہ کسی طرح حاضری کے رجسٹروں میں درج کردی جاتی ہیں۔

رات دن اسی قسم کے روح فرسا حالات، قومی دولت، وقت اور نئی نسل کی آوارہ خرامی دیکھتے ہوئے انفرادی طور پر مئی ۱۹۵۳ء سے اب تک حکومتِ پاکستان کی وزارتِ تعلیم سے لے کر ڈویژنل انسپکٹر صاحبان تک کی خدمت میں تجاویز اور گذارشات کی شکل میں اپنی آواز پہنچانے کی جسارت کی جاتی رہی ہے

دیہاتی جماعتوں کے اسکولوں کیلیے میری تجاویز کو پسند فرماتے ہوئے محترم جناب سی ایم صادق صاحب حال ڈائرکٹر تعلیم بہاولپور نے سرکلر نمبر ایم ۹۱۸۰ کے ذریعہ تمام اداروں میں جاری فرمایا جس میں سے چند ایک ضروری باتوں کی تفصیل یہ ہے۔

(1) Use of unantharised boohs, keys, nobs etc Should he StPPed.

(2) Rough work with pencil should be prohibited. Inkpots and pens should be used by school-boys and girls for written work in the class rooms.

(3) The Headmasters, as well as the teachers should properly check and date the written work of the students.

(4) As far as possible, all the 8th class students should be sent up for Ver. Final Middle School examination.

(5) At annual and quarterly examinations supply of stationary should be made by the school and printing of question papers should be also arranged by the Headmasters as economically as possible.

(6). Income from discount or comission should be utilized for the free distribution of text books and stationary to deserving poor students. It should be not go to the school management or

(7) All the text books must be completed by the teachers during the academic year by dividing them into weekly and monthly lessons and their work should be checked by the Headmasters regularly.

(8) Private tuition work and office work done by the teachers should be stopped.

(9) The parents of the students should be requested to supervise their works properly and co-operate with the teachers.

(10) Educational Weeks and parents days should be observed by the Heabmasters frequently.

(11) Publishers, booksellers, other businessmen and entertainment concerns should be requested to devote towards school education.

طویل ترین خط و کتابت اور تعلیم کے ارباب بست و کشاد اور میرے درمیان، اگرچہ شکریہ کا تو تبادلہ نہایت باقاعدگی کے ساتھ ہوتا رہا، لیکن وسطانی جماعتوں میں خصوصاً اور تعلیم کے با[قی] شعبوں میں عموماً، جن جن بے قاعدگیوں نے گھر کر لیا ہے، وہ اس وقت تک دور ہونی ناممکن ہیں، جب تک استاد، طالب علم، مدارس، والدین، ہیڈ ماسٹر صاحبان، انسپکٹر صاحبان، محکمہ تعلیمات اور عوام اپنی تمام مساعی کو تعلیمی کمیشن کی طرف سے پیش کردہ تجاویز کی روشنی میں کامیاب بنانے کے لیے تن، من، دھن، خیال اور عمل سے پورے طور پر معروف تک فنا نہ ہو جائیں

اردو زبان جس کے افعال و قواعد ہندی سے، مرکبات فارسی سے، شاعری کے اوزا[ن] عربی سے اور سائنس کی مصطلحات انگریزی سے اخذ کی گئی ہیں وہ کسی کی ذاتی میراث نہیں ہے — اگرچہ اس وقت بھی میدان طباعت و اشاعت میں چند ایک ادارے اجارہ دار بن بیٹھے ہیں اور ہماری زبان کے ادبی سپید آقاؤں نے اسے ایک خاص دائرہ میں من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو کی گردان کرتے ہوئے محدود کر رکھا ہے۔ اور قلم کار جنہوں نے اردو کے ہاتھوں، اپنے دماغ و قلم کو چار چاند لگائے ہیں، اپنے آپ کو تراجم کے چکر میں پھنسا کر اب

تخلیقی ادب کو خدا حافظ کہتے ہوئے نظر آرہے ہیں (میں نے اپنی کتاب "اردو رسم خط اور تحریر کا ارتقا"
میں ان کی اقسام، طریق کار اور عملی اقدامات پر مفصل بحث کی ہے) اور ایسی کتابوں کے پشتارے
ملنے میں شبانہ روز اپنے آپ کو مصروف رکھتے ہیں جو دیمک کی غذا اور گوداموں کی شکم پری کے
علاوہ اور کسی مصرف میں نہیں آرہیں۔ عوام اور وسطانی جماعتوں کے طلبا، اساتذہ اور سکولوں کے
لیے اس قسم کے ادب کی ضرورت ہے جو اردو زبان کی تدریس کے سلسلے میں درجہ وار الفاظ کی کھپت
بنانے میں مدد دے سکے۔ املا نویسی کو فروغ دے سکے۔ طلبا کے اذہان میں ذخیرۂ الفاظ
اور ایک جماعت سے دوسری جماعت میں از خود ذہنی بالیدگی پیدا ہونے کے لیے مددومعاون
ثابت ہو۔ اس قسم کے لٹریچر کے لیے لغات سازی کے اداروں کو اپنے اندر مدغم کرنا ہوگا، اور سب کے
مل جل کر کام کرنے سے ان الفاظ کی چھان پھٹک، درجہ بندی اور تدریجی ترقی کو مدنظر رکھتے ہوئے
تعلیم تر اردو لغت کے ساتھ ساتھ اس قسم کا تعمیری لٹریچر بھی عوام کے ہاتھوں میں آسانی سے پہنچ سکے گا۔

جنوبی ایشیا کی انسانیت آموز قوموں کی طویل ترین تاریخ کی حامل زبانوں، عربی اور فارسی
کا خصوصاً اور اردو کا عموماً نستعلیق اور خطاطی سے خاص تعلق رہا ہے اور اب بھی ہے۔ لیکن نئی پود
"گھسیٹ در گھسیٹ" کے چکر میں آ پھنسی ہے۔ اس قعر بدخطی سے نکالنے کے لیے بھی ہمارے تعلیمی
اداروں میں دینیات کے معلمین، اسلام کی ترویج کے لیے مدارس میں مسجد کا لازمی وجود، قرأت و
تجوید کے لیے قاری حضرات کی فراہمی کے ساتھ ساتھ حروف ہجا کی نوک پلک سنوارنے کے لیے
خوش نویس حضرات کا بطور مستقل مدرس، ادارۂ تحریر میں ہونا از حد ضروری ہے۔ اور اس
ضرورت کے لیے اس قسم کی خوش خط ساز، چھوٹی چھوٹی سلیپ نما، درجہ وار کتابوں کی ضرورت ہے۔
جو کم از کم تیسری جماعت سے شروع ہو کر بارھویں جماعت تک مستقل طور پر ہونہار بروا کے
چکنے چکنے پات اور چکنا سکیں۔

اردو کی درسی کتابوں کے لیے ذخیرۂ الفاظ کی مدد سے ۱۹۶۲ء کے بعد سے اب تک
معیاری اور تدریسی ادب کے تال میل کے ساتھ، اس قسم کی کتابوں کی ضرورت ہے۔ جو تدریجی تدریس میں

طالب علم کے ذہن کو بارہویں جماعت تک اِس قابل بنا دیں کہ وہ ادیب فاضل جیسے امتحان کو بازیچۂ اطفال سمجھنے لگے، اور تخلیقی ادب کا مطالعہ کرنا اِس کے لیے آسان ہو جائے، تاکہ وہ آگے چل کر ممکن ہے خود بھی قوم و ملک و وطن اور ننھے بچوں کی رہ نمائی میں ایک عظیم مشین کا کوئی پرزہ بن سکے۔

وسطانی جماعتوں کے لیے خصوصاً اور باقی تمام جماعتوں کے لیے عموماً، ایسے استاد ساز اداروں اور ان کی رہ نمائی کے لیے صحیح اردو آموز کتابوں کی ضرورت ہے، جن کی مدد سے کشمیری، پنجابی، پشتو، سندھی، بنگالی اور انگریزی زبانوں کی علاقائی حد بندیوں سے ہٹ کر پاکستانی اور عین اسلامی تہذیب کے پروان چڑھنے میں مدد مل سکے۔

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے۔ ہمارا وطن ایک زرعی ملک ہے اور وہ بھی دو حصوں میں منقسم جو ایک دوسرے سے ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ ان دو منطقوں کو ہم آہنگ کرنے کے لیے لامحدود ذرائع مہیا کرنا اور ہم خیال دوستوں کی فراہمی جیسے سنگین مسائل سے عہدا برآ ہونا ہماری حکومت کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔

ان حالات میں ہمارے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم نے الگ الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر اپنی اپنی ڈفلی۔ اپنا اپنا راگ الاپنے رہنے کے لیے جو بہت سی تنظیمیں بنا رکھی ہیں (اور قومی دولت کو چاہے وہ حکومت کے دروازے سے ہاتھ آئے یا عوام کے ہاتھوں سے، غلط اندازمیں اِدھر اُدھر کر رہے ہیں) انھیں اردو زبان کی صحیح تدریس اور بقاء کے لیے ان کو کسی ایسے سلسلے میں منسلک کرنے کی ضرورت ہے، جس میں سب کا لائحہ عمل تو ایک ہی بن جائے، لیکن وہ اجتماعیت کے ساتھ ساتھ انفرادی شعبوں کو سنبھالتے ہوئے صحیح قسم کے تعمیری کام انجام دینے کی اہل بن سکیں۔

ترکی کی مشہور مفکرہ خالدہ ادیب خانم نے اِس ملک میں سفر کرتے ہوئے ڈاکٹر مولوی عبدالحق سے جنھیں ابھی مرحوم کہنے پر طبیعت مائل نہیں ہوتی کہا تھا۔

TRY TO GET ANONYMOUS WORKERS

اب بھی ہمیں ایسے ہی نام و نمود سے ہٹ کر کام کرنے والوں کی ضرورت ہے۔
مذکورۃ الصدر متکرہ نے اپنے سفر نامے میں ایک جگہ بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ "اوکاڑہ تمام شہروں میں جو میں نے اب تک دیکھے تھے۔ لاہور زیادہ خوش حال نظر آیا۔ نواحِ دیہات بھی خاصے کھاتے پیتے معلوم ہوتے تھے۔ دوسرے مرکزوں کی نسبت اس کی حالت اچھی ہے۔ ہر شخص تندرست، جاندار اور پیٹ بھرا نظر آتا ہے اور یہاں کے اکثر آدمی شکل و صورت میں نسل انسانی کے بہت اچھے نمونے ہیں"۔ اس خراجِ تحسین کے بعد میں یہ کسی طرح بھی باور کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ یہاں پر تعمیری کام انجام نہ دیے جا سکیں۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ وہ سرزمین، جہاں پہ تجویزِ پاکستان کی یادگار کے طور پر، پارک اور یادگاریں تعمیر کی جا رہی ہیں۔ اسی مقام سے اردو کو اس کے صحیح قسم کے گہنے پہنانے کے کام کا آغاز کیا جائے گا۔ کیوں کہ بقول حکیم الامت حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ۔ ؎

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے

یہ صحیح ہے کہ کارِ جہاں بہت دراز ہے اور بقول مشہور فلسفی ایمرسن "اسکولوں اور کالجوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ تعلیم نہیں ہے صرف حصولِ تعلیم کا ذریعہ ہے"۔ لیکن آزادی، حریت، جوشِ دین و ایمان اور انسانیت کی خدمت کے نام پر اس قسم کے تعمیری کاموں کے انجام دینے کا ایک دفعہ بیڑا اٹھالیا جائے تو یہ بات بالکل یقینی ہے کہ ہماری قومی جسد میں جو بھی اخلاقی، عمرانی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی، ذہنی، جسمانی، دینی، دنیاوی اور تعلیمی بیماریاں گھن کی طرح لگی ہوئی ہیں، ان کو فنا کے گھاٹ اتارا جا سکتا ہے۔ ؎

مددِ لطفِ ہمت دشوار پسند
کام آسان ہوا جاتا ہے

٭

اُردو کی پہلی کتاب

آزاد کا ایک درسی شہکار

ڈاکٹر وحید قریشی

"بڑا حصّہ عمر کا سررشتۂ تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی تصنیف میں صرف ہوا۔ وہ کتابیں نام کو ابتدائی ہیں، مگر مجھ سے انھوں نے انتہا سے بڑھ کر محنت لی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جب تک انسان خود بچہ نہ بن جائے تب تک بچوں کے مناسب حال کتاب نہیں لکھ سکتا۔ پھر انھیں بار بار کاٹنا اور بنانا۔ لکھنا اور مٹانا۔ بوڑھا ہو کر بچہ بنا۔ پھرتے چلتے۔ جاگتے سوتے، بچوں ہی کے خیال میں رہا۔ مہینوں نہیں بلکہ برسوں صرف ہوئے، جب وہ بچوں کے کھلونے تیار ہوئے"۔ (مکتوبات آزاد صـ۹۵)

بچوں کے یہ کھلونے آزاد نے اپنی خواہش اور مرضی سے تیار نہیں کیے۔ بلکہ انھی کے قول کے مطابق "بندگی بے چارگی۔ آخر نوکر تھا وہ نہ کرتا تو کیا کرتا"۔ لیکن آزاد نے محض نوکری نہیں کی خلوص نیت سے اِس کی آبیاری بھی کی ہے۔ فرض کو فرض جان کر ادا کیا ہے۔ راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر کے درسیات میں وہ کمال دکھایا کہ ان کا کارنامہ رہتی دنیا تک رہے گا۔

کتاب کا پہلا سبق ہے :-

"ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ باپ حقہ پی رہا ہے اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے بچہ آنکھیں کھولے پڑا ہے، انگوٹھا چوس رہا ہے۔ ماں محبت بھری نگاہوں سے اس کے منہ کو تک رہی ہے۔ اور پیار سے یہ کہتی ہے، میری جان! وہ دن کب آئے گا کہ میٹھی میٹھی باتیں کرے گا بڑا ہو گا، سہرا باندھے گا۔ دولہا بنے گا، دلھن بیاہ لائے گا۔ ہم بڈھے ہوں گے تو کمائے گا۔ آپ کھائے گا، ہمیں کھلائے گا۔ بچہ مسکراتا ہے تو ماں کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے"۔

بظاہر یہ ماں کی ماستا اور باپ کی محبت کا ایک سیدھا سادہ بیان ہے۔ فضا میں اپنی سوچ کے سہارے بڑھتے جانا تو بڑا آسان ہے۔ لیکن ایک بچے کی زندگی کا، اس کے احساسات کا، اس کی

دل چسپیوں کا۔ گھر کے اندر اور باہر کی جذباتی زندگی کا گرد و پیش ہونے والے حالات اور گفتگو کا ایک شعور جو پھلجھڑی کی طرح ابھرے اور بچے کی خواہشات اور مزاج کو اپنی گرفت میں لے کر اسے تخیل کی دنیا سے آہستہ آہستہ زندگی کی طرف پھیر دے۔ دیکھنے والے کے لیے محض بیانیہ انداز کا کمال نہیں ہے، درسی کتاب کا مصنف محض احساسات کی رو کو کاغذ پر نہیں اتارتا، اسے بچے کی ذات، اس کی ذہنی سطح اور اس کی جذباتی زندگی کے آتار چڑھاؤ کا ادراک بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس تگ و دو کا ایک سرا انسانی مسرت سے آگاہی کے ساتھ اور دوسرا ابلاغ کی حدود سے ملتا ہے۔ یہ حدود زبان کو ایک نامیاتی حقیقت کے طور پر ہی موجود نہیں بلکہ استاد اور شاگرد کے درمیان ایک ٹھوس وسیلے کے طور پر بھی وجود رکھتی ہیں۔ زبان عام استعمال میں اسی وسیلے کا اظہار ہوتی ہے۔ اور بولنے والے اور سننے والے کے مابین ایک ذہنی اشتراک عام طور پر پایا جاتا ہے، فصاحت کا گر بھی یہی ہے کہ کہنے والا سننے والے کے ذہنی معیار کا پاس و لحاظ کرتا ہے۔ لیکن یہ پاس و لحاظ موقع اور محل کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے۔ ہم اور آپ غیر شعوری طور پر اسی معیار کا سراغ لگاتے رہتے ہیں۔ لیکن اسے شعوری سطح پر محسوس نہیں کرتے۔ شعوری طور پر جاننا اور اس کے مطابق اپنی گفتار کو ڈھالنا یا اپنے ذہنی عمل پر خیالات و جذبات کے اظہار کے علاوہ ایک خاص ڈھب سے پیش کرنے کی پابندی لگانا بہت سی مشکلات کا پیش خیمہ ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تخلیقی عمل ابلاغ یا communication کے مراحل سے بہ آسانی نہیں گذر سکتا۔ ادیب کی توجہ دو طرف بٹ جاتی ہے۔ اپنی بات کہنے کا اور دوسرے کی ذہنی سطح کا خیال، دونوں کو شعوری سطح پر آ کر اپنا اپنا راستہ بنانا پڑتا ہے تو پیکار شروع ہو جاتی ہے جس میں ایک عمل دوسرے کی نفی کرنے لگتا ہے۔ اس جنگ میں یا تو قاری نظر انداز ہو جائے گا یا اپنی گرہ کا مال سر بازار لٹ جائے گا۔ لیکن آزاد کا کمال یہ ہے کہ وہ بچے کی ذہنی سطح کو بھی سامنے رکھتا ہے۔ اور اپنی تحریر میں خشکی اور بے ربطی بھی پیدا نہیں ہونے دیتا۔ وہ اپنے تخلیقی عمل کو ایک بے تعلق ناظر کی طرح دیکھتا ہے پرکھتا ہے اور پھر بچے کے مزاج کے مطابق اس میں کاٹ چھانٹ بھی کرتا ہے۔ اس حک و اصلاح اور ترمیم و تنسیخ کے باوجود آزاد کی عبارتوں کی

تازگی قائم رہتی ہے۔

درسی کتاب لکھتے وقت ادیب کے راستے میں ایک اور چیز بھی حائل ہوتی ہے۔ ادیب اسالیب کے ان مروجہ سانچوں سے بھی متاثر ہے اور خود بھی اپنا ایک اسلوب رکھتا ہے۔ اس اسلوب میں خیالات و احساسات کی کڑیاں خاص رنگ اور خاص طرز سے تشکیل پا چکی ہیں۔ فقروں کی دروبست کے ان بنے بنائے راستوں کو توڑ کر عبارت کو بچے کے مزاج کے مطابق ڈھالنا بڑا کڑا امتحان ہے آزاد اس امتحان میں بھی پورے اترے ہیں۔ انھوں نے اپنے شخصی اسلوب کے بعض پہلوؤں مثلاً استعارہ، مجازِ مرسل۔ استعارہ در استعارہ کو ترک کیا لیکن وہ اپنے بعض دوسرے شخصی رجحانات کو کام میں لائے۔ گردوپیش سے بے اطمینانی۔ امراض کی کثرت اور جذباتی زندگی میں ہل چل نے آزاد کو بصری تصویروں (VISUAL IMAGES) کا دلدادہ بنا دیا ہے۔ یہ رجحان ان کے ہاں ابتدا ہی سے تھا۔ حالات نے اسے اور زیادہ ابھار دیا۔ وہ دنیاوی زندگی سے زیادہ ذہنی زندگی بسر کرنے والے ادیب تھے تخیل کی گلکاری کو آبِ حیات میں ایک جگہ انھوں نے لفظوں کے طوطے مینا بنانے سے تشبیہ دی۔ یہی تشبیہ خود آزاد کے مزاج پر منطبق ہو سکتی ہے۔ آزاد عملی زندگی کی بجائے ذہنی دنیا کے باسی تھے، اور اس میں خوش رہتے تھے۔ درسی کتابیں بھی ان کے لیے ایسی ہی ذہنی زندگی ہے جسے اپنے رگ و ریشے میں رچا کر آزاد بچوں کے لیے لکھتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابوں میں وہ رچاؤ اور تازگی قائم رہی جو تخلیقی عمل کا بدیہی نتیجہ ہوتی ہے۔ لیکن جو مدرس کی قلم کی گرفت سے عام طور پر باہر رہ جاتی ہے۔ آزاد کی کتابوں سے ان کی جذباتی زندگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں اپنے بچپن کی طرف بازگشت کے آثار بڑے نمایاں ہیں۔ اس سے اردو کی پہلی کتاب کی جذباتی فضا تیار ہوئی ہے تصویریت آزاد کی تخیلی دنیا کا ایک کامیاب روپ ہے۔ اردو کی پہلی کتاب میں یہ جذبہ بچوں کے لیے بعض چھوٹی چھوٹی لیکن نادر تصویروں کا مرقع تیار کرتا ہے۔ اس نگارخانے میں ہر منظر نکھرا نکھرا۔ ہر تصویر مکمل ہر نقش واضح ہے۔

پہلوان کشتی لڑ رہے ہیں۔ اکھاڑے کے آس پاس تماشا دیکھنے والے جمع ہیں۔ گدروں کی

ی رکھی ہے۔ وہ دو پہلوان اترے۔ کپڑے اتار ڈالے۔ لنگر لنگوٹے کس لیے۔ کیا ڈیل ڈول ہیں گویا
نچے میں ڈھلے ہیں۔ کیا بدن ہے کہ شیشے کی طرح چمک رہے ہیں۔ ورزش عجیب چیز ہے آدمی
درست رہتا ہے۔ بدن خوب صورت نکل آتا ہے۔ بھوک لگتی ہے۔ جو کھاؤ ہضم ہو جاتا ہے۔ ہاتھ
ں میں پھرتی آتی ہے۔ جی میں اُمنگ پیدا ہوتی ہے۔ خواہ مخواہ زور کرنے کو دل چاہتا ہے۔ لو! وہ
ونوں خم ٹھوک کر سامنے آئے۔ وہ ہاتھ ملائے۔ کبھی وہ دھکیل کر ہٹاتا ہے۔ کبھی یہ ریل کرے جاتا ہے
ایک اسی داؤں میں ہے کہ موقع بنے تو ایسا پیچ کرے کہ دوسرا چاروں شانے چت گرے۔ کشتی
ماف ہوئی اور کچھ جھگڑا نہ رہا تو لوگ تالیاں بجائیں گے۔ واہ واہ کا شور مچائیں گے۔ جو پچھاڑ دیں گے
پھولے نہ سمائیں گے۔ جو پچھڑ دیں گے وہ شرم کے مارے سر نہ اٹھائیں گے" (صفحہ ۱۶)

اس سبق میں آزاد نے تین واضح تصویریں پیش کی ہیں۔ پہلے پیراگراف میں اکھاڑے کا
منظر ہے۔ دوسرے میں ورزش کے فوائد کو بیان کیا ہے۔ تیسرے میں پہلوانوں کی کشتی ہے۔ چوتھے
میں کشتی کے خاتمے پر حاضرین اور پہلوانوں کے اپنے تاثرات ہیں۔ یہاں بیانیہ الفاظ کے ساتھ ساتھ
فعلوں کی مختلف حالتوں کو الٹ پلٹ کر بھی پیش کیا ہے

کچھ محاورے کچھ روزمرہ کے الفاظ ہیں لیکن ہر جگہ دل چسپی کو برابر قائم رکھا ہے۔ کہیں
کوئی جملہ غیر ضروری طور پر طویل نہیں۔ کوئی پیچیدہ خیال نہیں۔ کوئی پیچدار نفسی کیفیت نہیں۔ وہی باتیں
ہیں جن کی طرف ایک چھ سات برس کے بچے کا دھیان جا سکتا ہے۔ یا جو اُس کی دل چسپی کا مرکز
ہو سکتی ہیں۔ اردو کی پہلی کتاب کا مواد عام زندگی سے لیا گیا ہے۔ "ماں کی محبت"، "گانا یک رہا ہے"،
"لڑکا مدرسے جاتا ہے"، "تیرہ بازی"، "دریا میں لڑکے تیر رہے ہیں"، "سانڈنی سوار اونٹ لا رہا ہے"۔
"بگھے کی سواری"۔ "راجہ صاحب کا ہاتھی"، "کسان ہل جوت رہا ہے"، "گنواں چل رہا ہے"۔ سب موضوع
وہ ہیں جن سے بچہ دو چار ہوتا ہے بچے کی توجہ اول گرد و پیش میں انھی چیزوں کی طرف ہوتی ہے
تحیر اور تجسس بچے کی زندگی کے اہم پہلو ہیں۔

آزاد کی کتاب کا تانا بانا انھی دونوں جذبوں کے گرد بنا گیا ہے۔ وہ چونکا دینے والے انداز میں

روز مرہ کی باتیں کہتے ہیں، اور ان کے بارے میں بچے کے جذبۂ تحیر کو پہلے اکساتے ہیں اور پھر تسکین کا انتظام کرتے ہیں۔ جنوں اور پریوں کی کہانیاں بچوں کی زندگی کے ابتدائی دور کا خاصہ ہے۔ آزاد بچے کو اس طلسمی دنیا کی سیر نہیں کراتے لیکن روز مرہ کی زندگی کی گہری معنویت اور عام اشیا کو دیکھ کر جذبات کی حرکت کا اہتمام ان کے ہاں بہت ہے۔ وہ بچے کی حیرت اور جستجو کا رشتہ حقیقی زندگی سے جوڑتے ہیں۔ وہ تخیل محض کے پرستار نہیں۔ حقیقت اور تخیل کے امتزاج کے حامی معلوم ہوتے ہیں۔ ایک معلم کی حیثیت سے انھیں احساس ہے کہ بچے کو بعض اخلاقی اقدار سے روشناس کرانا چاہیے۔ تحصیل کے میدان کی اہمیت واضح کرتے ہوئے وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ ہر وقت کھیلنا نہیں چاہیے۔ اس طرح صبح کی سیر کے اچھے اثرات۔ تیرنے کا فن، ماں باپ کا ادب۔ استاد کی عزت، مدرسے کی اہمیت، ان سب کی طرف وہ مناسب اشارے کرتے جاتے ہیں۔ زبان کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بچے کو ابتدا میں بول چال کی زبان سکھائی جائے۔ جیسے جیسے اس کا شعور پختہ ہو اسے ادبی زبان کی طرف لایا جائے۔ تعلیمی لحاظ سے یہی طریق کار مناسب ہے۔ اسی خیال سے انھوں نے قند پارسی اور آموزگار پارسی ترتیب دیں جن میں فارسی زبان کی بول چال کو قلم بند کیا۔ اردو کی درسی کتابوں میں بھی بول چال کا یہی پہلو نمایاں ہے۔ اسباق بول چال کی زبان میں لکھے گئے ہیں۔ اگر ادبی زبان کے لفظ آتے بھی ہیں تو ان کی متعارف اور بول چال کی شکلیں ہی برتی گئی ہیں۔ اکثر جگہ باقاعدہ سوال کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ جس سے زبان کی لسانیاتی حیثیت کو بچے کے ذہن نشین کرانا مقصود ہے۔
مثلاً:۔ یکے کی سواری ملاحظہ فرمائیے۔

میاں یکے والے اِس تھیلے میں کیا ہے؟ حقہ اور چلم ہے۔
مسافروں کی جوتیاں کہاں رکھتے ہو؟ وہ بھی اسی میں رکھ لیتا ہوں
یہ سواریاں کہاں لے جاؤ گے؟ میاں میر
کتنی دور ہے؟ چار کوس
ایک سواری کا کیا لیتے ہو؟ ایک آنہ

روز کیا مِل جاتا ہے ؟ دس بارہ آنے

گھوڑے کا خرچ کیا ہے ؟ پان چھ آنے روز۔ دو ڈھائی آنے کی گھاس۔ دو آنے کا دانہ

ڈیڑھ آنے کی نہاری۔

یہ گھوڑا کتنے کو لیا ہے ؟ چالیس روپے کو

کیسا چلتا ہے ؟ خاصا جاتا ہے۔ پکی سڑک ہو تو دوپہر میں منزل پہ پہنچا دیتا ہے۔

اِس کے گلے میں گھونگھروکیوں باندھے ہیں ؟ خوبصورتی کے لیے اور اِن کی آواز بھی بھلی

معلوم ہوتی ہے۔

پنجاب میں یکے کا رواج زیادہ ہے یا بہلی کا ؟ یکے کا۔

صاحب غریبوں کے واسطے یہ سواری خاصی ہے۔ پر یہ ضرور ہے کہ ہچکولے بہت لگتے ہیں"۔

اس مکالمے میں عام زندگی کا مشاہدہ ہے۔ سوال بچے کی نفسیات کو سامنے رکھ کر بنائے گئے ہیں۔

جوابات بھی ایسے ہی ہیں۔ زبان بول چال کی ہے جس میں روزمرہ کی گفتگو کا چٹخارا ہے۔

آزاد درسی ضروریات کو تخیل کے زور میں بھی فراموش نہیں کرتے۔ چناں چہ اِس کتاب میں

بعض الفاظ کی تکرار بھی کرائی گئی ہے۔ مختلف اسباق میں نئے الفاظ کے بار بار استعمال کے مواقع نکالے ہیں

تاکہ بچہ ان الفاظ کو سیکھ جائے۔ مصادر کی تکرار۔ ان کی مختلف حالتوں کا بیان۔ کلماتِ استعجاب۔ کلماتِ تنبیہ

وغیرہ کا استعمال۔ ایک ہی جذبے کے اظہار کے مختلف طریقے۔ مختلف پیشوں سے متعلق اصطلاحات

ان سب کو آزاد نے بڑی چابکدستی سے کتاب کے متن میں پھیلا دیا ہے۔ اردو کی پہلی کتاب اپنے موضوع

پہ آج بھی پہلی کتاب ہے ؂

مجرم بچے

مونی گلزار احمد

مجرم بچوں کے متعلق قدیم خیال یہ تھا کہ بچے پیدائشی مجرم ہوتے ہیں اور وہ بچپن ہی سے ایسی خراب عادتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے انھیں کسی قسم کی تربیت دینا یا کسی جرم سے باز رکھنا فضول ہے ان کے لیے یہی بہتر ہے کہ انھیں سوسائٹی سے علیحدہ کر دیا جائے۔ لیکن موجودہ دور میں اس نظریے کو جھٹلا دیا گیا ہے۔ یہ کہنا اب سراسر غلطی ہے کہ بچے پیدائشی مجرم ہوتے ہیں۔ جہاں تک بچوں کے جرائم کا تعلق ہے اس میں سراسر ماحول پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیوں کہ یہی وہ زمانہ ہے جس میں شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے اور شخصیت کی تعمیر میں ماحول یعنی والدین نمایاں حصہ لیتے ہیں۔ بچے مجرم کیوں بنتے ہیں اور ان کے جرائم کا سدِباب کیوں کر کیا جا سکتا ہے؟ یہ والدین کے لیے ایک اہم مسئلہ ہے اور اس پر غور و خوض کی ضرورت ہے۔ آئیے ہم بچوں کے اس اہم مسئلے پر نفسیاتی لحاظ سے روشنی ڈالیں اور دیکھیں کہ ان جرائم کے سلسلے میں والدین کس قدر ذمہ دار ہیں اور ان کی شخصیت کی بہتر تعمیر میں کس طرح ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔

بچوں کی خواہشات کا تشنۂ تکمیل رہنا انھیں جرم کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ خواہشات کی تسکین ہر بچے کا فطری حق ہے، جس سے اسے کبھی محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپ بچے کی خواہشات کی کوئی قدر نہیں کرتے اور اس کی دل چسپیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں تو یہ بچے کی بہت بڑی حق تلفی ہے۔ ہر بچے کی یہ دلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ خوبصورت کھلونوں اور دل چسپ اشیا سے جی بہلائے۔ اگر آپ ایسی اشیا اس کی تکرار کے باوجود مہیا نہیں کرتے تو یہ عین ممکن ہے کہ آپ کا بچہ گھر سے باہر اپنے ساتھیوں کے خوب صورت کھلونوں پر ہاتھ صاف کرنے لگے۔ اور پھر ان چیزوں پر ہاتھ صاف کرنا اُس کا شعار بن جائے گا۔ یہیں سے چوری کی ابتدا ہوتی ہے۔ اور یہ عادت رفتہ رفتہ پختہ ہو جاتی ہے۔

ضرورت سے زیادہ سختی

اکثر اوقات والدین کی ضرورت سے زیادہ سختی بچوں کے لیے زیادہ مضر ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً اگر گھر میں ذرا کسی بچے نے اپنی مرضی سے کوئی کام کرنا شروع کیا تو ڈانٹ ڈپٹ کر بٹھا دیا۔ یا اُس نے کسی رائے کا اظہار کیا تو جھٹ اس پر برس پڑے۔ اِس چیز کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے میں آزادی اور ارادہ مفقود ہو جاتی ہے۔ اور وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اسے گھر کے کسی معاملے میں دخل دینے یا رائے دینے کا کوئی بھی حق نہیں، ایسے بچے عموماً گھر سے باہر اِس تشنگی کی آگ کو بجھاتے ہیں۔ گھر سے باہر اپنے ساتھیوں سے ہر بات منواتے ہیں۔ اور اِس سختی میں لڑنا جھگڑنا ان کا شعار بن جاتا ہے۔ یہ لڑائی جھگڑے کی عادت رفتہ رفتہ خون خرابے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ لڑائی جھگڑے کے علاوہ ایسے بچے چوری کے مرتکب بھی ہو سکتے ہیں۔

زیادہ لاڈ پیار

ان بچوں کے بھی بگڑنے کا خطرہ لاحق رہتا ہے جن کی طرف والدین زیادہ توجہ دیتے ہیں، اور انہیں اپنی محبت و شفقت سے نوازتے ہیں۔ ہمارے گھروں میں خصوصاً اکلوتے بچوں کو بہت ہی ناز و نعمت میں پالا جاتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ محبت کے برتاؤ میں وہ ہر بری عادت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ذرا کسی بچے سے کوئی شرارت ہوئی یا اِس کے ہاتھوں کسی چوری کا ارتکاب ہوا تو والدین نے جھٹ اس کی حمایت میں بولنا شروع کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے کی حوصلہ افزائی ہو جاتی ہے، اور اِس کی یہ بری عادت روز بروز پختہ ہوتی جاتی ہے۔

بے اطمینانی، رشک اور حسد

اکثر اوقات گھر کی غیر اطمینان بخش حالت بچوں کو جرم کرنے پر اکساتی ہے۔ اگر گھر میں مسلسل لڑائی جھگڑا ہے اور بچوں کو کسی قسم کی آسودگی اور چین نصیب نہ ہو تو اُس چیز کا بچے پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ بچہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ گھر میں اس کی حالت محفوظ نہیں۔ یہی غیر محفوظی کا احساس اسے گھر سے باہر کی دنیا میں پھر پر آمادہ کرتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ یہ چیز آوارگی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ آوارگی کے ساتھ ساتھ یہ بھی عین ممکن ہے کہ بچہ چوری چکاری اور ڈاکہ زنی کو اپنا شعار بنا لے۔

رشک یا حسد کے باعث بھی بچے کے بگڑ جانے کا احتمال ہوتا ہے۔ اگر ایک بچہ جو معمولی کپڑے پہنے ہوئے کسی ایسے لڑکے کے ساتھ رہے جو اس سے زیادہ اچھے کپڑوں میں ملبوس رہنے کا عادی ہو اور اسے آسائش میسر ہو، تو ایسا لڑکا اپنے آپ کو اتنا ہی مالدار ثابت کرنے کے لیے چوری کا مرتکب ہو سکتا ہے، یا کسی دوسری نوعیت کے جرم کر سکتا ہے۔

والدین کے چال چلن کا بھی بچوں پر کافی اثر پڑتا ہے۔ اگر وہ شرابی، جواری، سخت عیاش اور ظالم قسم کے لوگ ہوں تو ان کے بچے بھی ایسے ہی نکل آتے ہیں۔ اور ہر قسم کی نقل کر کے بد چلنی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس لیے والدین کی کوشش یہی ہونی چاہیے کہ وہ بچوں کے معاملے میں ایک اعلیٰ نمونے کا کام کریں۔

گھر کا ماحول

بچوں کی معقول دیکھ بھال ان کی ماں ہی کر سکتی ہے۔ لیکن جن بچوں کے باپ نہیں ہوتے اور ماں کو ملازمت کے سلسلے میں گھر سے باہر جانا پڑتا ہے۔ ان بچوں کی دیکھ بھال میں کمی آجاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچوں میں جرم کرنے کی عادتیں پڑ جاتی ہیں۔

بری صحبت

بری صحبت میں اٹھنا بیٹھنا بھی بچوں کے ذہن پر برا اثر ڈالتا ہے۔ وہ ایسی صحبت کو جلد قبول کر لیتے ہیں۔ اگر ان کے ساتھی شرابی، جواری اور چور ہوں گے تو یہ لازمی امر ہے کہ وہ بھی کسی نہ کسی جرم کا شکار ہو جائیں گے۔ اس لیے والدین کی کوشش یہی ہونی چاہیے کہ بچے ایسی صحبت سے باز رہیں اور جہاں تک ہو سکے وہ اچھے لوگوں کی صحبت میں وقت گذاریں۔

بیکاری اور تنگی

گھر میں بے کاری اور تنگدستی کا بھی بچوں پر برا اثر پڑتا ہے۔ باپ اگر بے کار ہوتا ہے تو گھر پر ایک آفت نازل ہو جاتی ہے اور قیامت کا سماں بندھ جاتا ہے۔ چنانچہ بھوک اور جسمانی تکالیف کے سبب بچوں کو گھر سے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ تاکہ روزی کا انتظام کیا جائے۔ ایسے بچے یا تو بھیک

لگتے ہیں یا چوری کرتے ہیں یا ایسے کام کرنے لگتے ہیں جن سے ان کے چال چلن بگڑ جاتے ہیں
بچوں کے جرم کرنے کی ایک وجہ غربت بھی ہو سکتی ہے۔ غریب والدین بچوں کے لیے رہنے
سہنے کی آسائشیں مہیا نہیں کر سکتے۔ خصوصاً ہمارے ملک میں تو یہ چیز اکثر دیکھنے میں آتی ہے
۔ ایک چھوٹے سے مکان میں کئی کنبے رہتے ہیں۔ چناں چہ بہت سے لوگوں کا اثر بچوں کے چال چلن
پر بڑا پڑتا ہے۔ گھر کے اندر انہیں کسی قسم کی آسائش میسر نہیں ہوتی۔ نہ تو انہیں پڑھنے لکھنے کے لیے
کوئی مخصوص جگہ ملتی ہے اور نہ کھیلنے کے لیے۔ چناں چہ وہ بچے بازاروں اور گلی کوچوں میں آوارہ پھرنے
لگتے ہیں اور اس طرح جرم کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ بچوں کو بری عادات سے بچانے اور ان کی صحیح تربیت
کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ بچے کو گھر میں ایک ساز گار ماحول میسر ہو۔ ایسے ساز گار ماحول کے لیے
گھر اور والدین کی موجودگی نہایت ضروری ہے۔ اگر خدانخواستہ کسی بچے کا گھر بار نہیں ہوتا۔ اور ماں
یا باپ یا دونوں کی موت کے باعث گھر بگڑتا اور برباد ہو جاتا ہے تو اس بچے کے بگڑنے کا امکان
زیادہ ہو جاتا ہے۔ یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بگڑے ہوئے اور مجرم بچوں میں ان بچوں کی تعداد زیادہ
ہوتی ہے جن کے گھر ماں یا باپ یا دونوں کی موت واقع ہو گئی ہو۔ یہ بچے اکثر برباد ہو جاتے ہیں
آپ نے دیکھا کہ بچوں کو بگاڑنے یا سنوارنے میں والدین اور گھر کے ماحول کا کس قدر حصہ ہے۔ اگر
بچوں کو ایسے ساز گار ماحول میں رکھا جائے۔ جہاں ان کی بخوبی دیکھ بھال ہو اور ان کی شخصیت کی
بہتر تعمیر ہو تو وہ اچھے شہری بن سکتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں محض والدین کی لا علمی اور بے وقوفی
کے باعث بچوں کی شخصیت بخوبی پروان نہیں چڑھ سکتی اور وہ اکثر گمراہی کے راستے پر چل پڑتے ہیں
جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات کے لیے ہی نہیں۔ بلکہ تمام معاشرے کے لیے مہلک ثابت ہوتے
ہیں۔ اور یہ بھی اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ناساز گار ماحول کی بدولت آسودہ حال اور معزز گھرانوں کے
بچے بھی مجرم بن جاتے ہیں۔

اصلاح

انسانی ترقی کے ساتھ ساتھ اب یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ مجرم بچوں کی اصلاح اور تعلیم کے لیے

سکول کھولے جائیں۔ تاکہ ان کی حالت کو بہتر بنایا جائے۔ اور وہ اچھے شہری بن سکیں۔ دوسرے ممالک مثلاً امریکہ اور انگلستان میں مجرم بچوں کی اصلاح اور تعلیم کے لیے ریفارمیٹری سکول کھولے گئے ہیں چنانچہ اگر کوئی بچہ جرم کرتا ہے تو اس کو مجرم نہیں مانا جاتا اور نہ ہی اس کو سزا دی جاتی ہے۔ بلکہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس بچے کی طرف والدین نے اپنے فرائض کو انجام نہیں دیا ہے اور اسے سرکاری طور مدد کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اسے ریفارمیٹری سکول میں داخل کیا جاتا ہے۔ جہاں اس کے کردار کی خاطر خواہ اصلاح کا مکمل انتظام ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں ابھی اس طرف کوئی خاص قدم نہیں اٹھائے گئے۔ لیکن موجودہ دور کے تقاضوں کے پیش نظر یہ امید کی جاتی ہے کہ کچھ عرصہ تک اس طرف موثر قدم اٹھائے جائیں گے اور بچوں کی اصلاح اور معقول تعلیم کے لیے اس قسم کے سکول ملک کے ہر حصے میں کھولے جاسکیں گے۔

ـدید فارسی کی مشکلات

فارسی قدیم سے جدید تک

ـ تدریسی مسئلہ

ں کلیم

پاکستانی ثقافت —— برصغیر میں فارسی —— برصغیر کی خدمات —— فارسی اور
ی تہذیب —— جدید فارسی کا تاریخی پس منظر —— جدید فارسی کے محرکات
—— کلاسکی اور جدید فارسی —— انگریزی تسلط اور فارسی —— جدید فارسی
روپی زبانیں —— جدید محاورہ —— زبان کا ارتقا —— فارسی کی
ں ایک قومی مسئلہ —— نصاب اور جدید زبان —— جدید زبان کے اہم
نکات —— درد کا درماں ۔

ور فارسی زبان

اگرچہ آج فارسی زبان پاکستان میں عام طور پر بولی اور سمجھی نہیں جاتی۔ لیکن پاکستان کی ثقافت
ربیں فارسی زبان وہ تاج محل ہے جس کے بغیر برصغیر کی تاریخ بے رنگ و بو ہو کر رہ
تہذیبی ورثہ کے علاوہ فارسی گیارہویں صدی سے انیسویں صدی تک دربار کی زبان ،
حکوم میں ذریعۂ اظہار اور تاریخ کے بیش بہا سرمایہ کی رازدار رہی۔ برصغیر میں مسعود سعد
خسرو، فیضی، غالب اور اقبال کی عظمت کا اعتراف اہل زبان نقاد اور مورخ کرتے ہیں
ہی وہ زبان تھی جو انگریزی اقتدار کے دوران بھی شرفا کے گھر کی بولی رہی۔ ایران اور
ملی قدیم زمانہ سے مراسم چلے آتے تھے۔ سنہ ۱۰۲۱ء سے سنہ ۱۸۲۵ء تک مغلوں سے قبل
دور سے اس رشتہ کا آغاز ہوا۔ لاہور میں غزنوی حکمران، شعرا، علما اور صوفیا اس طرح

آباد ہوئے کہ لاہور کو "غزنیِ خورد" پکارا گیا

مسعود سلمان سے متعلق آقائے سید نفیسی تحریر فرماتے ہیں :-

He was the first Persian poet and writer who strikes a personal note in his poetry and makes an attempt to free his verse from the preponderance of eulogy.

اس مختصر اقتباس سے غرض محض مسعود سعد سلمان کی تخلیق کو تعارف تھا جس میں "طرح نو" کو کہ ماجدت پسند اتنا دہ اہم کا نام رہا ۔

مغلوں کے دور میں فارسی سرکاری کاروبار کا ذریعہ رہی۔ اکبر کے نورتنوں میں خانخاناں کی روزمرہ زندگی کے ایسے واقعات کثرت سے معلوم ہوتے ہیں جن میں روزمرہ مجلسی زندگی میں مزاح کے لیے بھی فارسی کا سہارا لیتا رہا۔ مثلاً ایک مرتبہ اس نے بلی کی آواز "می آیم ۔ می آیم ۔ می آیم" کہہ کر نکالی۔ یہی آواز میاؤں میاؤں، میاؤں کا بدل مزہ رہ گئی لیکن خانخاناں کی فارسی نوازی کا اندازہ ثبوت بھی دے گئی ۔

آج ہمارے پاس تاریخی سرمایہ میں فارسی ہی کے فیض سے وہ بیش بہا خزانہ موجود ہے کہ ہمیں تحقیق کے لیے غیروں کا محتاج ہونے کی ضرورت نہیں ۔

تاریخی کتب میں ہندو مصنف بھی آغاز بسم اللہ سے کرتے۔ توحید کا بیان ہوتا اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نعت درج کی جاتی۔ گویا معاشرہ کی تہذیبی بنا فارسی زبان تھی ۔

تاریخ کے علاوہ سوانح کی کتب اور ملفوظات بھی ترتیب دی گئیں جن میں ذریعۂ اظہار فارسی زبان ہی رہا ۔

۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک بابر سے بہادر شاہ ظفر تک برصغیر کی تاریخ سے فارسی نکال دیں تو تاریخ کے اوراق بے نشان رہ جاتے ہیں ۔

طہران یونیورسٹی سے شائع ہونے والی کتاب "تاریخ ادبِ فارسی" میں مصنف لکھتا ہے

According to the people Faizi enjoyed a great vogue in Ottoman Turkey and his influence was responsible for the popularity of Persian literature in that country.

(Tarikh-e-Adab-e-Farsi)

آج کے مشرقی پاکستان تک فارسی زبان مغلیہ دور تک پہنچ چکی تھی۔ وہاں اسلام مسلمان صوفیاء کے ذریعہ پہنچا جن کا ذریعہ اظہار فارسی تھا۔

۱۲۰۲ء میں بختیار خلجی نے بنگال فتح کیا۔ خلجی نے رنگ پور شہر کی بنیاد رکھی اور وہاں مدرسہ قائم کیا۔ یہ مدرسہ مسلم تہذیب کا مرکز بنا۔

انگریزوں کی آمد کے وقت ہندوستان میں ایسے علما ادبا اور شعرا موجود تھے جو اہل زبان کی فارسی کے قائل تھے اور غیر ایرانیوں کو معیار پر پورا نہیں مانتے تھے۔

غالب کے مندرجہ ذیل خطوط اس مختصر سی بات کو واضح کریں گے۔

"فارسی کی ترکیب الفاظ اور فارسی اشعار کے معنی کی پرواز میں میرا قول خلاف جمہور پائیے گا اور حق بجانب میرے ہو گا۔"

(قتیل کے اشعار) کسی تعریف کے شایان نہیں ہیں۔ نہ ترکیب فارسی نہ معنی نازک۔ ۔۔۔ الفاظ فرسودہ عامیانہ جو اطفال دبستان جانتے ہیں اور جو متعدی نثر میں مدح کہتے ہیں وہ الفاظ یہ لوگ نظم میں خرچ کرتے ہیں۔

قتیل اساتذۂ سلف کے کلام سے قطعاً آشنا ہی نہیں۔ اس کے علم فارسی کا ماخذ ان لوگوں کی تقریر ہے جو کہ نواب سعادت علی خاں کے وقت میں ممالک مغربی کی طرف سے لکھنؤ میں آ گئے اور ہنگامہ آرا ہوئے۔ بیشتر سادہ کشمیری یا کابلی و قندھاری کہ اتفاقاً بعضے عامۂ اہل ایران کا بھی کوئی ہو۔ مانا کہ غلطاں کے ایران سے کوئی ہو گا۔ تقریر اور ہے تحریر اور ہے۔ اور اگر تقریر تحریر

ہ یا کرتے تو خواجہ بقراط اور شرف الدین علی یزدی اور ملا حسین کاشفی اور طاہر وحید یہ سب نثر میں
شوربختگرکیوں کھایا کرتے۔ وہ سب اس طرح کی نثر میں جو لالہ دیوانی سنگھ قتیل نے بہ تقلید اہل ایران
لکھی ہیں نہ رقم فرمایا کرتے۔"

پھر اس کے بعد قاطع برہان اور برہان قاطع کی منزل آتی ہے جس میں غالب اپنے استاد
عبدالصمد کی تربیت پہ اس قدر نازاں ہے کہ قاطع برہان میں ایسے الفاظ کو معیاری ماننے سے قطعاً منکر
ہے جو اساد کی زبان سے نہیں سنے۔ یہ معاملہ الگ موضوع کے تحت تحقیق چاہتا ہے۔ اس ضمنی
بحث سے مراد محض یہ تھی کہ برصغیر کی فارسی خدمات اور اضافوں کا ذکر ہو چکا انگریزی دور میں اصطلاحات
اور تعبیرات فارسی کا سہارا لے کر اٹھیں۔ مالی اور دیوانی نظام بائع و مشتری کے معاملات۔ فارسی کی
انگلی پکڑ کر چلے۔

پاکستان کی ایک قومی زبان فارسی ہی کا دودھ پی کر جوان ہوئی۔

فارسی اور پاکستانی تہذیب

فارسی زبان قدیم کتبوں سے لے کر آج تک ان تمام مراحل سے گذر چکی ہے جو ایک زندہ
زبان کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ ہم کلاسیکی فارسی سے زیادہ مانوس ہیں۔ ہماری تہذیب اور ثقافت
کی بنیاد کلاسیکی فارسی پہ استوار ہوئی ہے۔

ہمارے قومی ذخیرہ میں فارسی کتب جو قومی مخطوطات قرآن عظیم کے قلمی نسخوں پر مشتمل ہیں
فارسی کتب سے بھی بہرہ مند ہیں۔

جدید فارسی کا تاریخی پس منظر

ناصرالدین شاہ قاچار (۱۲۹۴ ـــــــ ۱۲۱۳ھ) کے عہد حکومت میں ایران میں مغربی تمدن
کے آثار نمودار ہوئے۔ اخبار اور رسائل کا آغاز ہوا۔ جدید خیالات غیر ایرانی زبانوں سے آئے
عوامی بیداری کی تحریکیں ابھریں۔ مظفرالدین شاہ قاچار (۱۳۱۳ھ ـــــــ ۱۳۲۴) کے عہد
میں انگریز اور بلشوکی اثرات میں اضافہ ہوا روسی افسروں نے قومی زندگی میں دخیل ہو کر پرسکون

زندگی میں طوفان پیدا کردیا۔ پھر مشروطہ کا دور آیا۔ قومی جذبہ اُبھرا۔ پروفیسر براؤن نے

The Press and Poetry of the Modern Persia

ایرانی فن کاروں کے لہجہ کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اگرچہ اس سے یہاں کچھ غلطیاں بھی ہوئیں۔ فرسودہ نظام کے خلاف ایک منظم بغاوت کی گئی۔ دل و دماغ کی بیداری کے لیے جہاد ہوا۔ اس طرح قوم کے ساتھ ساتھ زبان بھی نت نئے سانچوں میں ڈھلنے لگی۔

جدید فارسی کے محرکات

پروفیسر رازی اپنی کتاب فرہنگ نامہ جدید کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:-

The main factors which caused these lingual changes are as below:-

1. Political revolution of 1906, 1909 and awakening amongst the Iranians.
2. Influence of foreign politics in Iran.
3. Political relations and close contact of Iran with European countries.
4. New scientific researches and Persian translations of European literary works.
5. Development and progress of scientific and practical knowledge.
6. Travels of Iranian scholars, students and professors in European countries and continuance of their studies

ایران میں مسلمانوں کی آمد سے جو تغیرات زبان و ادب میں نمودار ہوئے ان میں غالب اثر عربی زبان اور اسلامی فکر و نظر کا تھا۔ فارسی زبان کے ذخیرہ میں عربی تبرکاً نہیں بلکہ تاریخی اثر کے طور پر شامل ہوئی ادب عربی قالب میں ڈھلا۔ اصناف ادب بھی عربی سے لی گئیں۔ ایران کی قومی زندگی نے مشروطہ کے دوران کچھ اس انداز سے انگڑائی لی کہ عربی عنصر سے وحشت ہونے لگی اور قومی احساس نے قبل از اسلام کی زبان کو زیادہ عزیز جان کر چھاتی سے لگانا شروع کیا اور عربی الفاظ کی بجائے خالص فارسی الفاظ کا آغاز ہوا۔ انگریزی فرانسیسی اور امریکی الفاظ فارسی کے ذخیرہ میں شامل ہو گئے۔

کلاسیکی اور جدید فارسی

جمال زادہ نے عربی اثر اور جدید مغربی اثر کو اپنے مشہور افسانے "فارسی شکر است" میں یوں واضح کیا ہے۔

"بشنیدن این کلمات مثل جناب شیخ مانند تکہ ابری آہستہ بحرکت آمدہ واز لای آن یک جفت چشمی نمودار گردید کہ نگاہ ضعیفی بکلاہ نمدی انداختہ واز منفذ صوتی کہ بایستی درزیر آن چشمہا باشد ودرست دیدہ نمی شد با قرائت وطمانینہ تمام کلمات ذیل آہستہ وثمرہ مسموع کرید حضارہ گردید وسوسن عنان لنفس عاصی تاصر را بدست قہر وغضب مدہ کہ الکاظمین الغیظ والعافین عن الناس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"کلاہ نمدی از شنیدن این سخنان اج دواج ماندہ وچون از فرمائشات جناب آقای شیخ تنہا کلمۃ کاظمی دستگیرش شدہ بود گفت ونہ جناب اسم نوکرتان کاظم نیست رمضان است مقصودم این بود کاش اقلاً می فہمیدیم برائے چہ ما را این جا زندانی کردہ اند"

یہ دو تبدیلیوں کی گفتگو تھی جو عربی اور مغربی اثر سے متاثر تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو سمجھنے سے قاصر رہے

انگریزی تسلط اور فارسی انگریزوں نے موجودہ پاکستان کے علاقہ پر تسلط کرتے ہی فارسی

اثر کو نکال باہر کیا۔ اگرچہ حکومت کے اکثر کام فارسی ہی کے ذریعہ چلے لیکن معاشرہ میں فارسی کی جگہ انگریزی نے لی اور آہستہ آہستہ

افسوس ہند میں نہ رہی فارسی کی قدر
مستی اڑی شراب سے پھولوں سے بو گئی

انگریزی دور میں ہمارے روابط ایران سے کٹ گئے اور ہم فارسی کو زندہ زبان سمجھنے سے محروم ہو گئے، یہ پورے ایک سو سال کے عرصہ کی محرومی ہے جو ہمیں فارسی کی زندہ حیثیت سے ناآشنا کر تی گئی ۔

شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد ایران گئے لیکن وہاں کی بول چال میں کامیاب حصہ نہ لے سکے

جدید فارسی اور یورپی زبانیں

موجودہ فارسی محاورہ روزمرہ اور ادب میں قدیم اور کلاسیکی فارسی سے قطعاً مختلف ہوتی جا رہی ہے۔ الفاظ میں انگریزی الفاظ کو یوں منفرس کر دیا گیا ہے ۔

آپارتمان	apartment
آپاندیسیت	appendicitis
آتلانتیک	atlantic
آدمیرال	Admiral
آئروپلان	Aero plane
آتم	Atom.
انرژی	energy
آنتیک	antique
پاراد	parade
اولتیما توم	Ultimatum

Battery

Pathology ـ ...ی

Diplomacy ـ ...ی

Dictator ـ ...ر

Syndicate ـ ...کا

Film

Vitamin ـ ...ن

Parachute ـ ...وت

محاورہ

محاورے میں زدن کے ۳۲ معانی ہیں

حملہ کرنا ۔ پہننا ۔ اٹھانا ۔ مارنا ۔ جلانا ۔ تالی بجانا ۔ چوٹ لگانا ۔ بچانا ۔ بجانا ۔ کاٹنا ۔ ڈھونا ۔ لگانا ۔ چھونا ۔ لوٹنا ۔ حوالہ دینا ۔ کاٹنا ۔ کترنا ۔ کھٹکھٹانا ۔ حل کرنا ۔ دل دھڑکنا ۔ جیب کترنا اور پھینٹنا ۔

...اول الفاظ

ائرو پلان ، آئرو نوتری ، اوتوماتیک ، شارع مقتضی المرام

ایران میں اصطلاحات کے وضع کرنے اور زبان کو جدید قومی ضروریات سے ہم آہنگ کے لیے ایک ادارہ سرکاری طور پر قائم کیا گیا ہے ۔ نام ہے فرہنگستان ۔ اس ادارے نے یہ بالا متداول الفاظ کو یوں بدلا ہے ۔

ائرو پلان ———————— ہواپیما

ائرو نوتری ———————— ہواشناسی

اوتوماتیک ———————— خودکار

شارع ——— راہ

مقضی المرام ——— کامیاب

ن کا ارتقا

ایرانی زبان میں عامیانہ عنصر ہے جو کلاسیکی فارسی میں ہم تک نہیں پہنچا تھا۔ اقتضائے ت کے ساتھ ساتھ زبان میں وسعت ہی زبان کی زندگی کا ثبوت ہے۔ آقائے یوسف رحمتی نے ک عامیانہ ترتیب دی ہے۔

بادکلک ۔ ذالزالک ۔ ازگیل ۔ گیوہ ۔ چہارتاد

عربی میں مفہوم ادا کرنے والے الفاظ کو فارسی الفاظ سے بدلا جا رہا ہے۔

آقائے رحمتی نے تحریر فرمایا ہے۔

نکتہ شایان توجہ اینست کہ بعضی از کلمات ترکی یا از ریشۂ عربی در زبانِ عامیانہ فارسی ـــ ومعنائے جدیدے بخود گرفتہ اند بطوریکہ میتوان گفت ترک "تابعیت کردہ و فارسی شدہ مانند "علقۂ مضغہ" کہ در عربی دو اسم برائے دو مرحلہ از تکامل جنین است دریں جا بمعنی شخصی بیریخت بکل استعمال می شود و "یاکن فیکون" کردن بمعنی ویران کردن ولن ترانی کہ بمعنی دشنام واسی بمعنی معروف بکار می رود"

بی کے الفاظ کا متداول مفہوم

قیافہ	صورت	صبرتامل	صحافی جلدساز
قیام	نہضت بغاوت	مطبوع پسندیدہ	

لوب بیان بھی بدلا :-

بیٹھ جائیے ۔ بفرمائید

کسی کو دروازے سے باہر نکالنا ہو تو کہتے ہیں ۔ دست پشت سرش داشت

فارسی زبان کا ماحول بدلا تو اکثر اصنافِ سخن، ذخیرۂ الفاظ سب پر اثر ہوا۔

زبان کا ماحول اور مزاج محض اہل زبان سے ملنے سے ہی واضح ہو سکتا ہے۔ میں جب جا ہی رہا ہوں تو مجھے دھکا کیوں دیتے ہو۔

من کہ دارم می روم چرا سلام می دہی ؟

ایک قومی مقصد ——— فارسی کی تدریس

ہمارے قومی کمیشن نے عربی اور فارسی کی تدریس کے متعلق یہ رائے دی ہے :-

The teaching of Persian in our country also suffers from defects. In this case the emphasis has so far been on classical literature and our students and teachers with few exceptions are unable to speak and write the language in the modern form. Some work on the gradation of vocabulary and structures of Persian is being done in Iran. Graded series of Text books are also being produced. We must make use of the efforts being made in these countries to improve the Teaching of Persian. It may be worthwhile to use the series produced in Iran and also where the syllabuses have been framed on modern lines. Include modern Persian besides the classical.

Our aims: ——————— ہمارے مقاصد

To teach Persian as a living language.
To develop competence in clear simple and correct expression.

ان دونوں مقاصد کے پیش نظر ہمیں اپنے مدارس نصاب اور طریق تعلیم پر نگاہ ڈالنی ہوگی اور اس درد کا مداوا تلاش کرنا ہوگا۔ ہمارے مدارس میں جدید فارسی کی تدریس کے تقاضوں کا کوئی احترام نہیں۔ سمعی بصری معاونات تو درکنار موزوں کتب بھی موجود نہیں جو اساتذہ کی رہنمائی کرسکیں اور طلبہ کو فارسی کا ذوق دلائیں۔

نصاب اور جدید زبان

ہمارے نصاب میں کلاسیکی فارسی کو زیادہ دخل ہے۔ جدید زبان اور بچوں کی ذہنی عمر اور نفسیاتی تقاضوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا تھا۔

شنیدم کہ مردان راہ خدا
دل دشمنان ہم نہ کردند تنگ

میں "مردانِ راہِ خدا" کی ترکیب کتنی مشکل ہے۔ مڈل کا بچہ اسے آسانی سے نہیں سمجھ پاتا۔ محکمہ نے اس سال کوشش کی ہے کہ جدید زبان کے مستقل تقاضوں کو پیش نظر رکھا جائے۔ طریق تعلیم بالکل فرسودہ ہے۔ ہم نے الفاظ کو اردو تلفظ کا جامہ پہنا دیا ہے۔ صوتی احترام روا نہیں رکھا جاتا۔

ہم انگریزی کے تلفظ پر محنت کرتے ہیں فارسی پر نہیں۔ جس طرح ہم انگریزی کو پشتو اور اردو کے لہجہ میں ادا نہیں کرسکتے۔ اسی طرح فارسی کو بھی کسی غیر زبان کے لہجے میں ادا نہیں کیا جاسکتا۔

جدید زبان کے اہم صوتی نکات

جدید زبان صوتی اعتبار سے کلاسیکی سے قطعاً مختلف ہے۔ چند واضح فرق ذیل میں درج ہیں

(۱) فارسی میں یائے مجہول کا استعمال متروک ہے۔

(۲) نون غنہ کسی اسم کے آخر میں نہیں آتا۔ تنگ وغیرہ میں درمیان میں لاسکتے ہیں۔ لیکن اس کو

ان اور آں کو۔ آن کہیں گے۔

(۳) اعراب کا تلفظ بہت نمایاں ہے۔ ہم نے اردو تلفظ کے زیر اثر فارسی کو خراب کر رکھا ہے۔ صبر کو ایرانی پورا منہ کھول کر پکارے گا۔ صابر گنبد کو گونباد ہوا کو ہیرا کے برابر۔

(۴) مجہول اصوات نہیں ہوتیں۔ شیر درندہ اور شیر کو Sher کہیں گے۔

(۵) الف پیش از نون یا میم کا تلفظ ہمارے ہاں صحیح نہیں۔

(۶) الف کا صحیح ایرانی تلفظ اردو کا آ نہیں ہے۔ بلکہ الف اور واؤ کے درمیان ایک آواز ہے جو آؤ سے مشابہ ہے۔ کار کو کور کہیں گے۔ عربی کا قدیم الف فارسی میں تھا ہی نہیں۔

(۷) ک اور گ کے آخر میں ایک چھوٹی سی یا ئے سنائی دیتی ہے۔

(۸) ہاء ملفوظ لکھی جاتی ہے۔ پڑھی نہیں جاتی۔
زندہ۔ بندہ۔ تشنہ

(۹) تنوین غائب ہو رہی ہے۔ ابداً احلاً کاملاً میں صرف ابدا۔ احلا۔ کاملا
ایران کے مختلف مقامات پر تلفظ میں اختلاف ہے۔ صافیون کی زبان علماء سے قطعاً مختلف ہے۔

پروفیسر فروزانفر بدیع الزماں سعدی اور حافظ کی زبان رائج کرنے کے حامی ہیں۔ ایرانی زبان کی ترقی میں تین گروہ اس کی راہ کے ہفت خواں بن گئے ہیں۔

پہلا گروہ علماء کا ہے جن کا وسیلہ معاش فضیلت زبان ہے۔ وہ عربی زبان کے حامی ہیں شجاعت کو شجاعت اور مشعل کو مشعل کہتے ہیں۔

دوسرا گروہ قدیم فارسی کو زندہ کرنے کی فکر میں ہے۔ وہ دری پہلوی کا احیاء چاہتے ہیں۔ لیکن کیوں کر ممکن ہے۔ تیسرے گروہ والے یورپی زبانوں کے طلسم کے شکار ہیں۔

ہمیں چاہیے کہ اساتذہ کے تربیتی اداروں میں ایرانی نژاد اساتذہ مامور کریں جو اساتذہ کو

زندہ زبان کی تعلیم دیں۔

پروفیسروں کے تبادلوں کی بجائے ہائی اسکول اساتذہ کے تبادلے کیے جائیں جو ایران میں رہ کر جدید لب ولہجہ صوت وآہنگ کی تربیت حاصل کریں۔

ہم آج جدید فارسی بولنے والوں کے سامنے لب بستہ رہ جاتے ہیں۔ صرف انگریزی کا سہارا لے سکتے ہیں۔ ایم اے کر چکنے کے بعد بھی ہم کسی اہل زبان سے جدید لہجہ وآہنگ میں بات نہیں کر سکتے۔ ہمارے روابط ایران سے مذہب تہذیب تاریخ سیاست اور بین الاقوامی ضروریات سے میل کرتے ہیں۔ دونوں ملکوں میں نازک ترین رشتہ زبان کا ہے۔ اور یہی زبان پاکستانی تہذیب کی روح ہے۔ لہذا ہمیں اپنے مدارس میں اس درد کا درماں تلاش کرنا چاہیے۔

درد کا درماں

۱۔ ہمیں لہجہ اور آہنگ میں ایرانیوں کی تقلید کرنی چاہیے۔ یائے مجہول کا استعمال بالکل ترک کر دینا چاہیے۔

۲۔ اعراب کا تلفظ ایرانیوں کی طرح واضح کرنا چاہیے۔

۳۔ نون غنہ کو سالم نون کی طرح ہونا چاہیے۔

۴۔ ایران سے بڑے بڑے علماء بلائے جائیں۔ تاکہ اساتذہ کو لہجہ اور آہنگ کی صحیح تعلیم دی جا سکے۔

۵۔ ابتدائی جماعتوں میں نصاب جدید زبان پر مبنی ہو۔ بڑے ہو کر ماحول اور گردوپیش کی زبان کے علاوہ اور زبان بھی سیکھنی چاہیے

۶۔ ایرانی اخبارات اور رسائل اسکولوں میں جاری کرائیں۔

۷۔ جدید فارسی لب ولہجہ اختیار کیا جائے اور فارسی الفاظ کے اُردو تلفظ سے گریز کیا جائے۔

کتابیات

۱۔ اورینٹل کالج میگزین
مئی ۱۹۵۲ء تا اگست ۱۹۵۳ء
۲۔ دریائے گوہر — ڈکٹر مہدی حمیدی
۳۔ نیا ایرانی ادب — ڈاکٹر ظہیر الدین احمد
۴۔ فرہنگ نامہ جدید — ایف ڈی رازی
۵۔ عود ہندی
۶۔ غالب کے ادبی خطوط
۷۔ تاریخ مشروطہ — جلد اول، دوم
۸۔ خود آموز فارسی — ایف ڈی رازی

i The Cultural Herit[age]
of Pakistan.
ii Curriculum Report
Implementation Un[it]
of National Commis[sion]
on Education.
iii Persian Grammar by
A.K.S. Lambton.

محنت و مشقت کی تربیت اور اہمیت

ڈاکٹر عبدالرؤف

بچوں کی تعلیم و تربیت کی بنیادی غرض و غایت انہیں صحت مند اور مفید شہری بنانا ہے۔ گھر کی تربیت کا مقصد بچوں کی جسمانی صحت کی نگہداشت کرنا ہی نہیں، بلکہ ان میں انسانیت کے اعلیٰ اوصاف اور اخلاقی اقدار کو راسخ کرنا ہے۔ اسی طرح مدرسہ، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کا مطمح نظر طلبہ کو امتحان پاس کرنے کے قابل بنانا ہی نہیں بلکہ انہیں زندگی کی گوناگوں ذمہ داریوں کے لیے تیار کرنا ہے۔ وہ گھریلو تربیت اور رسمی تعلیم جو اس بنیادی حکمت کو نظر انداز کرتی ہے، بچوں کے اخلاق اور شخصیت کو غلط سانچوں میں ڈھالنے کی مرتکب ہوتی ہے۔

ابتدائی تربیت کی اہمیت

بچوں میں صحت، افادیت اور وقار اجاگر کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ مناسب طریقوں سے انہیں محنت کرنے اور دستی کام میں دلچسپی لینے کی عملی تربیت دی جائے۔ کسی مقصد کو سامنے رکھ کر اس کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے سے بچوں کے اخلاق اور شخصیت پر بہت خوشگوار اثر پڑتا ہے جن خوش نصیب بچوں کو ابتدائی دور میں محنت و مشقت کی موزوں تربیت میسر آ جاتی ہے وہ بڑے ہو کر اپنے مسائل کو سمجھنے اور اپنی مشکلوں کے حل ڈھونڈنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ معاشرہ بھی اس قسم کے بالغوں سے بے پناہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ کیوں کہ یہی لوگ معاشرہ کے اہم امور چلانے کے ذمہ دار بنتے ہیں۔ معاشرے کی زندگی کے تمام شعبوں میں کامیابی انہی لوگوں کی قابل قدر خدمات کی محتاج ہوتی ہے۔ محنت و مشقت اور دستی کام سے عاری افراد کسی معاشرہ کے لیے نہ صرف بے فائدہ بلکہ اکثر حالتوں میں باعث نقصان بھی ثابت ہوتے ہیں۔

دستی کام سے اجتناب اور نفرت کا رجحان

بدقسمتی سے ماضی میں ہمارے ہاں دستی کام سے اجتناب بلکہ نفرت کا رجحان بہت بڑھ گیا تھا۔ جب ہندوستان پر انگریز قابض ہوئے تو انہوں نے ایک ایسے نظامِ تعلیم کی بنا ڈالی جس کا واحد مقصد ان کے دفتری نظام کو چلانے کے لیے پڑھے لکھے کارندے پیدا کرنا تھا۔ اس قسم کے نظامِ تعلیم کی سطحیت اور اسے رائج کرنے والوں کی خودغرضی سے متعلق لارڈ میکالے نے خود واضح الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ اپنی حکومت کے دوران میں انگریز ابتدا سے آخر تک اسی بیکار نظامِ تعلیم کی اشاعت کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ہاں تعلیم کی غرض و غایت کو ایک بے انتہا مریضانہ تاویل دی جاتی رہی۔ زندگی کی تیاری کے بجائے تعلیم کا مقصد محض دفتری ملازمت کی تیاری سمجھا جاتا رہا۔ طلبہ یہ سمجھتے رہے کہ ان کا اہم فریضہ گھوٹا لگا کر امتحان پاس کرنے تک محدود ہے۔ اساتذہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ ان کے درس و تدریس کا مقصد بچوں کو محض دفتری ملازمت کے لیے تیار کروانا ہے۔ اس تمدنی کوتاہی کا مجموعی نتیجہ یہ ہوا کہ پڑھنے اور پڑھانے والے دونوں ایک ایسی تنگ نظری اور سطحیت کا شکار ہو گئے جو ان میں جذبہ ہائے بلند اور فکر ملکوتی پیدا کرنے کے سخت منافی تھی۔

تعلیمی کمیشن اور دستی کام کی اہمیت

جب ہم آزاد ہوئے تو ہمیں اس امر کا شدید احساس ہونے لگا کہ ہمارا نظامِ تعلیم سراسر ناقص ہے یہ احساس ہمارے ذی بصیرت طبقوں میں دورِ غلامی میں بھی موجود تھا، مگر اس وقت وہ بے بس تھے کیوں کہ انگریز کی سیاست تعلیمی اصلاحات کے منافی تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد اس سمت میں بہت سنجیدہ غور و خوض شروع ہوا۔ تعلیم کے تمام مدارج کا کڑا جائزہ لیا گیا۔ متعدد مفید اصلاحات نافذ ہوئیں۔ اور ان میں سے بیشتر کو عملی جامہ بھی پہنایا گیا۔ ہماری تعلیمی اصلاحات کا سنہری دور قومی تعلیمی کمیشن کی سفارشات کی اشاعت سے شروع ہوتا ہے۔ تعلیمی کمیشن نے ہمارے نظامِ تعلیم کے تمام شعبوں کا ناقدانہ محاسبہ کیا۔ اور بہتر تعلیم کا ایک ایسا جامع نظام پیش کیا جو ہماری ملی ضرورتوں کو بہت اچھی طرح پورا کرتا ہے۔ تعلیمی کمیشن نے جہاں ہماری تعلیم کے باقی پہلوؤں پر روشنی ڈالی وہاں محنت

دردستی کام کی مرکزی اہمیت کو بھی خوب واضح کیا۔

آج ہم جس دور سے گذر رہے ہیں اسے مشینوں اور کارخانوں کا دور کہا جا سکتا ہے۔ صنعتی دور میں کامیابی اور ترقی مختلف قسم کے تربیت اور تجربہ یافتہ افراد پر منحصر ہے۔ یہ افراد خواہ انجینئر ہوں یا مستری یا عام مزدور ان کا محنت و مشقت کے اصولوں اور دستی کام کی عظمت سے بخوبی روشناس ہونا لازمی ہے۔ اس قسم کے محنت کش افراد اسی صورت میں وجود میں آ سکتے ہیں جب ہم اپنے نظامِ تعلیم میں ہاتھ کے کام اور جانفشانی کے اصولوں کو مقدم مقام دیں۔ مقامِ مسرت ہے کہ قومی تعلیمی کمیشن نے وطن کی اس بنیادی ضرورت کو اچھی طرح محسوس کیا ہے اور اس کے لیے نہایت موزوں پروگرام تجویز کیے ہیں۔

چھوٹے بچوں کے لیے مجوزہ دستی مشاغل

کمیشن نے تجویز کیا ہے کہ پرائمری سکولوں میں ہر ہفتہ طلبہ اور اساتذہ مل کر کسی ایسے شغل میں حصہ لیا کریں جس میں جسمانی محنت درکار ہو۔ مثلاً مدرسے کی عمارت ڈیسکوں اور دیگر سامان کی صفائی وغیرہ مدرسہ میں ایک چھوٹا سا باغیچہ لگانے سے اس سمت میں کافی کچھ ہو سکتا ہے۔ مجوزہ باغیچہ میں بچے باغبانی کے کام میں مصروف ہو کر بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح تجویز کیا گیا ہے کہ مڈل سکول کے بچے مدرسہ کی عمارت کی چھوٹی موٹی مرمت۔ قلعی اور لپائی وغیرہ کے کاموں میں حصہ لیں۔ مڈل سکول کے بڑے بچے تو مدرسہ کی عمارت کی تعمیر و توسیع میں بھی تھوڑا بہت حصہ لے سکتے ہیں۔ دستی محنت کے اس قسم کے کاموں میں شمولیت سے طلبہ کو نہ صرف ایک مفید شغل میں تربیت کا موقع ملے گا، بلکہ انھیں اکٹھے مل کر کام کاج کرنے اور ایک دوسرے سے تعاون کرنے کی عملی تربیت بھی ہو گی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے مشاغل بچوں کی سیرت اور اخلاق کی بہتر نشوونما کے لیے بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔ بڑی عمر کے بچے کئی دوسرے ملی معاملوں میں بھی قوم کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ مثلاً سیلاب کی روک تھام، بیماری کے خلاف انسدادی کارروائیاں، ٹریفک کے اصولوں کی پابندی کی اشاعت، وغیرہ۔

کالج اور یونیورسٹی طلبہ کے لیے دستی مشاغل

کالج اور یونیورسٹی طلبہ کے لیے اپنی درس گاہ کی صفائی وغیرہ میں حصہ لینا تو ضروری نہیں ہے

مگر ہوسٹل میں رہنے والے طلبہ کے لیے اپنے رہائشی کمروں کی صفائی میں ذاتی دلچسپی بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ کالج کے طلبہ اپنے ہوسٹل کے قیام و طعام کے تمام امور خود چلانے سے بھی دستی محنت کی عظمت سے روشناس ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح یونیورسٹی کے طلبہ اپنی کلبیں اور ریسٹورنٹ وغیرہ خود چلا کر نوکروں پر غیر معمولی احتیاج کی شخصیت کش عادت سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔

کمیشن نے یونیورسٹی اور کالج کے طلبہ کے لیے تو منظم غیر نصابی کام کے بہت مفید پروگرام بھی وضع کیے ہیں۔ طلبہ کے لیے تعطیلاتِ گرما میں دو یا تین ہفتے کے لیے تعمیری کاموں میں حصہ لینے کی سفارش کی گئی ہے اس قسم کے قومی تعمیری کام جن میں طلبہ کی شمولیت تجویز کی گئی ہے تین گروہوں میں بانٹے گئے ہیں۔

اوّل :- ملی منصوبوں سے متعلقہ کام

دوم :- قومی خدمت کے مشاغل

سوئم :- ملکی دفاع کا پروگرام۔

ملی منصوبوں کے کاموں میں ملک کی اقتصادی ترقی اور صحت وغیرہ کے تمام منصوبے مثلاً ملیریا کے خلاف جہاد، سیلاب کی روک تھام وغیرہ وغیرہ شامل کر لیے گئے ہیں۔ قومی خدمت کے کاموں میں تعلیم بالغان کو نمایاں اہمیت دی گئی ہے۔ ملکی دفاع کے پروگراموں میں شمولیت کے لیے باقاعدہ فوج اور سول ڈیفنس میں شرکت پر زور دیا گیا ہے۔ طالبات کے لیے نرسنگ اور تعلیم بالغاں کے منظم پروگراموں میں شرکت تجویز کی گئی ہے۔ ان ملی مشاغل میں تمام طلبہ کی شمولیت کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔

مجوزہ مشاغل کی اہمیت

اس قسم کے مفید مشاغل میں طلبہ کی شرکت کی افادیت محتاج وضاحت نہیں۔ سکول، کالج اور یونیورسٹیاں خالص کتابی ادارے ہی نہیں ہیں۔ بلکہ ان کا کام طلبہ کو زندگی کے تمام مسائل سے نبرد آزمائی کے لیے تیار کرنا ہے۔ اگر تعلیم کو فقط درسی نصاب سمجھنے تک ہی محدود رکھا جائے تو اس سے طلبہ روزی کمانے کے قابل تو ہو سکتے ہیں مگر ان میں شخصیت اور کردار کے وہ بلند اوصاف کبھی بھی اجاگر نہیں ہو سکتے جو اعلیٰ اور جامع زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ اس کے علاوہ طلبہ جو تعلیم کو محض کتابوں تک ہی محدود رکھتے ہیں ہ

میدان میں بھی بہت خسارہ اٹھاتے ہیں۔ اس قسم کے کوتاہ بین طلبہ بعض ان ملازمتوں کے لیے موزوں ثابت ہوتے ہیں، جن میں خالص لکھائی پڑھائی درکار ہو۔ ظاہر ہے کہ اس صنعتی اور اقتصادی دور میں اس قسم کے کتابی روزگار دن بدن کم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ عصر حاضر میں زیادہ مانگ ایسے افراد کی ہے جنھیں کوئی نہ کوئی عملی فن آتا ہو۔ بلکہ متعدد پیشے ایسے بھی ہیں جو بظاہر ہیں تو خالص علمی اور ادبی مگر جن میں اس قسم کے افراد زیادہ چمکتے ہیں، جنھیں دستی کام کی تربیت بھی میسر آئی ہو۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو دستی محنت کی تربیت تقریباً ہر قسم کے روزگار کی تیاری کے لیے ضروری ہے۔

ہمارے ماضی کے نظام تعلیم کی بنیادی خامی بھی یہی تھی کہ اس میں فقط کتاب پر زور دیا گیا تھا۔ چناں چہ تعلیم کا واحد مقصد کتابیں پڑھنا امتحان پاس کرنا اور پھر کوئی ایسی ملازمت تلاش کرنا متصور ہوتا تھا جس میں ہاتھ پاؤں ہلانے کی بجائے بیک جنبش قلم سب کچھ بیٹھے بٹھائے مل جائے۔ تعلیم کے اس مریضانہ تصور کی وجہ سے ہمارے طلبہ کلرکی اور آفیسری وغیرہ کی ملازمتوں کے لیے مرتے تھے۔ ہمارے نئے نصاب تعلیم نے اس مریضانہ تصور پر ضرب کاری لگائی ہے اور طلبہ کو محنت و مشقت اور جسمانی کام کی عظمت سے روشناس کرانے کے لیے قابل عمل پروگرام پیش کیے ہیں۔

گھریلو تربیت کا مقام

دراصل محنت اور جسمانی کام کی عظمت سے روشناس کرانے کے لیے مدرسہ، کالج یا یونیورسٹی کی تعلیم ہی کافی نہیں۔ بلکہ اس میں گھریلو تربیت کو بھی بہت دخل ہے۔ ہمارے اکثر گھروں میں بچوں کی تربیت کے اس بنیادی پہلو کو بہت بُری طرح نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور بچے خصوصاً کھاتے پیتے گھروں میں ذکر چاکر یا افراد بڑھ جاتے ہیں۔ ایسے گھروں میں بچے کا ہر چھوٹا بڑا کام نوکروں کے سپرد ہوتا ہے۔ کھانا، پینا، کھیلنا کودنا، غسل اور غسل کے بعد کپڑوں کی تبدیلی وغیرہ۔ غرضیکہ بچوں کے سب کام نوکروں کی تحویل میں ہوتے ہیں۔ ان گھروں میں بالغ افراد اپنے کام خود کرنے میں بہت ہتک محسوس کرتے ہیں۔ چناں چہ چھوٹے بچے بھی بڑوں کی دیکھا دیکھی نوکروں کے اس قدر محتاج ہو جاتے ہیں کہ اُن میں اپنے کاموں کو اپنے ہاتھ سے کرنے کی صلاحیت بالکل مفقود ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے بچے جب نوکروں کی مسلسل نگہداشت سے گھر یا اولا سے

نکل کر مدرسہ پہنچتے ہیں تو انھیں اس بدلے ہوئے ماحول کے نئے تقاضوں سے مطابقت کرنے میں بہت تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کھیل کے میدان میں بھی انھیں بہت دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عمر کے ابتدائی دور میں ہاتھ پاؤں ہلانے اور جسمانی محنت کے کاموں میں حصہ لینے کی عملی کوئی تربیت میسر نہ آنے سے ایسے بدنصیب بچے بالغ ہو کر طرح طرح کی تکلیفوں سے دوچار رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر خواہش اور حقیقت میں بھیانک تضاد پا کر مایوسی اور محرومی کا شکار بھی رہنے لگتے ہیں۔

امیر گھرانوں کے علاوہ متوسط گھرانوں میں بھی بچوں کو دستی کام کی تربیت سے محروم رکھا جاتا ہے۔ کئی گھروں میں تو والدین خصوصاً والدہ اور اکثر بزرگ لوگ بچے کو اپنا ہاتھ ہلانے تک نہیں دیتے۔ اس قسم کی بیجا اور غلط نگہداشت کی فضا میں پلے ہوئے بچے میں کش مکش حیات سے نبرد آزمائی کی صلاحیت پیدا ہونی ناممکن ہے۔ چناں چہ زندگی کے جس مرحلے پر بھی ہاتھ ہلانے اور محنت کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے، اس قسم کا نازونعمت زدہ بچہ طرح طرح کی مصیبتوں اور الجھنوں کا شکار رہتا ہے۔ بلکہ کئی حالتوں میں خلاف معاشرہ حرکات اور جرائم کی طرف مائل ہو جاتا ہے

نچلے گھروں کی قابل تقلید مثال

اس سمت میں شاید نچلے گھرانوں کا رویہ سب سے زیادہ صحت مندانہ ہے۔ تمام غریب گھرانوں میں بچے گھریلو کام کاج میں والدین کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ گھر کے روزمرہ دھندوں میں مناسب شرکت سے نہ صرف ان کی معلومات عامہ بڑھتی ہے بلکہ ان کی سیرت اور اخلاق بھی اعلیٰ سانچے میں ڈھلتے ہیں۔ ان میں جفاکشی کے اوصاف اجاگر ہوتے ہیں۔ اگر انھیں زندگی کے باقی شعبوں میں بھی مناسب رہنمائی میسر آ جائے تو اس قسم کے افراد آئندہ چل کر زندگی کے ہر شعبے میں قوم کی بیش بہا متاع ثابت ہوتے ہیں۔ اونچے اور متوسط طبقوں کے والدین کو چاہیے کہ وہ بچوں کی تربیت کے اس اہم پہلو کے بارے میں نچلے طبقہ کے والدین سے رہنمائی حاصل کریں۔ اور اپنے بچوں کو محنت ومشقت اور دستی کام میں تربیت کی نعمتوں سے محروم رکھنا چھوڑ دیں۔

مسئلۂ تحریکِ ذہنی

ڈاکٹر کوثر حسین

بچے فطرتاً نہایت چست اور پھرتیلے ہوتے ہیں تجسس کا مادہ بھی رکھتے ہیں اور کچھ سیکھنے کی خواہش
رکھتے ہیں. وہ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن حصولِ معلومات کے طریقوں سے واقفیت نہیں رکھتے
ہیں صاف اور زہریلے پانی میں امتیاز کرنا ان کے بس کی بات نہیں. مفید و مضر میں فرق ان کی بلا جانے
شے جو نگاہوں اور کانوں کو بھلی معلوم ہو انھیں اپنی طرف مائل کرلیتی ہے. یہ معلومات کے شیدائی
آواز پر لبیک کہنے کو تیار رہیں اور ہر چمک پر جان دینے کے لیے آمادہ.

اور مدرسہ

بچے ماں کی آغوش اور گھر کے صحن کی تعلیمی و تادیبی منزلیں طے کرکے ہمسائے کی غیر رسمی اٹھا پھری
درسگاہ سے ہوتے ہوئے جب باقاعدہ تعلیم کے لیے مدرسوں میں آتے ہیں تو خالی نہیں آتے بلکہ اسطرح
ناب شوق در بغل ہے. وہی شوق جو رہ رہ کر آنکھوں کے دریچوں سے جھانکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ
معلومات چاہتا ہے. مگر حصولِ معلومات کا یہ شوق اسی وقت تک ہے جب بچوں کو ان کی مرضی کی معلومات
پہنچائی جائیں، اچھی اچھی مزیدار، دل کش یعنی ایسی جو اپنے اندر دل چسپی کا سامان رکھتی ہوں، ورنہ
روٹھ جائیں گے. اور ان کا شوق بدشوقی یا بیزاری کی صورت اختیار کرلے گا۔

مدرسہ جو چھوٹے چھوٹے بچوں کے لیے بڑے بڑے عزائم لیے کھڑا ہے، وہ بچوں کو فعالی تنوع اور
ان کی پوری پوری نشو و نما کا آرزو مند ہے. کیوں کہ یہی تو ان کو دائروں کی ترقی پذیر شخصیت کا لازمہ ہے
پھلنے پھولنے کے لیے ہر جانب نگراں ہے. مدرسہ ان کو دوسروں کے ساتھ مل کر رہنے اور معاشرے میں
حاصل کرنے کے قابل بھی بنانا چاہتا ہے. کیوں کہ اِس صلاحیت کے بغیر معاشرے کے جم غفیر میں
پاؤں پر کھڑا ہونا اور آگے بڑھنا ان کے لیے ناممکن ہو جائے گا. گویا مدرسہ انفرادیت کا زندگی

جاتا ہے۔ اور ایک حد تک انفرادیت اور سماجیت کا سنجوگ بھی۔ ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے بچوں کو سلیقہ سکھانا بھی ضروری ہے اور مروجہ سماجی خیر و شر اور نظریات خطا و صواب کا احساس دلانا بھی ضروری۔ اس لیے ایک بے نام "علم اخلاق" کی تلقین مدرسے کے پہلے ہی دن سے شروع کر دی جاتی ہے۔ مثلاً نرسری سکول کی معلمہ یہ چاہتی ہے کہ بچے سلیقے سے کپڑے پہنے رہیں اور بچوں کا بقول نظیر اکبرآبادی یہ حال کہ

ننگے پھریں تو کیا ہے پہنے پھریں تو کیا ہے
یاں یوں بھی واہ وا ہے اور ووں بھی واہ وا ہے

قلم دوات کی روشنائی جو تختی پر حروف بناتی ہے، اگر ہاتھوں یا گالوں کو تختی بنا دے تو کیا ہرج ہے۔ اور ہاتھ تالیاں بجانے بجائے کسی دوسرے بچے کے سر سے بھی ایک تال پیدا کر دیں تو کیا مضائقہ، جس بات کو جی چاہا وہ اچھی، جو کام آسان ہو وہی بہتر، اور جس شکل پر دل مائل ہو وہی سب سے آسان۔ ان کا شوق پورا ہونا چاہیے، نہ فائدے سے غرض نہ انجام سے کام۔ مگر مدرسے کو بچوں کے فائدے سے بھی غرض ہے اور انجام سے بھی کام ہے۔ اس لیے مدرسے کی ذمہ داریاں روز بروز بڑھتی جاتی ہیں، کیا معلوم کل کو مدرسہ مذکورہ بالا امور کے علاوہ بھی کچھ اور چاہنے لگے۔

سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو (انیسؔ)

اس وقت مدرسہ جو کچھ چاہتا ہے بچے اس میں سے کچھ چاہتے ہیں اور کچھ نہیں چاہتے جو وہ چاہتے ہیں اس کے لیے وہ ہمہ تن گوش اور ہمہ تن چشم ہیں، جو نہیں چاہتے، اس کو دیکھنا اور سننا بھی انھیں گوارا نہیں، جو مشغلہ بچوں کی دلچسپی کے مطابق اور فطری رجحانات کے موافق ہوتا ہے، وہ خود بخود ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، بلکہ بچے اس کے لیے بےتاب نظر آتے ہیں۔ مگر مدرسے کے وہ مشاغل بھی جو دلچسپی کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔ بچوں کی نشو و نما کے لیے ضروری، اور سماجی نقطۂ نظر سے اہم ہوتے ہیں۔ اس لیے ان غیر دلچسپ مشاغل کو بچوں کے لیے قابل قبول بنانا پڑتا ہے

تحریک ذہنی کی تعریف :- وہ عمل جو بچوں کو شوق دلانے اور انھیں کچھ سیکھنے پر آمادہ کرنے کے

اختیار کیا جائے تعلیمی اصطلاح میں تحریکِ ذہنی کہلاتا ہے۔

تحریکِ ذہنی کی ضرورت پر نفسیاتی حجت

جدید نفسیات نے انکشاف کیا ہے کہ طالب علم کسی چیز کو مستعدی سے نہیں سیکھتا تا وقتیکہ اسے اُس چیز سے دِل چسپی نہ ہو۔ گویا تحریکِ ذہنی کا مسئلہ تحصیل علم کی مزید صلاحیت کا مسئلہ ہے کیوں کہ تحریکِ ذہنی طالب علم کو کچھ سیکھنے کے لیے مستعد و آمادہ کر دیتی ہے۔

علاوہ ازیں عادات و اطوار کی نشوونما تحریکِ ذہنی کے عمل سے براہِ راست وابستہ ہے۔ چناں چہ اگر کسی کام کو سیکھنے کا عمل اس طرح انجام پاتا ہے کہ دِل چسپی اور ولولہ شوق بھی موجود ہو تو نہ صرف اِس کام کی جانب، بلکہ اِس قسم کے دوسروں کاموں کی جانب بھی ایک مستقل میلانِ طبع پیدا ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی طالب علم خوش گوار اور خوش آئند فضا میں اردو ادب کا مطالعہ کرتا ہے تو اغلب یہی ہے کہ اِس فضا کی خوش گواری طالب علم اور مطالعۂ ادب میں ایک خوش گوار رابطہ قائم کردے گی یہ مضمون اِس طالب علم کی ذات کا ایک جزو بن کر اس کی توجہ کو خود بخود اپنی طرف مبذول کرے گا۔ اور طالب علم اِس کا عادی ہو جائے گا۔ گویا تحریکِ ذہنی جو خوش آئند فضا کو مستلزم ہے کسی سبق کی آموزش کو آسان ہی نہیں بناتی۔ بلکہ طلبہ کے دِل میں اِس سبق کے متعلقہ مضمون کا "چسکا" پیدا کر دیتی ہے، جو مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ یہ چسکا یا مستقل دل چسپی جو اکتسابی میلان (یا عاطفہ) کی پیدا کردہ ہوتی ہے، دل و دماغ پر ہمیشہ چھائی رہتی ہے۔ اور تقریر و تحریر کے ہر پہلو سے اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ اگر طلبہ موادِ تعلیم سے دِل چسپی لے رہے ہوں تو قدرتی طور پر جماعت میں ان کا رویہ اچھا ہی رہے گا۔ نہ کوئی شرارت ہوگی، نہ کوئی انضباطی و تادیبی مسئلہ پیدا ہوگا۔ اس سے ایک طرف معلم ناخوش گوار اعصابی کوفت سے محفوظ رہے گا اور دوسری طرف اس کی توجہ طلبہ کی تعلیمی ضروریات پر مرکوز ہو سکے گی۔ انہماک کی بدولت خود طلبہ کی توجہ کسی دوسری طرف منعطف نہ ہوگی۔ تحصیلِ علم کی اعلیٰ قابلیت کا حصول دراصل ایسی ہی دل چسپ و خوش آئند فضا میں ممکن ہے، اور ایسی ہی فضا پیدا کرنے کے لیے تحریکِ ذہنی سے مدد لی جاتی ہے۔

دل چسپی اور توجہ

جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا۔ آموزش کے لیے طالب علم کی توجہ کا حصول ایک ضروری شرط ہے۔ لیکن ایسی توجہ جس میں دل چسپی کا عنصر غائب ہو، بے جان و بے اثر، لچر اور نہایت مختصر ہوتی ہے۔ عدم توجہ کی ہزار وجوہ ہو سکتی ہیں لیکن توجہ کی، یعنی ایسی توجہ کی جو کچھ عرصے تک قائم رہے، اور تحصیل علم و فن میں مدد ہو۔ صرف ایک ہی وجہ ہے جو دل چسپی کے سوا کچھ نہیں۔ یہاں توجہ کی اقسام پر سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے۔ کیوں کہ دراصل تعلیم کے لیے متعلم کی توجہ ہی درکار ہوتی ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ توجہ دل چسپی کی بعو کی ہے۔

توجہ کی اقسام

توجہ کی مندرجہ ذیل تین اقسام ہیں، جن کی نوعیت ان کے نام سے ظاہر ہے۔

(۱) غیر ارادی (۲) ارادی (۳) ثانوی غیر ارادی

(۱) غیر ارادی توجہ میں مرضی یا ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ خارجی اسباب کے تحت خود بخود عمل میں آجاتی ہے۔ مثلاً شور و غل یا اچانک چیخ کی آواز ہماری توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ نشو و نما کے لحاظ سے یہ توجہ کا پہلا درجہ ہے، چمک دمک، تماشے، قصے، تصاویر، مناظر یا ایسی ہی دوسری چیزیں جو حسن و جمال کی حامل ہوں، اپنی طرف مائل کر لیا کرتی ہیں، بالعموم ہیج کی شدت کوئی نمایاں خصوصیت حرکت، ندرت یا تکرار اس توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔ دراصل اس توجہ کا تعلق کسی نہ کسی جبلت سے ہوتا ہے، اس توجہ کے مظاہرے چھوٹے بچوں میں بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔ بچے انہی چیزوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو ان کی جبلتوں سے وابستہ ہوں، دراصل یہی وہ فطری سرچشمے ہیں جن پر حقیقی تحریک ذہن کا انحصار ہے۔ تعلیمی ماحول کی تشکیل اس نہج پر ہونی چاہیے کہ یہ چشمے خود ابل پڑیں۔ ایک استاد جماعت سے یہ کہہ کر دیکھیے۔ اس سوال کو کون حل کر سکتا ہے؛ بچوں کی خود نمائی کی جبلت کو بیدار کر دیتا ہے۔ اسی طرح تجسس، گروہ پسندی، تعمیر، تحصیل اور اثبات ذات کی جبلتوں سے کام لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً گروہ پسندی کی جبلت سے مدد لے کر شہریت کا سبق پڑھایا جا سکتا ہے۔ اسی جبلت کی بدولت بچے اپنے قریب کے

د ہینے والوں کے حالات شوق سے سنتے ہیں اور اپنے آباؤ اجداد کے کارنامے سننے کی خواہش رکھتے ہیں معلّم اس رجحان سے تاریخ کی آموزش کا مصرف لے سکتا ہے۔

(۲) ارادی توجہ میں ہمارے ارادے اور کوشش کو پورا پورا دخل ہوتا ہے۔ اگر کوئی شے یا کوئی صورتِ حال بذاتِ خود جاذبیت نہ رکھتی ہو اور ہم (کسی مقصد کے پیشِ نظر یا کسی فائدے کے خیال سے) اس کی جانب توجہ کریں، تو یہ توجہ ارادی یا فعالی توجہ کہلائے گی۔ زندگی میں بعض اوقات بلکہ اکثر اوقات بے کیف اشیاء کی جانب بھی متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ کیوں کہ مقصد کا حصول اس کے بغیر ممکن نہیں ہوتا گویا حصولِ مقصد کی آرزو ہی اس توجہ کی محرک ہوتی ہے۔ لیکن ایسی توجہ بالغ اور پختہ سیرت لوگوں کا طرۂ امتیاز ہے: بچوں سے اس کی توقع عبث ہے۔ البتہ بڑے لڑکوں کو مقصد کا تصور دلا کر اور کسی کام کی عظمت یا افادیت سمجھا کر متوجہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً بعض مضامین کسی خاص پیشے کے لیے بہت اہم ہوتے ہیں، جیسے فزیالوجی ڈاکٹری کے لیے۔ ریاضی انجینئرنگ کے لیے، اگر پیشہ پسند آ جائے تو متعلقہ مضامین کی جانب توجہ کی تحریک ہو سکتی ہے۔ مگر چھوٹے بچے فوری مسرت کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ وہ کسی خوش کن نتیجہ کے بھروسہ پر کام سے دل لگانے کو تیار نہیں ہوتے۔ ان کے لیے فطری محرکات یعنی وہ جو ان کی جبلتوں سے وابستہ ہوں بروئے کار لانا چاہئیں کیوں کہ بچوں کی توجہ مقاصد سے بے نیاز ہوتی ہے۔

(۳) ثانوی غیر ارادی توجہ :- جب ارادی و دیر کسی جانب توجہ مبذول کی جائے تو اُس جانب توجہ کرنے کا ایک مستقل رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے اکتسابی رجحانات کو عواطف کہتے ہیں جو جبلتوں کی طرح دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ شے جس کی طرف پہلے ارادتاً توجہ کی جاتی تھی۔ اب خود بخود توجہ کو اپنی طرف مائل کر لیتی ہے۔ یہ ارادی توجہ کا ثمرہ ہے۔ اور اُس محنت کا پھل جو شروع شروع میں از نکاز توجہ کے لیے کرنی پڑتی تھی۔ مثلاً جب سائیکل چلانا سیکھتے ہیں تو بڑی محنت اور کوشش سے سائیکل پر توازن قائم رکھ سکتے ہیں۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد سائیکل چلانا میکانکی ہو جاتا ہے اور کسی ارادی توجہ کی مطلق ضرورت نہیں پڑتی۔

قابل اساتذہ کی تعریف اکثر ان الفاظ میں سنی گئی ہے کہ وہ اپنے تلامذہ کے دل میں حصولِ علم کا "چسکا" یا ذوق پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ چسکا یا ذوق اصطلاح نفسیات میں عاطفے سے جدا کوئی شے نہیں ہے۔

حلقۂ معلمین میں درسیات کی تشویق و ترغیب کے بہت سے طریقے رائج ہیں اور کہنہ مشق اساتذہ خود وقتاً فوقتاً ان میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

تشویق یا تحریکِ ذہنی کے طریقے

(۱) مستعدی یا تیزی سے سوالات کرنا طلبہ کی ذہنی فعّالی کو بیدار کرتا ہے کیوں کہ اِس طرح طلبہ سوچنا شروع کر دیتے ہیں اور تجسّس کا جبلّی رجحان حرکت میں آ جاتا ہے۔

(۲) ان معاملات یا مسائل کا ذکر جو اس وقت طلبہ کی دلچسپی کا محور ہوں۔ طلبہ کے ذہن کو بہت جلد اپنی طرف مائل کر لیتا ہے۔ اور کامیاب معلم ان مسائل سے موزوں طور پر گریز کر کے، سبق کی طرح ڈال سکتا ہے۔

(۳) سبق کے مقصد کا اعلان کر کے اور اس کی افادیت کا احساس دلا کر کم از کم بڑے بچوں کی توجہ حاصل کی جا سکتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اگر سبق کے مقصد سے شروع ہی میں طلبہ کو آگاہ نہ کیا جائے تو وہ اپنی استعداد کے مطابق قیاس آرائی کرتے ہیں۔ اور اصل مقصد سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ اگر انھیں سبق کا فائدہ معلوم نہ ہو تو کچھ عجب نہیں کہ وہ اس سبق کو معمولی بات سمجھ کر اغماض برتیں۔

(۴) طلبہ کی توجہ کو مفید و موثر بنانے کے لیے انحرافی اسباب کا سدِّ باب ضروری ہے، طلبہ کے غیر معمولی ہیجے اور شور و غل سے اس خوش فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ طلبہ دلچسپی لے رہے ہیں۔

(۵) سبق کو ایک حل طلب مسئلے کی صورت میں پیش کرنا تشویق کار کی ایک کامیاب صورت ہے طلبہ کی جبلّتِ تجسّس و جبلّت خود نمائی ہر دو حرکت میں آ جاتی ہیں۔ وہ مسئلے کا حل معلوم کرنے کے لیے ایک ذہنی بے چینی محسوس کرنے لگتے ہیں۔

(۶) انفرادی و اجتماعی منصوبے طلبہ کو عام تعلیم کا شوق دلانے میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

(۷) تعلیمی سیر و سیاحت نہ صرف ان تاریخی وجغرافیائی معلومات کا شوق پیدا کرتی ہے جن کے لیے سیر و سیاحت اختیار کی جائے، بلکہ اس سے م. یدمعلومات حاصل کرنے کا شوق بھی پیدا ہو جاتا ہے. یہ شوق مطلوبہ معلومات کو ان کے قدرتی ماحول میں دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے. جہاں وہ اپنے حقیقی رنگ و روپ میں ہوتی ہیں۔ تعلیمی سیر میں باقاعدہ پروگرام اور اس کی کڑی نگرانی کی ضرورت ہے. مبادا محض تفریح پر منتج ہو۔

(۸) ذاتی ترقی یا جماعت یا مدرسے کی ناموری کا احساس دلانا بھی بالخصوص بڑے بچوں میں شوق وولولہ پیدا کر دیتا ہے۔

(۹) توضیحات وتشریحات پیش کرنا بھی طلبہ کو ذہنی طور پر سبق کے لیے تیار کر دینا ہے. بلکہ سبق کے دوران میں بھی توضیحات کی ضرورت پڑتی رہتی ہے. اگر سبق کا کوئی حصہ غیر واضح رہ جائے تو سبق کے اگلے پچھلے حصے غیر متعلق ہو کر بے معنی ہو جاتے ہیں اور طلبہ کی دل چسپی بھی معنوی تسلسل کے خاتمے کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے. وہ توجہ ہی کیا جو اس حالت میں بھی منتشر نہ ہو؛ چناں چہ ہو جاتی ہے. اس لیے لائق معلم سبق کے ہر مشکل حصے کے لیے توضیحات تیار رکھتا ہے۔

توضیحات کی اقسام

توضیحات کی دو قسمیں ہیں اول لفظی یا زبانی دوم بصری یا مرئی

۱. لفظی یا زبانی توضیحات سے اجزائے سبق کی وہ تشریحات مراد ہیں جو معلم کی طلاقت لسانی کی مرہون منت ہوتی ہیں. اس کے لیے مضمون زیر مطالعہ پر ہمہ گیر آگاہی اور زبان پر کماحقہٗ عبور ضروری ہے. اور مہارت کے بغیر تو کوئی کام بھی بطریق احسن انجام نہیں دیا جا سکتا. مہارت یقینی طور پر تجربے کو مستلزم ہے. اس لیے تشریح وتوضیح کا کام قابل اور برگزیدہ کارمعلمین ہی کا حصہ ہے. مگر ہر معلم کو کرنا پڑتا ہے. معلم سبق کی عبارت. اصول یا اور کسی جزو کی وضاحت کے لیے کبھی تشبیہ وتمثیل سے کام لیتا ہے، کبھی قصص یا متضاد کیفیات کے حوالے سے. اور کبھی تفہیم کی خاطر تلخیص کر دیتا ہے. اس حیثیت سے تلخیص بھی منجملہ توضیحات ہے. کیوں کہ یہ بھی وضاحت مفہوم میں ممد ہوتی ہے۔

۱۱. بصری یا مرئی توضیحات:- یہ وہ توضیحات ہیں جو مقرون حیثیت رکھتی ہیں. اور جنھیں طلبہ

دیکھ اور چھو سکتے ہیں۔ اس قسم کی توضیحات، تعلم میں زیادہ کارآمد سمجھی جاتی ہیں۔ مرئی توضیحات کی حسب ذیل چار قسمیں ہیں۔

(i) اصل شے (ii) ماڈل یا نمونہ (iii) تصویر (iv) نقشہ یا خاکہ وغیرہ

(i) اصل شے :- اگر سبق کی مذکورہ اشیا آسانی سے دستیاب ہوجائیں اور وضاحت کے لیے طلبہ کے سامنے جماعت میں لائی جاسکیں تو ضرور لانی چاہئیں۔ کیوں کہ یہی بہترین سامان توضیح ہیں۔ اور راست طریقہ تعلیم کا ذریعہ بھی۔ لیکن عام طور پر اصل اشیاء لاکر دکھانا مشکل ہوتا ہے اور بعض اوقات ناممکن بھی مثلاً کارخانہ یا پہاڑ اٹھاکر جماعت کے کمرہ میں نہیں لایا جاسکتا۔ ایسی صورت میں کارخانے یا پہاڑ وغیرہ کے ماڈل سے توضیح کا صرف لیا جاسکتا ہے۔

(ii) ماڈل :- بچوں کے لیے تصویروں یا نقشوں کے مقابلے میں، ماڈل مفید تر ثابت ہوتے ہیں کیوں کہ ماڈل اصل شے کا صحیح نمونہ ہوتا ہے۔ وہ ابعادِ ثلاثہ (طول، عرض، بلندی) رکھتے ہیں تصاویر میں یہ بات کہاں۔ مگر توضیحی ماڈل میں اصل شے کے وہ پہلو ضرور نمایاں ہونے چاہئیں جن کی خاطر ماڈل پیش کیا جارہا ہے تاکہ اس کی افادیت میں فرق نہ آئے توضیحی کام کے لیے یہ ضروری ہے کہ بہت چھوٹی چھوٹی چیزوں کے ذرا بڑے ماڈل بنائے جائیں تاکہ بچے انھیں اچھی طرح دیکھ کر سمجھ سکیں۔ پھر طلبہ سے بھی ویسے ماڈل بنوائے جائیں تاکہ ماڈل سے متعلق جملہ معلومات ذہن نشیں ہوجائیں علاوہ ازیں اس طرح تخلیقی قوتوں کی نشوونما کا موقع بھی بہم پہنچے۔ بہت خوبصورت ماڈل مفید مطلب نہیں ہوتے۔ بلکہ بعض اوقات توانحراف کا سبب بن جاتے ہیں۔ ماڈل کی صفت یہ ہے کہ سادہ ہو اور اس اصول کی توضیح کرے جس کی خاطر ماڈل بنایا گیا ہے۔ اگر جمالیاتی احساس پیدا کرنا مقصود ہو تو بجائے ماڈل کے تصاویر پیش کی جائیں۔

(iii) تصاویر :- ماڈل کسی اصل شے مثلاً عمارت کی شکل کو بدرجہ اتم ظاہر کردیتا ہے۔ لیکن وہ ایسا جمالیاتی احساس پیدا نہیں کرسکتا۔ جیسا ایک تصویر آسانی سے کرسکتی ہے۔ کیوں کہ تصویر عمارت کو مع پس منظر پیش کرتی ہے طلبہ کو دکھانے اور سبق کا شوق دلانے یا سبق کے کسی حصے کو سمجھانے کے لیے

کارڈ سائز کی تصاویر بھی کام دے سکتی ہیں لیکن ان کی تعداد کافی ہونی چاہیے تاکہ توضیح کے وقت طلبہ میں
تقسیم کر دی جائیں اور وہ انفرادی طور پر انھیں اچھی طرح سے دیکھ سکیں۔

(۷) خاکے گراف اور نقشے :- تصویر اصل شے کی مجموعی کیفیت کا اظہار کرتی ہے۔ خاکوں اور نقشوں
سے جزوی مطالعے کا مصرف لیا جاتا ہے۔ دراصل خاکوں کا صحیح مصرف یہی ہے۔ پیچیدہ خاکے بے کار بلکہ
مضر ہوتے ہیں۔ خاکے میں صرف وہی باتیں دکھائی جائیں جن کا بتانا مقصود ہے۔ بعض معلم سبق کے
ساتھ ساتھ تختہ سیاہ پر خاکہ بناتے جاتے ہیں۔ یہ بہترین طریقہ ہے سبق کے بعد ایسے خاکے، نقشے اور
گراف وغیرہ طلبہ سے بھی بنوانے چاہئیں۔

توضیحات کی افادیت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن غیر ضروری توضیحات یقیناً تضیع
اوقات کا باعث ہوتی ہیں۔ اس لیے توضیحات کا انتخاب سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے اور مرئی توضیحات
کے ساتھ ساتھ زبانی توضیحات سے بھی مدد لینی چاہیے۔ چھوٹے بچوں کی تعلیم میں مرئی توضیحات کی زیادہ
ضرورت ہے۔ بڑے بچوں کے سمجھانے کے لیے بڑی حد تک زبانی توضیحات پر بھی بھروسہ کیا جا سکتا ہے
توضیحات کے انتخاب میں بلحاظ عمر طلبہ کی دل چسپی کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے، جیسا کہ
شروع میں بیان کیا گیا ہے، دل چسپی کا تعلق جبلات و عواطف سے ہے۔ دل چسپی اسی وقت پیدا
ہو سکتی ہے جب کوئی شے کسی نہ کسی جبلی تحریک سے وابستہ ہو یا اکتسابی ہونے کے سبب کسی عاطفے
سے پیوستہ ہو۔

امریکی نظامِ تعلیم کے چند پہلو

عبدالغفور چودھری

تعلیم بالغاں

امریکہ میں تعلیم بالغاں کا کام کرنے والے کے سامنے عوام کو خواندہ بنانے کا مسئلہ ہی نہیں ہے یہ افتاد تو پس ماندہ اقوام کے حصے میں آئی ہے۔ امریکہ میں تعلیم بالغاں کا کام زیادہ وسیع اور وقیع ہے اور زیادہ شان و شوکت رکھتا ہے۔ یہاں اس کا مقصد بالغوں میں نوشت و خواند کی صلاحیت پیدا کرنا نہیں۔ یا سوتوں کو پہلی بار جگانا نہیں۔ بلکہ اس زندگی بخش چشمے کو دوامی طور پر جاری رکھنا ہے۔ مختلف حالات میں یہ تعلیم گوناں گوں صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ اور مختلف قسم کی تنظیم اور طریق اختیار کرتی رہتی ہے۔

امریکہ ایک نیا ملک ہے۔ صدیوں تک ایک نیا ملک رہا۔ اس کا آسمان نیا ہے۔ اس کی زمین نئی ہے اس میں بسنے والے نئے ہیں۔ ان میں زندگی کا بے پناہ جوش اور ولولہ ہے۔ امریکی نو آباد سونے چاندی کی کانوں کی تلاش میں مستقل اور پیہم طور پر مشرق سے مغرب کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ہزاروں سال کے پرانے جنگلات کو کاٹ کر زراعتی فارموں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ لاکھوں برس کی خاموش پہاڑیوں کے دامن کو ہتھوڑے اور چھینی کی ضرب سے گونجا دیتا ہے۔ اسی طرح وہ ذہنی وسعتوں کے لیے افق تیار کرنے کی جستجو میں لگا رہتا ہے۔ اس کی زندگی علمی اور ذہنی جستجو کا ایک پیہم جہاد ہے۔ نئے برِعظیم کے نئے فرد میں ذہنی ترقی کی اُمنگ اٹھتی ہے تو سماجی ماحول اس امنگ کو بڑھانے اور نشوونما دینے کے لیے پورے طور پر آمادہ ہے۔ معاشرے اور فرد کے اس باہمی تعاون سے زندگی بے پایاں طبعی اور ذہنی وسعتیں باغ و بہار بنتی چلی جاتی ہیں۔

تعلیم بالغاں کا آغاز پہلے پہل ۱۸۲۶ء میں لیسیم (LYCEUM) کی تحریک کی صورت میں نمودار ہوا۔ یہ تحریک کیا تھی۔ یوں سمجھیے کہ عوام کے لیے ایک چلتی پھرتی یونیورسٹی تھی۔ اِس تحریک میں ایک وقت امریکہ کے عظیم ترین مفکرین اور شعراء نے حصہ لیا اور اسی کے پلیٹ فارم پر ایمرسن جیسے فلسفی نے زندگی کا نیا فلسفہ اپنی پوری گہرائی اور وسعت کے ساتھ عام لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اس شاندار گروہ کے دوسرے افراد ویل اور ہاک بروک ہیں۔ زمانہ بدل گیا اور اس کے ساتھ ماحول بھی تبدیل ہوتا رہا۔ اور تحریک نے ایک نئی صورت اختیار کرلی، جسے فورم تحریک کہتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آغاز میں ابھی جمہوریت کی آواز کچھ دھیمی تھی۔ اس کی روانی میں بحرِ ذخار کا جوش و خروش یا پہنائی نہ تھی۔ ایمرسن اور دوسرے لوگ جمہوری زندگی کے سرچشمے تھے جو کبھی لیسیم کے پلیٹ فارم پر دکھائی دیتے اور کبھی پبلک لیکچر تھیٹروں میں سامنے آتے۔ یہ غیرالمعقول انسان تھے۔ یہ لوگ ذہنی لحاظ سے جس قدر بلند تھے ان کے سامعین اتنے ہی پست تھے۔ اسی لیے اس زمانے میں تعلیم بالغاں کا یہ کام خطابت کا انداز لیے ہوئے تھا۔ ایک شخص تقریر کرتا تھا اور سب خاموش سنتے تھے۔ اس طرح آہستہ آہستہ عوام میں ذہنی بیداری پیدا ہوتی گئی۔ ان کا معیار بلند ہوتا گیا۔ وہ اوپر اُٹھتے چلے گئے حتیٰ کہ ذہنی قد و قامت میں وہ اپنے مقررین کے کچھ کچھ قریب آ گئے۔ اب تعلیم بالغاں کا طریق بھی بدلنا پڑا۔ "فورم" ایک ایسا جلسہ ہوتا ہے جس میں مجمع کے ہر فرد کو تقریر کرنے کا حق ہے۔ اور اِس کو اظہارِ خیالات کا برابر موقع ملتا ہے۔ اختلافِ رائے کا بھی پورا پورا احترام کیا جاتا ہے۔ اِس طرح فورم کا انداز ایک ایسے ذہنی عمل کا سا ہو جاتا ہے، جس میں پورا مجمع سر جوڑ کر بیٹھتا ہے۔ اور کسی مسئلے پر باہم غور و فکر بحث و تمحیص کے بعد کسی خاص نتیجے پر پہنچتا ہے۔ اِس قسم کے جلسوں میں امریکی شہری کی سیاسی خدمات نے بڑا مفید کام کیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جو قوم اپنے سامنے جمہوری سماج کی تشکیل کا تخیل رکھتی ہے۔ اسے اپنے افراد کو اسی انداز میں تربیت دینا ہوگی۔ انھیں آپس میں تبادلۂ خیالات کے مواقع پیش کرنا ہوں گے۔ بعض کی رائے میں سیاسی تربیت تو ہنگامہ آرا، لیڈروں کا کام ہے جو اسٹیج پر کھڑے ہوتے ہیں اور سارے مجمع پر چھا جاتے ہیں۔ لیکن لیڈر آخر کار لیڈر ہی ہوتا ہے استاد نہیں ہوتا۔ دل و دماغ پر چھا سکتا ہے۔ لیکن ان کی تربیت نہیں کر سکتا۔ اُنکی حقیقی اور سچی تربیت تو مباحثوں کے گروہوں میں ہی ہو سکتی ہے۔ جہاں وہ دوسروں کی سننے کے ساتھ ساتھ

کچھ اپنی بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور اس کے کہنے سننے میں ان کے خیالات اور رائیں از حد نکھرتی چلی جاتی ہیں ہم دوسروں کی اترن پہننے سے کس قدر متنفر ہوتے ہیں۔ لیکن دوسروں کے خیالات کو لینے میں تامل نہیں کرتے۔ یہ خیالات ہم اکثر غیر شعوری طور پر اپنا لیتے ہیں اور اس خود اعتمادی سے اپناتے ہیں، گویا یہ ہمارے اپنے ہی خیالات ہیں جو ہم نے ذہنی کاوش کے بعد ڈھونڈ نکالے ہیں۔ ہمارے ذہنوں پر خود فریبی کا پردہ پڑا رہتا ہے۔ اور اکثر کبھی چاک نہیں ہوتا۔ آنکھ اور کان کے ذریعے ان خیالات کی تہ پر تہ اور ردّے پر ردّا چڑھتا چلا جاتا ہے اور ہمیں یہ کبھی خیال بھی نہیں گذرتا کہ اس عمارت میں کیا کیا اُڑ خانہ بھرا پڑا ہے۔ اگر ہم اس کباڑ خانہ کو ایک بحث مباحثے کی بھٹی میں جھونک دیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس میں کندن سا دمکتا ہوا سونا کتنا ہے۔ اور چھوٹے نگینے کتنے۔

سیویلین کنزرویشن کورز (CIVILIAN CONSERVATION CORRS)

امریکہ کی تعلیم بالغاں میں سب سے زیادہ نتیجہ خیز تجربے اس زمانہ میں ہوئے ہیں جسے ۱۹۳۳ء و ۱۹۳۰ء کی بدحالی کا دور کہا جاتا ہے۔ ان برسوں میں کل دنیا کو اقتصادی کساد بازاری نے آلیا تھا۔ اور امریکہ بھی اس کے برے اثرات سے نہ بچ سکا۔ لاکھوں نوجوان بے روزگار ہو کر رہ گئے۔ چناں چہ امریکی زندگی کے دو مشہور تجربے اسی بے روزگاری کے عالم میں شروع کیے گئے۔ ان میں سے پہلا تجربہ سیویلین کنزرویشن کورز کے کیمپوں کا تھا۔ شروع شروع میں تو یہ کیمپ محض بے روزگاروں کو کسی ایسے کام پر لگانے کے لیے بنائے گئے تھے جو قومی لحاظ سے مفید ہوں۔ یہ لوگ بعض بنجر علاقوں میں درخت لگاتے تھے۔ جہاں کہیں پانی کے بہاؤ سے زمین بھر جاتی تھی۔ اس زمین پر کام کرتے تھے۔ سڑکیں بناتے تھے۔ اتفاق سے ان کیمپوں کے ڈائرکٹر فوجی لوگ تھے۔ شروع میں تو کام امدادی طور پر چلایا گیا۔ تاکہ بے کار لوگ مشغول رہ سکیں اور تھوڑا بہت اپنی گذر اوقات کے لیے کما بھی سکیں۔ لیکن ان ڈائرکٹروں نے محسوس کیا اس کے ساتھ ساتھ بے کار نوجوان سماجی اور اقتصادی حالات کا جائزہ لے سکیں۔ اور ان رجحانات کا اندازہ لگا سکیں جو ان کی اور معاشرے کی زندگی پر برابر اثر انداز ہو رہے ہیں تو شاید وہ ان حالات کو بہتر بنانے میں زیادہ سوجھ بوجھ شوق اور ولولے سے کام کر سکیں۔ اس طریق سے یہ کیمپ ایک

کی بجائے تعلیمی اداروں میں تبدیل ہو گئے۔ اور تین ہزار کیمپوں میں کم و بیش تین لاکھ بے کار نوجوانوں کے لیے یہ جگہیں روٹی کا سہارا ہی نہ تھیں بلکہ ذہنی اور اخلاقی زندگی کا آسرا بھی بن گئیں۔ ان اداروں میں تعلیم کا مقصد نصابی مضامین کی تدریس نہیں۔ بلکہ نوجوانوں کو ایسے مواقع بہم پہنچانا ہے جس سے ان کی شخصیت پروان چڑھے۔ اور ان کے جسمانی ذہنی، اخلاقی اور معاشی پہلو پوری آب و تاب سے چمک اٹھیں لکھائی پڑھائی کے علاوہ ان میں اکثر خصوصی قسم کی ٹیکنیکل تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ مثلاً ہوائی جہازوں کا علم۔ بند اور پُل بنانا۔ موٹروں کی مرمت۔ فن جہاز رانی وغیرہ۔ ان کیمپوں کے ڈائرکٹر محض اسکولوں کے استاد نہیں ہوتے بلکہ نوجوانوں کے مشیر اور مربی ہوتے ہیں۔ ان کی امداد سے اکثر نوجوان اپنی زندگی کے گم شدہ جوہر دوبارہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ نئی نئی دلچسپیاں پیدا کر لیتے ہیں اور اس طریق سے اپنی شخصیت کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں

جنگ سے تباہ و برباد شدہ یورپین ممالک میں آج کل نوجوانوں کے کیمپ بے حد مقبول ہو رہے ہیں آج قومی زندگی کی تعمیر میں نوجوانوں کا بڑا حصہ ہے۔ بین الاقوامی سٹوڈنٹ سروس کی نگرانی میں مختلف قوموں کے نوجوان کسی ایک ملک میں پہنچتے ہیں۔ اور کسی خاص تعمیری کام کا ایک کیمپ بنا لیتے ہیں۔ دن! کام کرتے ہیں۔ شام کو وہیں استادوں سے پڑھتے ہیں۔ ملک کا تعمیری کام بھی کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے ذہن و دماغ کی تعمیر بھی کیے چلے جاتے ہیں۔ یوگو سلاویا میں نوجوانوں کے ایک ایسے ہی گروہ نے ڈیڑھ سو میل لمبی ریلوے لائن بنا دی جس کے لیے سات پُل اور چار سرنگیں بھی بنانا پڑیں۔ یوگو سلاویہ میں مسلمان بھی بستے ہیں۔ مسلمان لڑکے اور لڑکیوں نے بھی قومی تعمیر کے اس مقدس کام میں بڑے شوق اور ولولے سے کام کیا۔ بے پردہ ہو کر نہیں بلکہ باپردہ برقع پوش خواتین نے بھی اس کار خیر میں اپنے بھائیوں کے دوش بدوش حصہ لیا۔

ہمارے ملک کو بھی آج کچھ ایسے ہی نوجوانوں اور کچھ ایسی ہی تعلیم کی ضرورت ہے۔ یورپ کے ملک نازیوں کی بمباری سے تباہ ہوئے لیکن ہمارے ملک میں ڈیڑھ سو سال کی غلامی نے اس سے کم تباہی کے اثرات نہیں چھوڑے۔ ہمارے حالات کبھی تباہی کے لحاظ سے ان ممالک سے بہتر نہیں ہیں۔ ہمارے پاس بھی تو نوجوانوں کے لیے تعمیری کام کے مواقع کسی اور دیس سے کم نہیں۔ اگر کسی

تعلیمی پروگرام اور تعمیری کام میں یہ ربط پیدا کر سکیں تو یہ تعلیمی طریقوں اور نظم و نسق کی بڑی فتح ہو گی
ان کیمپوں کے علاوہ امریکہ میں ورکس پروگریس ایڈ منسٹریشن اپنا کام کر رہی ہے۔ یہ ادارہ بھی اسی
کساد بازاری کے دور کی پیداوار ہے۔ پہلے کیمپ تو معمولی تعلیم کے نوجوانوں کے لیے بنائے گئے تھے
لیکن اس ادارے کے ذریعہ ان لکھو کھا لوگوں کی امداد کی گئی جو کسی نہ کسی معزز پیشے سے تعلق رکھتے تھے
ان میں کچھ استاد تھے، بعض آرٹسٹ، موسیقی دان، ایکٹر اور سبھی قسم کے لوگ تھے۔ ان لوگوں کے لیے
لنگر خانے یا اپاہج خانے جاری کرنے کے بجائے حکومت نے ان کے لیے کام کے سامان پیدا
کیے۔ ہزاروں بے کار استادوں کو بالغوں کو مفت تعلیم دینے کے کام پر لگا دیا گیا۔ ایکٹر لوگ تماشے
دکھاتے تھے۔ موسیقی دان گا بجا کر لوگوں کا دل خوش کرتے۔ اس طرح تعلیم بالغان کے یہ مرکز
تعلیم کے گھروندے ہی نہ تھے بلکہ ایک دلچسپ اور رنگین سماجی زندگی کے مرکز بن گئے۔ امید
یہی کی جاتی تھی کہ اس ادارے کا کام اور بھی پھلے پھولے گا، اور اس کی امداد سے ہر شہر کا
نظام تعلیم آخر اس مقصد کو پا لے گا جو ہر تندرست اور توانا سماج کا مطمح نظر ہونا چاہیے۔ یعنی شام کے
وقت میں تعلیم جاری رکھنے کے لیے ایسی مفت جماعتیں کھول دی جائیں گی۔ جن میں سماج کا ہر فرد
کسی مضمون یا فن علم یا مشغلے میں تربیت حاصل کر سکے گا۔

کسانوں کی تعلیم و تربیت میں بھی بالغان کا کچھ حصہ ہے۔ فیڈرل گورنمنٹ کے محکمہ زراعت
نے زراعتی توسیع کا پروگرام چلایا ہے جس کا مقصد کسانوں کو ایسی معلومات بہم پہنچانا ہے جس سے
وہ زرعی پیداوار بڑھا سکیں اور اپنی زندگی کے اقتصادی اور کلچرل معیار کو بلند کر سکیں۔ تعلیم بالغان کا
یہ کام بے حد کامیاب رہا۔ لطف یہ کہ یہ کام ایک ایسے محکمے نے چلایا جس کا تعلیم سے براہ راست
کوئی واسطہ نہ تھا اور ایسے لوگوں کے ذریعہ چلایا گیا جنھیں تنخواہ یا معاوضہ لینے میں کوئی دلچسپی
نہ تھی۔ اس کام کے چلانے والے سب اعزازی طور پر کام کرتے تھے۔ ان میں استاد بھی تھے۔
زراعت کے اصول سکھانے والے لوگ بھی مباحثوں کے گروہوں کے لیڈر اور ان کی تنظیم کرنے والے
سبھی قسم کے رضاکار تھے۔ ان کی تعداد تین لاکھ کے لگ بھگ تھی۔

پاکستان میں کسانوں کے لیے تعلیم بالغان کے ادارے

امریکہ میں بالغوں کی زرعی تعلیم ہمارے طریقوں اور ہماری تکنیک سے بہت کچھ مختلف ہے۔ ہمارے دیہی علاقوں میں تعلیم بالغان کی داستان ایک المیہ ہے اور دیہی زندگی کے مختلف شعبوں پر اس کے نقوش نمایاں ہیں۔ اس سے محض لکھائی پڑھائی کے طریقے ہی ایک وبا کا شکار نہ ہوئے، بلکہ دیہی زندگی کے پورے ڈھانچے پر مصیبت چھا گئی۔ ہمارے دیہات سینکڑوں نہیں ہزاروں سالوں سے گاؤں کے انتظامی معاملات میں ایک حد تک آزاد اور خود مختار چلے آ رہے ہیں۔ برعظیم پاک و ہند کے فیصلے تو پانی پت کے میدان میں ہوتے رہے۔ لیکن دیہی نظام کا کارخانہ جوں کا توں چلتا رہا۔ دیہات کی پنچایتیں، دیہاتیوں کو حکومت کے دفاتر اور عدالتوں سے محفوظ رکھے رہیں۔ ان کی گھریلو صنعت حرفت پر باہر کے سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کا گہرا سایہ نہ پڑ سکا۔ لیکن انگریز کی آمد پر اس آزاد دیہی نظام پر ایک کاری ضرب پڑی۔ دیہی زندگی میں ذاتی کفالت کی عظمت مغربیت کے طوفان میں خس و خاشاک ہو کر بہ گئی۔ آج ہر دیہاتی ضروریات زندگی کے لیے شہر کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ اپنی تعلیمی و معاشی ضرورتوں کے لیے ضلع کے صدر مقام کا آسرا لیتا ہے۔ ضلع کے صدر دفتر سے ان پر احکام صادر ہوتے ہیں اور شہریوں کے ہاتھوں ان پر اصلاحات کی برکتیں نچھاور ہوتی رہتی ہیں۔ ان پر جو لوگ بھی حکومت کرتے ہیں وہ شہری ہوتے ہیں، اور اگر شہری نہیں تو شہری زندگی کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ شہر کی ہوا اور اس کی فضا پر ہر آن جان چھڑکنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ دیہاتی زندگی کی بیماریاں دیہاتی لوگوں کی پیدا کردہ نہیں بلکہ بڑی حد تک شہری لوگوں کی لائی ہوئی ہیں، اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس بیماری کے معالج اور اس ناسور کے جراح بھی یہی شہری ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ہمارے دیس کا آئندہ لیڈر نہ آکسفورڈ کا گریجوایٹ ہوگا نہ کیمبرج کا سند یافتہ۔ بلکہ شاید وہ مادر ارضی کا نونہال اور جامعہ ارضی کا تربیت یافتہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ سچی قیادت وہی شخص کر سکتا ہے جس کا دل دیہات کی سرسبز اور شاداب کھیتیاں دیکھ کر لہلہا اٹھتا ہے اور اسی شادابی کو اپ

بسنے والوں کے دلوں میں بھی دیکھنا چاہتا ہو ۔ ایسا ہمدرد شخص ان کے چہروں کو ہی نہیں دیکھتا بلکہ اُن کی روح کی داستان کو بھی ایسے ہی پڑھ سکتا ہے، جیسے کسی کھلی ہوئی کتاب کو۔ کسانوں کا وہ تما کسی لکھائی پڑھائی کی مہم پیش نظر نہیں رکھتا۔ ان تحریری کیڑے مکوڑوں نے تو اس میں نئی قوت بھی پیدا نہ کی کہ کسان ایک کپاس کے تنکے کی جگہ دو اُگا سکتا۔ اس پڑھائی اور وٹائی نے تو اس کے ذہن اور دماغ میں اتنا شعور بھی پیدا نہ کیا کہ وہ پچھلے سال آنے والی وبا کا سوجھ بوجھ کے ساتھ مقابلہ کرتا۔ یا اس کیڑے کا جو بار رسان کپاس کی فصل کو تباہ کر گیا تھا، کوئی مداوا کر سکتا۔

سچ تو یہ ہے کہ کسانوں میں تعلیم بالغاں کا کام بچوں کا کھیل نہیں۔ بچوں کو تو آپ کھلا بھی سکتے ہیں۔ پڑھا بھی سکتے ہیں۔ ڈنڈے کے زور سے انھیں آگے چلا بھی سکتے ہیں۔ کسی بالغ پر نہ آپ کا ڈنڈا چلے گا اور نہ بہلاوا۔ اور پھر ایک کسان کے مقابلے میں ڈنڈا چلانا تو کسی ہمت والے کا کام ہے۔ وہ صرف آپ کی دلیلوں سے مرعوب نہیں ہوگا۔ وہ آپ کے طریق تعلیم کی دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ تعلیم کی افادیت کے احساس دلانے سے متاثر ہوگا۔ اگر وہ محسوس کر لے کہ آپ کی تعلیم اس کے جسمانی یا روحانی لحاظ سے مطلب کی چیز ہے تو وہ یقیناً پڑھے گا۔ جہاں کہیں بھی تعلیم بالغاں کامیاب ہوئی ہے اسی جاذبیت کی بدولت ہوئی ہے یہ جاذبیت کبھی سیاسی، کبھی اقتصادی، کبھی معاشی اور کبھی مذہبی رنگ اختیار کر لیتی ہے لیکن علم برائے علم کی بے رنگی کبھی اختیار نہیں کرتی۔ یہ ضروری نہیں کہ تعلیم میں محض طلب منفعت کا پہلو ہی نمایاں ہو۔ کیوں کہ کسان آخر بنیا تو ہے نہیں۔ لیکن اس کے روحانی اور جسمانی تقاضے بھی تو ہیں۔ اس میں تخیل پسندی کا ملکہ بھی ہے۔ اس کی طبیعت بھی جدت طرازانہ اور جدت پسند ہے۔ وہ بھی اپنی روح کی تسکین چاہتا ہے۔ تعلیم اس کی زندگی میں اس کے لیے ثقافت کے نئے دریچے کھول دیتی ہے۔ ڈنمارک کے فوک سکول FOLK CHULE (عوامی سکول) کو لے لیجیے جہاں ڈنمارک کا کسان جاڑے کی لمبی شامیں بسر کرتا ہے۔ جب کہ وہ کھیتوں کے کام سے فارغ ہوتا ہے۔ یہاں وہ ڈنمارک کی قدیم رزمیہ داستانیں سنتا ہے۔ پرانی تاریخی کہانیوں سے

اپنا دل گرماتا ہے۔ ساتھیوں سے مل کر پرانے گیت گاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تالیف قلوب اور امداد باہمی کے گر بھی سیکھتا ہے۔ اقتصادیات اور معاشیات کے اصول اخذ کرتا ہے۔ ڈنمارک میں امداد باہمی کی تحریک سب سے پہلے انہی مدرسوں سے پیدا ہوئی۔ اور ایک خوش گوار روشنی بن کر پوری زندگی پر چھاگئی۔ آج کسانوں کے اس چھوٹے سے دیس میں امداد باہمی کی انجمنوں کا ایک جال سا بچھ گیا ہے۔ جسے دیکھ کر ایک دنیا سبق لیتی ہے۔

روس کے کوآپریٹیو فارم میں بھی تعلیم بالغاں کے کام میں یہی اصول جاری وساری ہے۔ پرانے ہل اور پھاوڑے کی جگہ ٹریکٹر اور مشینیں چل رہی ہیں۔ ان کے چلانے والے کون ہیں؟ یہی روسی کسان جو ایک نسل پہلے ایسے ہی اَن پڑھ اور جاہل تھے جیسے اکثر جگہوں کے کسان ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی زندگی میں انقلاب آگیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ایک بے پڑھے اور جاہل کسان سے تعلیم یافتہ اور مہذب لوگوں کے ہاتھ کی بنی ہوئی مشینیں نہیں چلیں گی اس نے بھی لکھنا پڑھنا سیکھا۔ ایک روسی کسان عورت پچیس سال تک دکان کے سامنے سے گذرتی رہی۔ اس کی نگاہ ہمیشہ اس تختے پر پڑتی تھی جس پر دکان کا نام لکھا ہوا تھا۔ اور یہ نگاہ ہمیشہ مایوس واپس لوٹ جاتی تھی کیونکہ وہ اس تختے کو پڑھ نہ سکتی تھی۔ آخر ایک مبارک صبح آئی اور اس نے پہلی نگاہ میں ہی تختے پر لکھے ہوئے ٹیڑھے میڑھے خطوط کا مفہوم سمجھ لیا آنکھوں کے دریچے سے ان معنی کا ذہن میں اترنا تھا کہ آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس زبان کا ایک جملہ پڑھ سکی جسے وہ بچپن سے بولتی چلی آرہی تھی۔

اکثر ملکوں میں کسانوں میں تعلیم بالغاں کا کام ایک ہنگامی مقصد کے پیش نظر شروع ہوا اور اس کے بعد ریاست اور رعایا دونوں کے تعاون سے جاری رہا۔ پچھلی جنگ میں انگلستان کو ایک بڑی آزمائش سے گذرنا پڑا تھا۔ یہ آزمائش نازیوں کی لڑائی نہ تھی۔ بلکہ فاقہ کی جنگ تھی انگلستان ہمیشہ کھانے پینے کی چیزوں کے لیے بیرونی ممالک کا محتاج رہا۔ لڑائی کے دنوں میں دشمن نے چاروں طرف سے گھیرا رکھا تھا۔ اب انگلینڈ کے لیے صرف دو ہی راستے تھے کہ

دل کے ہاتھوں نہیں تو پیٹ کے ہاتھوں ہار مان لے۔ یا پھر مردانہ وار مصائب کا مقابلہ کرے۔
انہی ایام میں نوجوان کسانوں کے کلب گھر کھولے گئے۔ یہ کلب گھر کسانوں کی بہترین تربیت گاہ
ثابت ہوئے۔ زرعی پیداوار میں دن دگنا اور رات چوگنا اضافہ ہوا کلب گھروں میں تربیت
پانے کا شوق جنگ کے بعد بھی جاری رہا۔

کسانوں کی تعلیم بالغاں کا کام جب پہلے پہل چین میں شروع کیا گیا تو اس کے رہنما ڈاکٹر
ین YEN نے لکھائی پڑھائی کا کوئی نیا طریقہ ایجاد نہیں کیا۔ اس نے پانی کا ایک نیا پمپ بنایا
آپ نے چینی کسان کی تصویر دیکھی ہوگی جس میں وہ اب سے چار ہزار سال پہلے کے پرانے
رہٹ پر چڑھا ہوا ڈولچیوں کو پاؤں کے سہارے چلا رہا ہے، جیسے کوئی ہندوستانی مداری کرتب
دکھا رہا ہو۔ ڈاکٹر ین کے نئے پمپ نے چینی کسانوں کو اس تماشہ گری سے نجات دلائی۔ کسان کی
بے حسی کا قفل ٹوٹا۔ اس کی زندگی نے کروٹ لی۔ وہ چار ہزار سال پرانے طریقوں کا قائل تھا۔ ڈاکٹر ین کا
حکمت نے آبپاشی کے پرانے طریق کو مات دیدی۔ کسان میں کھلنڈرے کی روح موجود تھی وہ ایک
میدان میں قائل ہوگیا تو اس کے بعد راستہ صاف تھا۔ چار ہزار سال کی پرانی جہالت کے پردے
چاک ہونے شروع ہو گئے۔ ڈاکٹر ین نے اس کام کے لیے ایسے طریقے استعمال کیے جنھیں
شاید ہمارے ہاں کا تعلیم بالغاں کا کام کرنے والا شایان شان نہ سمجھے گا۔ ہمارے ہاں تعلیم بالغاں
کے کام کرنے والے کتابیں لے کر گاؤں میں پہنچتے ہیں۔ لیکن یہاں کا کام کرنے والا کندھے پر ایک
جھولا لیے گاؤں کے چوپال میں پہنچتا ہے۔ اس کے جھولے میں مداریانہ قسم کی دل چسپ چیزیں ہوتی
ہیں۔ وہ ڈفلی نہیں ایک ڈھولک نکال کر بجاتا ہے۔ چھوٹے بڑے بڑھے جوان جمع کر لیتا ہے
لیجیے اس نے جھولے سے ایک چیز نکالی یہ تو انڈا ہے۔ بہت بڑا انڈا۔ گاؤں کی عام مرغی
کے انڈے سے ڈیوڑھا یا دگنا۔ یہ انڈا ڈاکٹر ین کے زراعتی فارم میں پالی ہوئی ایک مرغی نے
دیا ہے۔ یہ تعلیمی مداری دونوں قسم کے انڈے ایک ساتھ دکھا کر مجمع سے پوچھتا ہے کہ صاحب
کون سا انڈا بہتر ہے آپ کا یا ہمارا؟ کیا آپ ہمارے انڈوں کو لینا پسند کریں گے؟ اور لینا ہی

چاہیں گے یا دینا بھی پسند فرمائیں گے؟ ایک قہقہہ اٹھتا ہے اور ڈاکٹر ین کا تعلیمی مداری اپنا لکچر اِس موضوع پر شروع کرتا ہے کہ کسان لوگ کس طرح اپنے ہاں مرغیوں کی اچھی نسل کی افزائش کر سکتے ہیں۔

اگر ہم ایک جمہوری معاشرے کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کی بنیادوں کو مستحکم اور اس کے گنبد سربفلک دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کے شہریوں کو نہ صرف تعلیم میں بلکہ ہر سیدان میں مساوات کے حقوق دینا ہوں گے۔ تعلیمی زندگی میں حق مساوات پوری قومی زندگی کے لیے اساس کا حکم رکھتا ہے۔ ہر بچے اور جوان کا فطری حق ہے کہ اس کی تعلیم ان خداداد صلاحیتوں اور خوبیوں کے مطابق ہو جو مادرِ فطرت نے اسے عطا کی ہیں۔ اگر جمہوری ریاستیں اپنے شہری کو یہ حق نہیں دے سکتیں تو وہ اپنے جمہوری نظام کو بھی محفوظ نہیں رکھ سکتیں۔ پچھلی جنگ میں جمہوری نظام کو فاشیت سے ٹکر لینا پڑی تھی، اور اِس تصادم میں میدان اگرچہ جمہوریت کے ہاتھ رہا، لیکن اِس نے یہ نہیں دیکھا کہ اِس ٹکر میں اِس کے سنگین نظام میں بھی دراڑیں آگئی ہیں۔ اکثر جمہوری ریاستیں سمجھتی ہیں کہ یہ دراڑیں جنگِ عظیم کا نتیجہ ہیں۔ لیکن انھیں شاید یہ پتہ نہیں کہ یہ شگاف جنگ سے بہت پہلے آچکے تھے۔ اور اب ان کے سنگین معمار کی مرمت محض ان شگافوں کی لیپا پوتی سے ہی ممکن نہیں، بلکہ انھیں جمہوری نظام کی بنیادیں زندگی کے ایک نئے نقشے پر اٹھانا ہوں گی۔ اگر مستقبل میں یہ جمہوری نظام نئی بنیادوں پر قائم نہ ہوا تو جمہوریت کا پرانا ڈھانچہ نئے مستقبل کے طوفانوں کی تاب نہیں لا سکے گا ۔

ہمارے ثانوی مدارس
اور
تدریسِ معاشرتی علوم

مشتاق احمد و مختار احمد قریشی

یہ مسئلہ اپنی جگہ نہایت پریشان کن ہے کہ ثانوی مدارس میں بعض مضامین کی تدریس خاطر خواہ نہیں طلباء مضمون کے نام سے واقف تو ضرور ہوتے ہیں لیکن انھیں نفسِ مضمون سے چنداں واقفیت نہیں ہوتی۔ اس کی دو ہی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ یا تو اُس مضمون میں رہنمائی فرمانے والے استاد غیر تربیت یافتہ ہیں یا اُنھیں اس مضمون سے پوری دلچسپی نہیں۔ ان کی نظر میں مجوزہ نصاب ہی حرفِ آخر ہے اور اُس کا رٹ لینا کافی۔ ہمارے تربیتی ادارے کی تحقیق کے مطابق وہ طلبہ جو مختلف ثانوی مدارس میں آئندہ تعلیمی فرائض کی ادائے گی پر مامور ہوں گے، اُن میں ۸۰ فی صد ایسے ہیں جنھوں نے مضمونِ تاریخ صرف میٹرک تک پڑھا ہے۔ دیگر ۲۰ فیصد مضمون سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے۔ انھوں نے یہ مضمون صرف اس لیے لیا ہے کہ اُن کے نزدیک اس کی تدریس کتاب خوانی سے بھی ہو سکتی ہے۔ یہ وہ حالات ہیں جو ہمارے بنیادی قومی نظریات سے کلی تضاد رکھتے ہیں۔ ہماری ذاتی رائے ہے کہ اگر معاشرتی علوم کی تدریس مناسب طریقوں پر کی جائے تو بچہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ معاشرہ کی مختلف ضروریات کو پورا کرتے ہوئے اس کے اداروں میں توازن پیدا کر سکے۔ ہمارے نوزائیدہ ملک میں سوسائٹی کے بہت سے پہلو ایسے بھی ہیں جن میں ہم آہنگی نظر نہیں آتی۔ مثلاً ہمارا صنعتی نظام، محکمہ صحتِ عامہ اور بچوں کی بہبود کے منصوبے، دورِ حاضر کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں اور یہ اختلاف اُس وقت تک دُور نہیں ہو سکے گا جب تک تعلیمی منصوبوں اور زندگی کے مختلف پہلوؤں میں مطابقت پیدا نہیں ہوتی۔ معلمین بھی ذہنی انتشار کا شکار رہیں گے۔ جن کے اثر سے بچوں کا محفوظ رہنا دشوار ہے۔ ہمارے قومی تعلیمی کمیشن نے نہایت انقلاب آفرین تبدیلیوں کی سفارش کی ہے۔ لیکن

اہر ہے کہ تعمیری منصوبوں ہی کے ذریعے سے یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے۔ سابقہ دور میں جو آزمائشی
سکے ہماری توجہ کا مرکز بنے رہے ہیں ان سے کنارہ کشی بہتر ہے۔ کیونکہ ہمارے تقاضے اب آزمائشی
ام کی اجازت نہیں دیتے۔ بلکہ اُن کی جگہ تعمیری کام ہونا چاہیے۔ تاکہ قوم مجموعی طور پر ترقی کی راہ پر
گامزن ہو سکے۔ معلمین معاشرتی علوم پر اب یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے متعلمین میں جذبۂ حب الوطنی
ور قومی ثقافتی اقدار کو محفوظ کرنے کے لیے کوشاں ہوں۔

اس مقام پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ معاشرتی علوم سے کیا مراد ہے۔ کیونکہ مختلف افراد
س کی مختلف تشریح کرتے ہیں۔ درحقیقت ہمارے ملک میں ابھی تک معیاری الفاظ میں اس مضمون
ی حدود متعین نہیں کی گئیں۔ لیکن اب تک اس مضمون کی تدریس میں تاریخ و جغرافیہ کے ارتباط کے علاوہ
شہریت پر بھی زور دیا گیا ہے۔ تاکہ طلبہ ایک اچھے شہری بننے کے ساتھ ساتھ مقامی حکومت اور اس کے
قانونی اور انتظامی معاملات کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر سکیں۔

ہمارے ملک میں بہت سے تعلیمی ادارے ایسے بھی ہیں جو اس مضمون کی افادیت سے ابھی
تک واقف نہیں ہوئے۔ وہ معاشرتی علوم کی تدریس کو ایک کہانی کے معیار سے آگے نہیں بڑھنے
دیتے اور بالآخر بچوں کے ذہنوں میں صحیح نظریات کی تشکیل ہونے نہیں پاتی۔ اس مضمون کا مقصد تو یہ
ہے کہ بچہ دورِ حاضر کی سوسائٹی میں بستے ہوئے اپنی انفرادیت کو سمجھنے کی کوشش کرے اور یہ سمجھ جائے
کہ زمانۂ حال کس طرح ماضی کی تشریح کر رہا ہے اور قومی زندگی میں ثقافتی ورثہ کی حفاظت کیسے ہو رہی ہے
دراصل یہ مضمون اپنی وسعت میں تمام تاریخی۔ جغرافیائی اور معاشرتی حقائق پر حاوی ہے۔
اس کے علاوہ معاشرتی علوم کی تدریس بچوں میں دقتِ نظر اور صحیح قوتِ فکر پیدا کرنے میں بھی
معاون ہوتی ہے۔

یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ معاشرتی علوم کا مطالعہ دوسرے مضامین کو سمجھنے میں کافی مدد دیتا
ہے۔ یہ مضمون نوجوانوں میں منطقیانہ زاویۂ نظر کی بنیاد رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ ہر مسئلے کی وجوہ اور اُس کے
نتائج معلوم کرنے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ دراصل معاشرتی علوم کی تدریس انسان اور سوسائٹی کے مختلف

یوں کی روح سے روشناس کراتی ہے۔ اور ہم وہ ذریعہ استعمال کرتے ہیں جس سے حیات انسانی
مختلف ادوار اور مسائل کا پتہ چلے اور اُن کے حل تک رسائی ہو۔ اس تمام جد و جہد کا مقصد دورِ حاضر
بہتر بنانا ہے جس کو سمجھنے کے لیے عمدہ و پختہ عقل کی ضرورت ہے۔ معاشرتی علوم کی موثر تدریس کے ذریعے
م سابقہ دور کے انسان کی خامیوں پر روشنی ڈال کر مستقبل کے انسان کی خوبیاں ڈھونڈتے ہیں۔ اور
س کے ارتقائی منازل سے بھی بے خبر رہنا گوارا نہیں کرتے۔ اس طرح ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں، کہ
نسان نے اپنے ماحول پر کس طرح قابو پالیا اور موجودہ زندگی کے شعبوں کی باگ ڈور کن کن عناصر کے
اتھ میں رہی۔ انسان کی اپنے ماحول سے متواتر جنگ و جدل اور اس کا اپنے ذرائع کا غلط یا درست
ستعمال اور تہذیب و تمدن کے نشیب و فراز ایسے مسائل ہیں جو معاشرتی علوم کے مقبول ترین موضوع
ہیں۔

مدارس میں اس موضوع کے اجرا سے ہم اُس عادت کا بھی قلع قمع کر رہے ہیں جس نے طلبا کے
اندر ہر مضمون کے متعلق جداگانہ پیرائے پر سوچنے کی روش پیدا کر دی ہے۔ حالاں کہ ان تمام کا ارتباط
ایک ہی مضمون سے ہو سکتا ہے۔

تعلیم و تربیت کے نقطۂ نظر سے معاشرتی علوم کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اگر ہم اپنے نوجوانوں
میں خود اعتمادی پیدا کر کے انھیں قوم کے مفید شہری بنانے کے خواہشمند ہیں تو اس مضمون کی تدریس
بہت ضروری ہے۔ یہاں ایک بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ طلبا کی معلومات کتابوں تک محدود
کر دینا یا بالکل اُن کے مطابق ڈھال دینا بھی ان کو حقیقت سے دُور لے جانے کے مترادف ہوگا۔ اور پھر
یہ اُن کے ذہن نشین کر دینا اور بھی مہلک ہے کہ کتابوں میں جو لکھا ہے وہ درست اور مکمل ہے اس کا
ایک زبردست نقصان یہ پہنچتا ہے کہ بچہ اندھا دھند نظریات کو قبول کرنا شروع کر دیتا ہے۔ کسی
مضمون کی تدریس سے بچے کے ذہن میں یہ بات ڈالی جا سکتی ہے کہ علم ایک محدود چیز نہیں ہے
بلکہ تجربات و مشاہدات کی بنا پر اس میں کسی وقت بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ نظریہ بچہ میں تجسس
کا مادہ پیدا کر دے گا جو اُس کی ذاتی ذہانت میں اضافہ کر کے اُس کی ہر کوشش کو سوسائٹی کی بہبود کا

ذمہ دار بنائے گا۔

ہمارے ثانوی مدارس میں اس بات کا مکمل طور پر فقدان ہے کہ ہمارے طلبہ کو باہمی امدادی منصوبوں کی تربیت دی جائے۔ جب وہ سبق پڑھ رہے ہوتے ہیں تو اُن کی دلچسپیاں انفرادی مفاد پر مرکوز ہوتی ہیں۔ اور ایک دوسرے سے پر سبقت لے جانا چاہتے ہیں۔ صرف ایک موقعہ انھیں ضرور ملتا ہے جب وہ مل کر ایک مقصد کے حصول کے لیے باہمی طور پر کوشاں ہوتے ہیں۔ اور وہ کھیل کا میدان ہے جس کا آغاز سکول کے اوقات کے بعد ہوتا ہے۔ بالغ حضرات میں تو یہ نظریہ اور بھی گہرے طریقے سے پایا جاتا ہے۔ کیوں ان کا ہر کام کاروباری نظریات کے تحت تیتم پاتا ہے۔ اور وہ باہمی امدادی منصوبوں کو بالکل خاطر میں نہیں لاتے۔ لہٰذا اس امر کی ضرورت ہے کہ طلبا کو اجتماعی بہبود کے منصوبوں میں پڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی ترغیب دی جائے۔ کیوں کہ موجودہ زمانے میں سوسائٹی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ مجموعی مفاد و خوش حالی کو انفرادی مفاد و ترقی پر قربان کر دیا جائے۔ ان تمام مسائل کا بھی حل پیش کرتا ہے۔ جن کے باعث معاشرہ میں مطلوبہ ترقی کے لیے راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ باہمی امدادی منصوبوں کی کامیابی کے لیے یہ مضمون مفید معلومات اور مواقع بہم پہنچاتا ہے۔

معاشرتی علوم کی اہمیت کو مزید واضح کرتے ہوئے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ کوئی تعلیمی ادارہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں اُس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جاتا جب تک یہ بین الاقوامی مسائل کے متعلق اپنے طلبا میں معیاری سمجھ بوجھ پیدا نہ کر دے۔ موجودہ دنیا سمٹ کر ایک دوسرے کے قریب ہوتی جا رہی ہے۔ اور انسانیت کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ قومی تنگ نظری کا خاتمہ کر دیا جائے۔ موجودہ تہذیب جتنی دلکش اور دل فریب نظر آتی ہے اس سے کہیں زیادہ مہلک جراثیم کو یہ اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے جو اس کی سالمیت و دلکشی کو کسی وقت بھی ختم کر کے اسے زمانہ وحشت کی طرف لوٹا سکتے ہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ طلبا کو قومی تنگ نظری کے چنگل سے نکال کر عالمگیر اخوت کا حامل بنایا جائے پس معاشرتی علوم کی تدریس اس مقصد کے حصول کے لیے بھی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ معلم بذات خود ان مقاصد سے اچھی طرح واقف ہو۔

بین الاقوامیت کا نظریہ ہر ذی عقل انسان کی نگاہ میں جچتا ہے۔ لیکن اس کی پرورش اس وقت تک ناممکن ہے، جب تک کہ قومیت اور وطنیت کے بھوت کو اعتدال کی حد پار نہ کرنے دی جائے۔ مختلف قوموں کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جب انھوں نے جائز و ناجائز مطالبہ کو جذبۂ قومیت و وطنیت کی ترازو میں تولا تو اس کا نتیجہ جنگ کی صورت میں رونما ہوا۔ اور عالمگیر برادری و اخوت کا نعرہ ماتمی صورت میں بلند ہوا۔ اب معاشرتی علوم کے معلمین کے فرائض میں یہ بات شامل ہے کہ وہ طلبہ میں اتنی استعداد پیدا کر دیں کہ وہ غلط و صحیح میں تمیز کر سکیں اور وقت آنے پر انفرادی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح دے سکیں۔ وہ بنی نوع انسان کی راحت کا سامان کریں جو یقیناً خلوص نیت ہی کے ذریعے ممکن ہے۔

تعلیمی دُنیا پر ایک نظر

برطانیہ میں تعلیم بالغاں (ڈیوڈ ہارڈمین)

ہر زمانہ میں ماہرین تعلیم کو افراد کی ذہنی تعلیم سے دلچسپی رہی ہے۔ سترھویں صدی کے انگلستان میں آلیور کرامویل نے اپنی جماعت آئرن سائڈ کو باخبر اور ذہنی طور سے منظم افراد کا مجموعہ قرار دیا تھا۔ اٹھارھویں صدی کے آخر تک مذہبی اداروں اور مخیر صنعت کاروں نے ایسی ہی جماعتیں کیں جو انگلستان کے تمام لوگوں اور مزدوروں کے لیے تعلیم کا انتظام کرتی تھیں۔

سنہ ۱۸۵۰ء میں مستریوں کی تعلیم کے لیے انگلستان میں تقریباً چھ سو ادارے تھے جن کا مقصد نہ صرف انھیں لکھنا پڑھنا سکھانا تھا بلکہ انھیں آزادانہ بحث مباحثے کرنا (جن کی حدیں متعین تھیں) نیز آرٹ اور ادب سے متعارف کرانا تھا۔ یہ ادارے قائم تو بڑے جوش و خروش سے ہوگئے اور ان کا مقصد بھی خدمت خلق کے علاوہ کچھ نہ تھا لیکن چونکہ مذہب اور سیاست پر بحث میں بہت سی پابندیاں تھیں اس لیے ان کی مقبولیت زیادہ نہ ہوسکی۔ اس صدی کے بعض تجربات جن کی بنا پر کرسچن سوشلزم پر تھی، البتہ نتیجہ خیز ثابت ہوئے۔ مثال کے طور پر لندن میں کاریگروں اور ملازمت پیشہ لوگوں کے کالج میں سردیوں میں ذرا بھی جگہ نہیں رہتی۔ یہاں اعزازی استادوں کی سرکردگی میں خوب آزادانہ بحثیں ہوتی رہیں۔ کالج کے انتظام میں طلباء کی شرکت لازمی ہوتی ہے۔ برطانیہ کے دوسرے بڑے شہروں میں بھی اسی قسم کے چھوٹے چھوٹے ادارے قائم ہیں۔

یونیورسٹیوں کی شرکت: برطانیہ میں موجودہ طرز کی تعلیم بالغاں کیمبرج میں سنہ ۱۸۷۳ء میں شروع ہوئی۔ اس وقت کے بادشاہ جیمس اسٹورٹ کا نظریہ یہ تھا کہ ایک گشتی یونیورسٹی

قائم کی جائے۔ اس طرح یونیورسٹی ایکسٹنشن کورسوں کی ابتدا ہوئی جن کا انتظام مختلف بورڈوں کے ذمہ تھا۔ یہی بورڈ دراصل تعلیم بالغاں کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے۔ ان بورڈوں کے فرائض میں اضافہ ہوتا رہا۔ اب ان کا دائرہ عمل بہت وسیع ہو گیا ہے۔

۱۹۰۳ء میں موسم گرما کے ایک جلسہ میں مزدوروں کی تعلیمی انجمن کا قیام عمل میں آیا جس سے اس تحریک کو اور تقویت ہوئی۔ پانچ سال کے بعد امداد باہمی کی انجمنوں، ٹریڈ یونینوں اور مختلف کلبوں کے تعاون سے اس رضاکارانہ ادارہ نے ٹیوٹوریل کلاسوں کی ابتدا کی۔ ان کلاسوں سے حصول تعلیم کی خواہش میں اور اضافہ ہوا۔ مزدوروں کی تعلیمی انجمن کی ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۵۰ء–۱۹۵۴ء میں چار سال کی مدت کی ۵۰ ٹیوٹوریل کلاسیں منعقد کی گئیں جن ۷۴۰۱۱ طلبہ نے شرکت کی۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ سینما ریڈیو اور ٹیلی وژن کے زمانہ میں بھی جب لوگوں کے پاس فالتو وقت نہیں بچتا ٹیوٹوریل کلاسوں کی مقبولیت باقی رہی۔

سب سے بڑا رضاکارا دارہ

برطانیہ میں تعلیم بالغاں کے میدان میں مزدوروں کی تعلیمی انجمن سب سے بڑا رضاکار ادارہ ہے۔ اس کے بہت سے علاقائی دفتر ہیں۔ پچاس سال سے انجمن کا اپنا جریدہ "ہائی وے" شائع ہو رہا ہے۔ اس جریدہ نے مختلف موضوعات پر کورسوں کی تنظیم کی ہے۔ ۱۹۵۰ء میں وزارت تعلیم نے انجمن کی خدمات کے پیش نظر اس کے مرکزی دفتر واقع لندن کے لیے دو ہزار پونڈ کا ایک عطیہ منظور کیا۔ انجمن کی مختلف کلاسوں کے ممبروں کی تعداد تقریباً ۸۵ ہزار ہے یہ اس کے بیشتر اخراجات برداشت کرتے ہیں۔ مقامی تعلیمی ادارے یونیورسٹیاں اور ٹرسٹ بھی اس کی مالی امداد کرتے ہیں۔ مقامی تعلیمی ادارے، یونیورسٹیاں اور ٹرسٹ بھی اس کی مالی امداد کرتے ہیں۔ ۱۹۱۹ء سے سرکیسل کے تعلیمی ٹرسٹ کی طرف سے انجمن کو سالانہ عطیات دیئے جاتے ہیں۔

برطانیہ میں یونیورسٹیاں اپنے حدود سے باہر بھی تعلیم کا انتظام کرتی ہیں۔ ان کورسوں کی

ایک سال سے تین سال تک ہوتی ہے۔ شام کے کچھ کورس اس سے کم مدت کے بھی ہوتے ہیں۔ انگلستان اور ویلز میں ان کورسوں پر جو کچھ خرچ ہوتا ہے اس کا ۵۰ فیصدی حصہ وزارت تعلیم اور مقامی ادارے برداشت کرتے ہیں۔

مرکزی تحقیقاتی ادارہ

۱۹۵۸ء میں انگلستان اور ویلز میں بیس لاکھ افراد نے شام کی کلاسوں میں شرکت کی۔ تعلیم بالغان کی قومی انسٹی ٹیوٹ میں مختلف علاقائی اداروں کے آپس کے مشوروں اطلاعات اور تحقیقات کے لیے ایک مرکز بھی قائم کیا گیا ہے۔ اس مرکز کو وزارت تعلیم کی طرف سے مدد ملتی ہے

اس تحریک کا بنیادی اصول یہ ہے کہ معاشیات، تاریخ، سیاست اور سماجی اور مذہبی امور کی تعلیم بالغوں کو مفت ملنی چاہیے اس پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہونی چاہیے۔ اس کا انتظام ایسے تعلیمی اور مذہبی اداروں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے جنھوں نے آزادانہ ماحول میں طویل مدت تک اس قسم کے کاموں کا تجربہ حاصل کیا ہے۔

مزدوروں کی تعلیمی انجمن کی سالانہ رپورٹ کی رو سے ۱۸ فیصد طلبا نے آرٹس کے مضامین پڑھے، ۵۰ء ۱۷ فیصد نے تاریخ اور ۷ء ۱۴ فیصد نے سوشل سائنس کے مضامین پڑھے۔ ادبیات میں ۶ء ۱۳ فیصد طلبا نے شرکت کی، وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے رضاکار تعلیمی اداروں کی سالانہ رپورٹوں میں بھی اسی قسم کے اوسط اعداد و شمار ملتے ہیں۔

یونیورسٹیوں اور بڑھتی ہوئی تعلیمی سہولتوں کی وجہ سے تعلیم بالغاں کے لیے ماہرین اور اساتذہ کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ اسی لیے کورسوں میں تنوع کی گنجائش پیدا ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی وزارت تعلیم کا کوئی انسپکٹر بھی آکر تعلیم بالغاں کے اداروں کا معائنہ کرتا ہے۔ تاکہ تعلیمی معیار پر کڑی نظر رکھی جا سکے۔ بیشتر ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسپکٹر نے خود بالغوں کو کسی نہ کسی وقت پڑھایا ہوتا ہے۔

مضامین کا تنوع

برطانیہ میں کوئی شخص بھی اگر اپنے علم اور معلومات میں اضافہ کرنا چاہتا ہے تو وہ بہت سے مضامین
میں سے اپنی پسند کا مضمون چن سکتا ہے۔ میں خود شیکسپیئر اور انگریزی شاعری کا بڑا شائق ہوں۔ میرے
ایک دوست ہیں جو سردیوں میں فلسفہ، سائنس اور مذہب جیسے مضامین کا کورس پڑھاتے ہیں۔
گذشتہ ڈیڑھ سو برس میں برطانیہ میں تعلیم بالغاں کی تحریک بہت کافی زور پکڑ چکی ہے
اور اس نے قومی زندگی پر بہت گہرا اثر مرتب کیا ہے۔ اب برطانیہ میں اچھی کتابیں پہلے سے زیادہ
پڑھی جاتی ہیں۔ آرٹ گیلریاں، موسیقی کی مجالس، تھیٹر، غرضیکہ ہر جگہ لوگ زیادہ تعداد میں نظر
آتے ہیں۔ اس سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ ہر جگہ جہاں تعلیم بالغاں نے فروغ حاصل کیا ہے
وہاں ایک باخبر اور باشعور طبقہ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ جو قومی زندگی میں بہتر شعور اور وسعت
نظری کا مالک ہے۔

جو لوگ ہمارے طرز زندگی کے قائل ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ یہ باشعور اقلیت ایک قیمتی سرمایہ ہے
اور مذہبی اور سرکاری اداروں اور سیاسی حلقوں میں ایک نئے انقلابی عنصر کے اضافہ کے مترادف
ہے۔ اس کی وجہ سے لوگوں نے رضاکار اداروں میں شرکت کی تڑپ محسوس کی ہے۔ یونیورسٹی
ایکسٹینشن کے یہ پچاس سال متعدد دیگر یونیورسٹیوں کے قیام کا باعث ہوتے ہیں۔ تعلیم بالغاں سے
فارغ التحصیل افراد نے، جنہوں نے زندگی کے اوائل ہی میں شاید اسکول کو خیرباد کہہ دیا تھا۔
برطانوی جمہوری نظام اور اداروں میں نئے خیالات کا اضافہ کیا ہے اور انھیں تقویت پہنچائی
ہے۔ بقول وزارت تعلیم کے سابق سیکرٹری سر جان ماؤڈ کے کہ "اپنے کام کی صحیح اہمیت کا احساس، فالتو
وقت کا صحیح اور مفید استعمال اور ملک اور دنیا کے شہری کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کا
احساس۔ یہ ہیں وہ ضروریات جنھیں تعلیم بالغاں کے ذریعہ پورا کرنا چاہیے"۔

۱۰ شماره ۱۲ ، ۱۳ — مارچ ، اپریل

اس شمارہ میں

آموزش

لاہور

مارچ، اپریل ۱۹۶۲ء

جلد ــــــــ ۱۴

شمارہ ــــــــ ۱۲ و ۱۳

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ باسٹھ پیسے

پبلشر

یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۴۱۹، انارکلی لاہور سے شائع کیا

اداریہ

مدّتِ عمر نثارِ سرِ یارے کردم ٭ شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

یہ شعر ہماری قومی تعلیم کے شہرہ آفاق علمبردار سرسیّد احمد خاں کے اُس جذبۂ خدمت کی یاد دلاتا ہے جو انھوں نے تعلیمی میدان میں والہانہ طور پر انجام دی تھی۔ درحقیقت کسی محبوب مقصد کے لیے زندگی وقف کر دینا انسانی منصوبہ بندی کا نقطۂ کمال ہے۔ لیکن اس میں ہمتِ مردانہ اور جراءت رندانہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ حکیمِ اُمت علّامہ اقبال اِس رمز سے واقف تھے۔ چنانچہ وہ آخر دم تک ہمت و جراءت کی ترغیب و تشویق میں مصروف رہے اور سخت کوشی کی تلقین میں عمر گذار دی۔ دراصل زندگی کے کسی شعبے میں بھی نصب العین کا حصول ولولۂ شوق اور انہماک کے بغیر ممکن نہیں۔ کامیابی اپنی جلوہ گری کے لیے محنت و مشقت کی دست نگر ہے۔ اور تمام معجز نمائی خونِ جگر کی رہینِ منت۔ بقولِ علامہ اقبال ؎

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

پھر تعلیم کی مہم جو خاکدانِ عالم کو نورِ علم سے معمور کرنے کے مترادف ہے۔ اپنی منزلت پیشِ نظر کچھ زیادہ ہی ایثار چاہتی ہے۔ چناں چہ رہنمایانِ ملک و ملت وقتاً فوقتاً اس فرد کی جانب توجہ دلاتے رہتے ہیں۔ اس مارچ کی ۲۵ تاریخ کو ڈاکٹر جہاں گیر خاں ڈائرکٹر سررشتہ مغربی پاکستان نے سنٹرل ٹریننگ کالج کے جلسۂ تقسیم اسناد میں، اسی نکتہ پر زور دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ معلم کے وقار کا دارومدار اِس بات پر ہے کہ وہ اپنے آپ کو پوری طرح معلم کہلا

وقف کر دے۔ پیشۂ معلمی کو صرف یہی روش معاشرے میں دوبارہ عزت و احترام کا مقام دلا سکا ہے۔ اپنے پیشے سے فداکارانہ ربط، اور طلبہ کو بہترین مواقع بہم پہنچانے کی سعی، معلّم کے صحیح اعزاز کا باعث ہوگی۔ صاحب موصوف نے تعلیمی کمیشن کی انقلاب آفریں سفارشات کے حوالے سے یاد دلایا کہ کافی نہیں کہ ہمارے معلمین صرف عالمانہ اسناد حاصل کرلیں، وہ اسناد ضرور حاصل کریں۔ لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ درکار ہے۔ انھیں چاہیے کہ پیشے کا اعلیٰ ادراک، قوم کی خدمت کا شعور، تعمیری کام میں اعانت کرنے کا جذبہ، درآمد ہونے والے آلات و امانت کا انتظار کیے بغیر موجودہ مواد و حالات میں اصل حقائق کی فراہمی کا عزم، اور اپنے پیشے سے متعلق معیارِ اخلاق و اعزاز کا احساس پیدا کریں"۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ "محض معلومات عطا کرنے کا عمل نہیں بلکہ اندازِ فکر دل پر نقش کرنے کا ایک کام ہے جس کی بدولت بچے کی پوری شخصیت کا ظہور ممکن ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں معلم عملی نمونہ پیش کرکے اپنے شاگردوں میں اسلامی کردار اور جمہوری اصولِ حیات کی روح بیدار کر سکتا ہے۔

ڈائرکٹر تعلیمات مغربی پاکستان کے اس خطبے سے پہلے اے جی بٹ پرنسپل سنٹرل ٹریننگ کالج نے بطورِ خاص متعلقین اساتذہ کے گوش گذار کیا تھا کہ پاکستانیوں کی نوخیز نسل میں خداداد لیاقت و ذہانت کے جوہر کثرت سے موجود ہیں۔ پاکستانی بچے بلحاظِ استعداد اُن تمام صفات سے متصف ہوتے ہیں جو روئے زمین پر کسی بچے میں پائی جا سکتی ہیں۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ اُن کی تمام مضمر قوتوں کو جو قدرت نے انھیں ودیعت فرمائی ہیں، منظرِ عام پر لانے میں ان کی مدد کریں۔

یہ حقیقت ہے کہ تعلیمی میدانوں میں ہمیں اپنے بچوں کی استعداد سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے ✤ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی البتہ تعلیمی مہم کو تیز تر کرنے کے لیے معلم کو وقت کی پکار پر کان دھرنے اور اپنے علم کو تازہ رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ ؎

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حُدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی (عرفی)

✤

کامیاب ہیڈ ماسٹر

محمد جمال اللہ

مدارس ابتدائی ہوں یا وسطانی، ثانوی ہوں یا فوقانی، ان سب کی رونق، ان سب کی کامیابی و کامرانی ترقی و شہرت، مقبولیت و عزت اور ہر قسم کا اعزاز و افتخار، اساتذہ کے حسنِ صلاحیت کا ممنون احسان اور ان کے کمال استعداد کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ اور اساتذہ سے خوش اسلوبی سے کام لینا، ان میں اتفاق و اتحاد قائم رکھنا۔ مدرسے کے لیے ان کے وجود کو مفید اور گرامی قدر بنانا، اور فرائض کے ادا کرنے مدرسے کے سود و زیاں کا احساس رکھنے، طلبہ کے تعلیمی و تدریسی تقاضوں کا احترام کرنے کا انہیں عادی و خوگر بنانا، ہیڈ ماسٹر کی دلنوازی کا اعجاز اور اس کے کمالِ انسان فہمی کا کرشمہ ہے۔ پس کسی سکول کا حسنِ انتظام، اس کے اساتذہ کا مابین خوشگوار اتحاد، طلبہ کے اخلاق و کردار کا معیار، نتائج امتحانات کا امتیازی اعزاز، ہیڈ ماسٹر کی قائدانہ صلاحیتوں اور انتظامی اہلیتوں کا آئینہ دار ہے۔ یوں سمجھیے کہ ایک کامیاب ہیڈ ماسٹر اپنی خداداد صلاحیتوں کو اپنے معاون اساتذہ میں، اسکول کے چھوٹے اور بڑے طلبہ میں اور مدرسے کے عام ملازمین میں حتیٰ کہ مدرسے کی پوری فضا میں اس خوبی سے سمو دیتا ہے کہ ایک نگاہِ ژرف بیں مدرسے کے گوشے گوشے میں، اسکول کے کونے کونے میں ہیڈ ماسٹر کے کمالاتِ معنوی کے نقوش اور اس کی زیرکی و فطانت کے نشانات دیکھ لیتی ہے۔ ؎

ہے رگ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو

اور ؎ چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

یہ بات بالکل واضح اور یہ امر بالکل بدیہی ہے کہ کامیاب ہیڈ ماسٹر وہ ہے جس کا اسکول ہر پہلو سے کامیاب ہے۔ اور جس کا ادارہ ہر لحاظ سے قابلِ تعریف و مستحقِ ستائش ہے۔ چوں کہ پوری

کامیابی کسی جزوی کامیابی کا نام نہیں، بلکہ مختلف النوع امور میں بہمہ وجوہ کامیاب ہونے سے عبارت ہے۔ بنا بریں کامیاب ہیڈ ماسٹر بھی کسی ایک ہی صلاحیت کا مالک نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا وجود گرامی کئی متعدد صلاحیتوں کا مجموعہ اور کئی صفات و کمالات کا مرکز ہوتا ہے۔ اس مختصر مضمون میں کامیاب ہیڈ ماسٹر کے صرف چار پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یوں سمجھیے کہ اس کی کامیابی کی جہات اربعہ کی نشان دہی کی گئی ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ مرد خود بین و خدا بین انہی صفات اربعہ سے متصف ہے۔ نہیں نہیں بلکہ یہ بندۂ مولا صفات، مجمع البرکات و منبع حسنات ہے۔

جہت اوّل کامیاب ہیڈ ماسٹر بحیثیت تنظیم

انتظام کی صورتیں دو ہوتی ہیں۔ ایک آمرانہ یا استبدادی نظام، دوسرے جمہوری نظام۔ آمرانہ نظام وہ نظام ہے جس میں ہیڈ ماسٹر محض احکام صادر کرنے والی ایک شخصیت اور رعب و داب سے کام لینے والی ایک ہستی نظر آتا ہے۔ ایسا ہیڈ ماسٹر اپنے آپ کو ہمہ دان و ہمہ فہم تصوّر کرتا ہے۔ وہ دوسرے اساتذہ کو درخور اعتنا نہیں سمجھتا۔ ان کے صلاح مشوروں اور ان کی راؤں کو وقعت نہیں دیتا، بلکہ ہمیشہ اپنی مرضی کرتا ہے۔ اپنی حاکمیت کو ہر وقت قائم رکھتا ہے۔ الگ تھلگ بیٹھتا ہے، اور ضرورت سے زیادہ تیوری چڑھائے رکھتا ہے۔ اس کے چہرے پر بشاشت کم اور یبوست زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی پیشانی خندہ جبینی سے اکثر محروم اور شکنوں سے بالعموم آلودہ رہتی ہے۔ ایسے ہیڈ ماسٹر کے احکام و فرامین کی تعمیل ہوتی تو ہے لیکن یہ جبراً ہوتی ہے اس لیے اس تعمیل میں جان نہیں ہوتی۔ یہ نظام جسم تو رکھتا ہے لیکن اس میں زندہ روح کی تر و تازگی مفقود ہوتی ہے۔ یہ نظام اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے، اس کی بنیادیں ہوا پر استوار ہوتی ہیں۔ اس نظام میں اساتذہ ہیڈ ماسٹر سے بددل ہو جاتے ہیں۔ اور حقیقی معنوں میں تعاون نہیں کرتے۔

دوسرا نظام جمہوری نظام کہلاتا ہے۔ اس میں ہیڈ ماسٹر اپنے رفقائے کار کے مشوروں کو اور ان کی راؤں کو ٹھکرا نہیں دیتا، قبول کرتا ہے۔ اور ان میں سے قابل عمل راؤں کو پسند کرتا ہے۔ معاون اساتذہ سے ہیڈ ماسٹر کا رویہ خوش گوار ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس مشینری کا ایک پرزہ سمجھتا ہے، وہ محض آمر نہیں ہوتا، بلکہ فعّال بھی ہوتا ہے، وہ اساتذہ کی جدت پسندی کی حوصلہ افزائی

ہے۔ ان کی ساعی کی داد دیتا ہے۔ ان کی کارکردگی کو سراہتا ہے۔ ان کے حسن عمل پر احسنت کہتا ہے۔ ان کے
یہ سے فائدہ اٹھاتا ہے، اور ان کو کام کرنے کے مواقع بہم پہنچاتا ہے اور وہ ہر مدرس کو آمادگی اور
ت سے مشترکہ کام کو کامیاب بنانے پر ابھارتا ہے اور مدد کرتا ہے۔ ہیڈ ماسٹر کی انتظامی صلاحیتوں
ن انواع پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) مدرسے کے تعلیمی امور اور غیر تعلیمی تحریکات کا ہوشمندی سے تجزیہ کرنا۔

(۲) اس کام کو اساتذہ کے درمیان ان کی صلاحیتوں کے اعتبار سے مساویانہ طور پر منصفانہ انداز سے
م کرنا۔

(۳) مفوضہ امور کی دانشمندی سے دیکھ بھال کرنا، یعنی اس بات کا جائزہ لینا کہ تفویض کردہ کام صحیح
ت پر پوری صحت مندی سے تکمیل پذیر ہو چکا ہے یا نہیں؟

آئیے ان تینوں باتوں پر ٹھنڈے دل سے سوچ بچار کریں۔

۱) کامیاب ہیڈ ماسٹر اپنے اسکول کو بااحسن طریق چلانے کے لیے نظام ہائے مختلفہ کو خاص ترتیب دے
لیتا ہے اور صرف ایسے کام زیر عمل رکھتا ہے جو ضروری ہیں، غیر ضروری اور زائد کام بڑھا لینا
آئین دانشمندی کے خلاف ہے، اس سے اساتذہ بھی بے زار ہو جاتے ہیں، طلبہ بھی بد دل ہو کر دلچسپی
لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ اور کام کو ایک بیگار سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

عام طور پر مدارس میں مذکورہ ذیل قسم کے انتظامات رائج ہوتے ہیں :۔

۱) درسی کام۔ تمام جماعتوں میں مضامین کے لیے مقررہ وقت کی تقسیم یعنی ہر مضمون کے لیے ہفتہ میں جتنا
وقت محکمہ نے تعین کیا ہے اس کی مناسب ترتیب و تعین اور موزوں تقسیم۔

۲) ہر قسم کے رجسٹروں کا انتظام

(۳) ساجی فعالیتوں کا اہتمام۔ اس میں ذیل کے مشاغل شامل کیے جا سکتے ہیں۔ صبح و شام کی مختلف
کھیلیں مثلاً نٹ بال۔ والی بال، ہاکی، کرکٹ اور کبڈی وغیرہ، ادبی محافل۔ بزم ہائے ادب
امرے۔ مباحثے۔ مکالمے، ڈرامے اور اسکول میگزین وغیرہ تحریکات۔ انجمن ہلال احمر، اسکاؤٹنگ

فرسٹ ایڈ۔ ٹورنامنٹ۔ تعلیمی سیاحت اور تفریحی مشغلے وغیرہ

تقاریب یوم اقبال۔ یوم استقلال۔ عید میلاد النبیؐ اور یوم والدین وغیرہ

(۱۷) دارالاقامہ کا انتظام۔ اس میں طعام و قیام کا اہتمام، صفائی اور روشنی کا انتظام۔ اوقات نمـ

تعین اور احترام۔ کتب خانہ اور دارالمطالعہ کے ذریعے تعلیمی ماحول کا قیام اور بیمار طلبہ کے لیے عا

معالجہ کا اہتمام شامل ہے۔

(۱۸) داخلی امتحانات کا انتظام، امتحانی پرچے مرتب کرنے کے لیے اساتذہ کا انتخاب۔ پرچوں کے مـ

جائزہ۔ پرچوں کی کتابت و طباعت کا خفیہ اور رازدارانہ انتظام۔ امتحان گاہ میں نشستوں معدنا

کا تعین۔ جوابات کی کاپیوں کی صحیح اور معیاری جانچ اور تکمیل نتیجہ وغیرہ۔

کامیاب ہیڈ ماسٹر تقاضائے حالات اور ضروریاتِ وقت کے مطابق نئی نئی مفید اسکیمیں ؛

اور نئے پلان مرتب کرتا اور مفید اور قابل عمل پروگرام مرتب کر لیتا ہے۔ اور اپنے معاونین اور رفقا ر

وائے اور اتفاق سے ایسے پروگراموں کو نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دے لیتا ہے۔

(۱۹) کامیاب ہیڈ ماسٹر کی مردم شناسی کا تقاضہ ہے کہ وہ ہر استاد کو کام تفویض کرتے وقت اسـ

اور کام کا تقابل کر کے دیکھ لے کہ آیا یہ استاد اس کام کو ۔ خوش اسلوبی سے سرانجام دے لے گا۔

ذاتی استعداد سے یہ کام بڑھ کر تو نہیں؟ اسی طرح یہ کام استاد کی شخصیت اور اہلیت سے کم تر بھی نہ ہونا چا

اس سے وہ اپنی سبکی اور ہتک محسوس کرے گا۔ اور اس کی تکمیل میں اسے اپنی کسرِ شان نظر آئے گی۔

لیکن بعض اساتذہ جو بہت سی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں ہیڈ ماسٹر صاحبان ان پر ا

فرائض مسلط کر دیتے ہیں کہ وہ بیچارے اپنی روشنی طبع کے ہاتھوں ہمیشہ ابتلاء میں مبتلا رہتے ہیں او

تو آموز یا کم استعداد یا دیدہ و دانستہ انجان استاد جو بار فرائض کے اٹھانے سے احتراز اور ذمہ دار

کام سنبھالنے سے گریز کرتے ہیں۔ مزے کرتے گپیں ہانکتے اور محفل آرائیوں میں لگے رہتے ہیں۔ ا

تقسیم نہایت غیر منصفانہ ہوتی ہے۔ کام کرنے والے اساتذہ بددل ہو جاتے ہیں اور بے کار اور فارغ ا

کے فارغ اوقات میں غیر تعلیمی اور تخریبی ریشہ دوانیاں اپنا مسکن بنا لیتی ہیں جس کا نتیجہ بالخیر ہونا مشکل

کامیاب ہیڈماسٹر وہ ہے جو اپنے انتظام میں تقسیم کار کے وقت منصفانہ رویہ ملحوظ رکھے۔ اور ہر
کو اس کے مزاج، فنی صلاحیت، تجربہ، علمی لیاقت اور شخصیت کے مطابق کام تفویض کرے۔ یعنی بلبل کو جلا
بردا نے کو نالہ تقسیم کرے۔

(۳) انتظامی صلاحیت کا تیسرا پہلو مفوضہ امور کی دیکھ بھال ہے۔ قابل اور سمجھ دار ہیڈماسٹر اساتذہ
اتذہ میں تفویض کردہ کام کی پڑتال ضرور کرتا ہے۔ اگر کام کا احتساب نہ کیا جائے تو کام کرنے والے غافل
بے پروا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ہر عائد کردہ فرض کا محاسبہ کرنا ہیڈماسٹر کا فرض عین ہے۔ لیکن یہ جائزہ اور
سبہ بہت دانشمندانہ احتیاط کا متقاضی ہے۔ زیرک اور سمجھدار ہیڈماسٹر اساتذہ کے کام پر نکتہ چینی کرتے
نہ بہت محتاط رہتے ہیں۔ اور ان کے کام کی پڑتال کرتے وقت ذلت آمیز تنقید کرنے سے گریز و احتراز
تے ہیں۔ کیوں کہ ہر آدمی اپنے آپ کو ایک خاص وقار کا مالک اور احترام کا اہل سمجھتا ہے۔ اور جب اس
و ضرب لگتے ہوئے دیکھتا ہے تو غضبناک ہو کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اس لیے ایسے نازک مواقع
جذبات کے برانگیختہ ہو جانے کا خدشہ اور بات کا بتنگڑ بن جانے کا احتمال ہو۔ قابل ہیڈماسٹر محتاط
تے ہیں۔ بالخصوص طلبہ کے سامنے اساتذہ کا محاسبہ اور کسی خامی پر اُن سے باز پرس نہایت خطرناک
ات اور نہایت افسوسناک نتائج پیدا کر سکتی ہے ؎

اس گلستان میں نہیں حد سے گذرنا اچھا

ت ثانی، بحیثیت لیڈر یا قائد

صحیح اجتماعی شعور اور رفاقت باہمی سے کام کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے صحیح قیادت کی
ت لابدی ہے۔ مدرسے کے ماحول میں ہر طالب علم اور ہر استاد کے دل میں کام کرنے کا صحیح جذبہ
بننے کی پوری تڑپ اور مصروف عمل رہنے کی سچی لگن پیدا کرنا ایک بالغ نظر قیادت ہی کے طفیل ہو سکتا
، اور یہ قیادت اسکول کے ہیڈماسٹر ہی کے شایان شان ہے۔

جس طرح کسی ملک و ملت کا قائد، اپنے منصب کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے، اور افراد کا ہمدرد
رخوا ہو کر انھیں اپنا ہم خیال اور ہمنوا بناتا ہے۔ اور پھر اپنے عزم پر کوہ گراں کی طرح ثابت قدم

ہو جاتا ہے اور موانعات کا مقابلہ کر کے، مخالفتوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنے عمل پر قائم رہتا ہے۔

بقول شاعر
ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

اسی طرح کامیاب ہیڈ ماسٹر بھی اپنے تعلیمی ادارے میں لیڈر اور قائد کی حیثیت رکھتا ہے ہیڈ ماسٹر کی قیادت جبھی مثالی اور قابل تعریف ہوگی کہ وہ غیر معمولی قابلیت اور بلند پایہ صفات کا حامل ہو تاکہ وہ تعلیمی معاملات میں اساتذہ کی رہنمائی کر سکے، اور ان کو تدریسی مشکلات کے حل کرنے میں مدد دے سکے۔ اس کے قلب و نگاہ میں وسعت ہونی چاہیئے کہ اپنے رفقائے کار کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں اور معمولی کوتاہیوں کو نظر انداز کر سکے۔ قائد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی قوم کے افراد میں ایک نئی روح پھونک دیتا ہے، اِس لیے ہیڈ ماسٹر کے دل میں بھی ولولہ اور اپنے کام کے لیے سچی محبت موجود ہو۔ اسے اپنے مقصد کی افادیت اور صداقت پر یقین کامل ہو۔ اور جب یہ خوبیاں اس میں موجود ہوں گی تو وہ اپنے معاون اساتذہ اور زیرِ تعلیم طلبہ کے دلوں میں زندگی کی ایک نئی روح پھونک دے گا کام کرنے کی لگن اور فرائض کو سرانجام دینے کا شوق پیدا کر دے گا۔

صحیح قیادت یہ ہے کہ ہیڈ ماسٹر اساتذہ کو یہ محسوس نہ ہونے دے کہ وہ جرائم کا سراغ لگانے والا ایک افسر، اور دوسروں کے عیوب کا استقامت تلاش کرنے والا ایک نقاد ہے۔ اِس کا کام صرف خامیوں کی جستجو اور اِس کا فرض صرف کوتاہیوں کی تلاش ہے۔ بلکہ اِس کا فرض یہ ہے کہ وہ ان کی دقتوں کو محسوس کرے، اور ان کی مشکلات کا خیال رکھے۔ جہاں تک اِس کے تعاون و امداد کی ضرورت ہے، شفقت و ملائمت کے ساتھ ان سے تعاون و ہمدردی کرے۔ فرض شناس، مستعد، جدت طرازانہ اور کارکن اساتذہ کی تعریف کرے۔ ان کی ترقی کے لیے کوشاں رہے۔ ایک استاد کی خامی دوسروں پر ظاہر کر کے اِس کی تشہیر نہ کرے۔ کسی کو ہدف ملامت نہ بنائے اور تحقیر و تذلیل سے کلی طور پر محترز رہے۔ غلطی پر اصلاح ہمدردانہ اور مشفقانہ کرے۔ تاکہ اِس کی قیادت تخلیقی اور تعمیری ہو۔ استاد کی غلطی کا اعلانیہ اظہار اِس کی تحقیر ہے۔ اس سے احتراز واجب ہے ورنہ خرابی کا احتمال ہے۔ جب ہیڈ ماسٹر نظام میں بے قاعدگی یا ڈھیل دیکھے، تو

خاموشی زبانشعار ہے۔ خرابیوں اور برائیوں کو دیکھ کر سکوت بھی اختیار نہ کرے۔ ایسے موقعوں پر چشم پوشی معائب کی اجازت کے مترادف تصور کی جاتی ہے۔ ہر خرابی کا شروع ہی میں تدارک کرے، کیوں کہ اس سے تغافل شعاری خرابیوں میں اضافے کا باعث ہوتی ہے۔

سرِ چشمہ شاید گرفتن بہ میل
چو پر شد نشاید گزشتن بہ پیل

اتحاد باہمی

اساتذہ اپنی طبائع اور ماحول کی تربیت کے اعتبار سے مختلف المزاج اور مختلف الخیال ہوتے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر کی سچی قیادت کا تقاضا ہے کہ وہ ان میں ایسا ربط پیدا کرے کہ وہ ایک متحدہ گروہ اور ایک ہی کنبہ کے افراد بن جائیں۔ اس طرح تمام اساتذہ کی مخصوص صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

جہت ثالث بحیثیت نگران

اگرچہ کامیاب ہیڈ ماسٹر کی انتظامی صلاحیتوں کے ضمن میں اس کی نگرانی اور دیکھ بھال کا ذکر بھی اشارۃً آ چکا ہے۔ لیکن یہاں ذرا تفصیل سے اس کی صراحت کی جاتی ہے۔

یہ امر مسلّمہ ہے کہ کسی اسکول کا کامیاب ہیڈ ماسٹر اساتذہ کے کام کی نگرانی سے نہیں بچ سکتا۔ کیوں کہ یہ اس کا نہایت ضروری فریضہ ہے۔ اور نگرانی چھوڑ دینے سے اسکول کا سارا کام تعطل میں پڑ جاتا ہے۔ نگرانی سے مراد ان مفوضات کا جائزہ اور احتساب ہے جو اساتذہ کو مختلف فعالیتوں کے سلسلے میں تفویض کی گئی۔ ان تفویضات میں مندرجہ ذیل امور شامل ہیں۔

(i) جماعتوں کا تدریسی کام
(ii) مختلف رجسٹروں کا کام
(iii) سماجی فعالیتوں کا انصرام
(iv) دار الاقامہ اور اس کا انتظام

ان چار شقوں کی نگرانی ہیڈ ماسٹر کا اہم فریضہ ہے۔ کامیاب ہیڈ ماسٹر نگرانی کے سلسلہ میں حد سے تجاوز نہیں کرتا۔ وہ اِس باب میں خیر الامور اوسطہا کا فرمان پیش نظر رکھتا ہے۔ کیوں کہ نگرانی اگر ضرورت سے زیادہ کی جائے تو اساتذہ کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہو جاتے ہیں اور ہیڈ ماسٹر کے متعلق اِن کے دلوں میں تکدر و تنفر پیدا ہو جاتا ہے۔ نیز اساتذہ کے کام پر نکتہ چینی کرنے کی بجائے مشفقانہ رہنمائی کرتا ہے۔ طلبہ کے سامنے استاد کے کام پر بحث نہیں کرتا، اور استاد کی عدم موجودگی میں بھی اس کے کام پر تنقیدی خیال آرائی نہیں کرتا۔ کیوں کہ اس بات کا امکان ہے کہ اس قسم کے ارتکاب سے ہیڈ ماسٹر اور معاونین کے درمیان بدگمانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

(۱) جماعتوں کے درسی کام کی ہلکی سی دیکھ بھال تو یہ ہے کہ ہیڈ ماسٹر اطاق ہائے تدریس کے سامنے سے نگاہ ڈالتا ہوا گذر جائے اور سرسری نظر دیکھ لے کہ اساتذہ و تلامذہ معروفِ درس و تدریس ہیں، لیکن صرف اتنی نگرانی کافی نہیں۔ زیرک اور باہم ہیڈ ماسٹر اساتذہ کے عملِ تدریس کا جائزہ لینے کے لیے ایک چکر کے لیے صرف ایک تدریسی قدم مخصوص کر لیتے ہیں اور صرف اسی کا جائزہ لیتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ مثلاً سبق کے دلآویز آغاز اور تعلیمی توضیحات کا جائزہ ایک دفعہ لے لیا۔ دوسری نگرانی میں استفسار کا طریق اور سوالات کرنے کا انداز ملاحظہ کر لیا۔ نگرانی میں جو چیز فنی طور پر قابلِ اصلاح ہو۔ قابل ہیڈ ماسٹر اس کا اظہار استادِ متعلقہ پر مناسب پیرائے میں کرتا ہے کہ اسے خفت محسوس نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کا نیک دل ہیڈ ماسٹر اس کی بھلائی اور بہتری کے لیے سود مند پند و نصائح کر رہا ہے۔ اِس موقع پر وہ استادِ متعلقہ کے محاسنِ تدریس بیان کر کے اِس کو داد و تحسین بھی دیتا ہے۔ اِس کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے اس سے استادِ مذکور کے دل میں ہیڈ ماسٹر کا احترام بڑھ جاتا ہے اور وہ اسے اپنا حقیقی ہمدرد اور اپنا بہی خواہ تصور کرتا ہے۔ اور یہ احساس درس گاہ کے لیے نہایت مفید ہوتا ہے۔ کامیاب ہیڈ ماسٹر نگرانی کا ریکارڈ بھی رکھتا ہے تاکہ پتہ لگ سکے کہ جو اصلاح کی گئی ہے اس پر عمل ہو رہا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں طلبہ کی ادب و انشا اور نقشہ کشی کی کاپیوں، اور دیگر تحریری کام کا جائزہ بھی لیا جا سکتا ہے لیکن اس کے لیے ایک منظم پروگرام بنا لیا جائے کامیاب ہیڈ ماسٹر تمام جماعتوں کا تحریری کام ملاحظہ کرنے کے لیے۔

ہفتے کا ایک ٹائم ٹیبل مرتب کر لیتا ہے۔ اور تمام جماعتوں کو پہلے اطلاع ہوتی ہے کہ ان کی پڑتال کس روز کی جائے گی۔ اس دن وہ کاپیاں اپنے پاس رکھتے ہیں اور مکمل کر کے لے آتے ہیں۔ اس طرح اساتذہ، ہیڈ ماسٹر اور طلبہ سب پریشانی سے بچ جاتے ہیں اور نگرانی سلیقے سے ہوتی ہے۔

(۲) رجسٹروں کے کام کی نگرانی۔ کامیاب ہیڈ ماسٹر بالعموم اپنے مدرسے میں اس قسم کا لائحہ عمل بناتا ہے کہ ہر مہینے کی آخری تاریخ کو دن کے آخری حصے میں طلبہ کو چھٹی دے دی جاتی ہے۔ تمام اساتذہ اپنے رجسٹرات کی تکمیل کرتے ہیں۔ پڑتال ہوتی ہے اور ہیڈ ماسٹر رجسٹروں پر تصدیقی دستخط ثبت کرتا ہے۔

سمجھدار اور تجربہ کار ہیڈ ماسٹر حاضری اور داخل خارج کے رجسٹروں کی خانہ پری کے لیے اساتذہ کو صحیح طریق کار پر چلاتے ہیں۔ یعنی حاضری درج کرتے وقت کوئی خانہ خالی نہ چھوڑا جائے۔ کسی غیر حاضر کو حاضر نہ لکھا جائے۔ خارج ہونے والے طالب علم کو حاضری اور داخل خارج رجسٹر سے بیک وقت خارج کیا جائے۔ اس کے علاوہ سکول کے سرکاری سامان کے رجسٹرات نہایت اہم ہیں۔ ان کی دیکھ بھال نہایت ضروری ہے۔ تجربہ کار ہیڈ ماسٹر کسی بل پر ادائی رقم کا حکم نہیں لکھتے، جب تک وہ یہ دیکھ کر اطمینان نہیں کر لیتے کہ سامان رجسٹر مذکور میں اپنی مقررہ جگہ پر درج ہو گیا ہے یا نہیں؟ اس احتیاط سے رجسٹروں کی بہت سی غلطیاں از خود دور ہو جاتی ہیں۔ اور آڈٹ کے موقع پر پریشانی نہیں اٹھانا پڑتی۔

(۳) سماجی فعالیتوں کی نگرانی۔ مدرسے میں کئی تحریکیں جاری ہوتی ہیں۔ مثلاً صبح و شام کے جسمانی کھیل کامیاب ہیڈ ماسٹر کبھی کبھی کھیل کے میدان میں خود پہنچ کر کھیلوں کی نگرانی کرتا ہے۔ متعلقہ استادوں کے شوق اور طالب علموں کی حاضری کو بھی ملاحظہ کرتا ہے۔ کھیلوں کے انتظام میں اصلاح کی ضرورت ہو یا طلبہ کے کچھ مطالبات یا شکایات ہوں، ان سب امور کی طرف توجہ دیتا ہے۔

اسی طرح دوسری فعالیتوں مثلاً اسکاؤٹنگ، فرسٹ ایڈ، ٹورنامنٹ اور دیگر تقاریب کے اہتمامات کی پوری نگرانی کرتا ہے۔ کیوں کہ اگر فعالیتوں کی پوری پوری دیکھ بھال نہ کی جائے تو یہ صرف ایک ڈھونگ اور محض ایک دکھاوے کے رہ جاتی ہیں۔

(۴) دارالاقامہ کی نگرانی اتنی ضروری ہے کہ کامیاب ہیڈ ماسٹر اس سے کبھی بھی پہلو تہی نہیں کرتا۔ طلبہ کی

رہائش اور خوراک کے انتظام کی اصلاح کی طرف وہ خاص توجہ دیتا ہے۔ ان کی تکالیف کا تدارک کرتا ہے اور انہیں تمام ممکن سہولتیں مہیا کرتا ہے۔ ان اقامت گاہوں میں طلبہ کے اخلاق کی کڑی نگرانی ہونی چاہیے اور ان کی حاضری کی طرف دارالاقامہ کے نگران کی خاص نظر ہونی چاہیے۔ کیونکہ بعض طلبہ دارالاقامہ سے غیر حاضر رہ کر بہت سی مذموم عادات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کامیاب ہیڈ ماسٹر اس معاملے میں قطعاً کوئی رو رعایت نہیں کرتا۔ اور دارالاقامہ کے قواعد و ضوابط میں قطعاً لچک نہیں پیدا ہونے دیتا۔

جہت رابع

کامیاب ہیڈ ماسٹر کی چوتھی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے مدرسے کی مختلف تحریکوں، تقریبوں، اور سرگرمیوں میں ربط پیدا کرتا ہے۔

دوران سال کئی ایسے مواقع پیش آتے ہیں کہ مدرسہ اور اہل مدرسہ کو کئی تقاریب سرانجام دینا پڑتی ہیں، جلسوں کا انعقاد کرنا۔ کھیلوں کے ٹورنامنٹ اور ان میں کامیاب کھلاڑیوں کے لیے تقسیم انعامات طلبہ کے سرپرستوں اور والدین کے اجتماعات، ان میں طلبہ کی تعلیمی ترقیاں ان کے والدین کو ملاحظہ کرانا تاکہ انھیں معلوم ہو کہ ان کے بچے اسکول کے اندر تعلیم و تربیت اور جسمانی نشوونما میں متوازی ترقی اور افزائش حاصل کر رہے ہیں۔

ان کے علاوہ ادبی مجالس اور بحث مباحثے اور تقریری مقابلے طلبہ کے دلوں میں جذبات رشک و مسابقت پیدا کرنے میں بہت ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ان مقابلوں میں حصہ لینے والے آئندہ اپنی عملی زندگی میں بھی کامیاب ہوتے ہیں۔ ان مقابلوں سے ذاتی اعتماد، مقابلے کے لیے جد و جہد، تاثر انگیزی، زور خطابت اور کئی دوسرے محاسن طالب علموں میں پیدا ہو جاتے ہیں، اور یہ خوبیاں ان کی مابعد التعلیم زندگی پر بہت اثر انداز ہوتی ہیں۔

کامیاب ہیڈ ماسٹر ان تمام قسم کی فعالیتوں کو تعلیمی رنگ دے لیتا ہے، اور ان تمام تقاریب کو مدرسے کی افادیت کا کامیاب ذریعہ بنا لیتا ہے۔ ان تمام تحاریک و تقاریب سے اسکول کی شہرت کو چار چاند لگ جاتے ہیں، اور اس کی اچھی شہرت دور دور تک پہنچ جاتی ہے۔

لیکن یہ تقاریب ہیڈ ماسٹر کی قابلیت سے مناسب اوقات پر انعقاد پذیر ہونی چاہئیں۔ ان کے لیے تمام قسم کے پروگرام پہلے طے کر لیے جائیں۔ ان کے انعقاد سے اسکول پر مالی بوجھ، قوت برداشت سے زیادہ نہ ہو۔ بلکہ ان کے ذریعے اگر مالی منفعت کی کوئی صورت پیدا ہو جائے تو انسب ہے۔

قابل ہیڈ ماسٹر ان تمام فعالیتوں کا خواہ وہ کھیلوں سے متعلق ہوں یا دیگر اجتماعات سے باہمی ارتباط ضرور قائم کر لیتا ہے وہ غیر متعلق سی معلوم نہیں ہوتیں۔ مدرسے کے ساتھ ان کا اس قسم کا سلسلہ وابستہ کر لیتا ہے۔ وہ اسکول کے پروگرام کا ایک جزو و لاینفک بن جاتی ہیں۔ طلبہ و اساتذہ کو نیز عامۃ الناس کو وہ اسکول سے غیر متعلق اور اس سے ماورا معلوم نہیں ہوتیں۔ ان کا باہمی ربط بھی ہوتا ہے۔ اور اسکول سے بھی گہرا رشتہ ہوتا ہے۔

غرض قابل ہیڈ ماسٹر کا کام اسکول کے مفاد اور اس کی شہرت اور ترقی کے لیے مفید اسکیمیں سوچنا ان کے لیے لائحہ عمل مرتب کرنا، اور ان کے متعلق نشیب و فراز سوچ کر ان کو کامیابی سے پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے۔ اس لیے کامیاب ہیڈ ماسٹر وہ ہے جو بیدار مغز ہے۔ ہمہ وقت معروف کار رہے اور مختلف النوع صلاحیتوں کا مالک ہے۔ وہ خود بھی فعال ہے اور اپنی روشن دماغی سے اپنے تمام معاونین کو دیانت دار فعال بنا لینے کی پوری اہلیت رکھتا ہے ۞

فن تدریس

نذیر احمد

ہر شخص کچھ غیر معمولی طور پر کامیاب استادوں کے نام گنا سکے گا۔ اگر اسے ان لوگوں کی کامیابی کے راز پر انگلی رکھنے کو کہا جائے تو غالباً ان سب میں مشکل ہی سے بہت سی چیزیں مشترک نظر آئیں گی کسی میں کوئی خوبی نمایاں ہوگی اور کسی میں کوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تدریس ایک فن ہے اور ہر فن کی طرح اس میں فن کار کی یگانہ تخلیقی صلاحیتوں کو بڑا دخل ہے۔

کیا تدریس ایک فن ہے ؟

اس موضوع پر مزید بحث کرنے سے پہلے لفظ فن کا مفہوم صاف ہو جانا چاہیے۔ اگر مختلف لغاتوں میں اس لفظ کے معانی ڈھونڈے جائیں تو ان میں کافی فرق نظر آئے گا۔ تاہم ان سب میں ایک بات مشترک دکھائی دے گی۔ وہ یہ کہ فن کا تعلق کسی نہ کسی طرح ان سوچی سمجھی انسانی سرگرمیوں سے ہے جن کا مقصد بعض ایسے عوامل کا راستہ بدلنا یا راستہ بند کرنا ہو جو انسانی دخل اندازی کے بغیر مختلف سمت اختیار کرتے۔ مثلاً گانا ایک مشہور فن ہے۔ اس فن کو سیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ آلات صوت کو کافی مشق کے بعد ایک مخصوص سانچے میں ڈھالا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے اور آلات صوت کو ان کی طبعی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو ایسا شخص گویا نہ بن سکے گا۔ یہی حال دوسرے فنون کا ہے۔ خوش نویسی ایک فن ہے جس شخص نے قلم و قرطاس کو ایک مخصوص طریقے پر استعمال کرنے کی لمبی مشق نہ کی ہو وہ خوش نویس نہیں بن سکتا۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ ایک شخص معمولی سی رہنمائی اور مشق سے اس فن میں مہارت پیدا کر لیتا ہے اور دوسرے کو اس پر قابو پانے کے لیے لگاتار رہنمائی اور لمبی مشق کی ضرورت پڑتی ہے پس فن کی نہائی ماہیت کا سب سے اہم جزو یہ ہے کہ انسان پوری سوجھ بوجھ کے ساتھ بعض واقعات کا

طرح جان بوجھ کر بدل دے۔ اس معنی میں تدریس یقیناً ایک فن ہے۔ دراصل یہ ایک وسیع تر فن
یعنی تعلیم کی ایک شاخ ہے۔ تعلیم کی بہترین تعریف غالباً یہ ہے کہ ان موثرات وعوامل پر سوجھی بوجھی
گرفت کا نام ہے۔ جن کا مقصد انسانوں کی نشو و نما میں ترمیم کرنا ہو۔ جہاں کہیں اور جب کبھی انسانوں کے
خیالات، جذبات اور افعال کو متاثر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو وہاں یقیناً کسی نہ کسی قسم کی تعلیم
جاری ہے۔

تعلیم کے مختلف ذرائع

تعلیم کے اس مفہوم کو پیش نظر رکھا جائے تو معاشرہ میں کئی ادارے اور جماعتیں اسی کام
میں مشغول نظر آئیں گی۔ مسجد کے منبر سے جو وعظ کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد انسانوں کے خیالات، جذبات
اور بالآخر ان کے افعال میں تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ اخبارات اور رسالے اپنا پورا زور قلم اسی بات پر
صرف کر دیتے ہیں۔ ریڈیو کی نشریات کی ساری غرض و غایت یہی ہوتی ہے۔ سینما کا پردہ سیمیں بھی اسی مقصد
کے لیے وقف ہے۔ اور تو اور ہر اشتہار دینے والا اور ہر وہ شخص جو اپنی اشیا یا اپنی خدمات کے
خریدار پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اپنا سارا زور طبع اس بات پر صرف کر دیتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح زیادہ سے
زیادہ لوگوں کی پسند پر اثر انداز ہو سکے۔ تعلیم کی جو تعریف اوپر دی گئی ہے اس کے مطابق یہ تمام لوگ
تعلیم کے ہمہ گیر کام میں لگے ہیں۔ بالکل ان ہی کی طرح مدرسہ بھی اپنی ہمت کے مطابق اس خدمت کو
انجام دیتا ہے۔

مدرسے کی ذمہ داری

یہاں یہ بجا طور پر پوچھا جا سکتا ہے کہ جو کام اتنے ہاتھوں میں بٹا ہوا ہو، اس کی ذمہ داری مدرسہ پر
کسی حد تک ڈالی جا سکتی ہے۔ زیادہ صاف لفظوں میں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ جب تعلیم کا
کام بعض ایسے افراد اور جماعتوں کے ہاتھوں میں بھی ہے، جن کے سامنے اپنے ذاتی نفع کے سوا اور کوئی
اونچا مقصد نہیں تو مدرسہ اکیلا اونچے مقصدوں کے لیے مؤثر کام کس طرح کر سکتا ہے۔ جہاں سینما
ریڈیو فلمی رسالے۔ گھٹیا قسم کے افسانے ناول اور اشتہار بازوں کی ایک پوری فوج دن رات

لوگوں کو گھٹیا قسم کی ترغیبیں دینے میں معروف ہو وہاں مدرسہ بلند اقدار کے لیے کیا کر سکتا ہے۔ یہ بجا ہے کہ مدرسے کے علاوہ بعض اور ادارے مثلاً مسجد۔ مذہبی ادارے۔ سیاسی اور علمی انجمنیں اور اسی طرح کی بعض اور جماعتیں بھی مدرسے کی طرح پسندیدہ مقاصد کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ لیکن ان سب میں بھی پورا اشتراک عمل ممکن نہیں کم از کم ان کے طریقہ ہائے کار میں بڑا فرق ہے۔

یہ تمام سوالات اپنی اپنی جگہ بالکل درست ہیں۔ مدرسہ تعلیم کے متعدد ذرائع میں سے صرف ایک ذریعہ ہے۔ عوامی ذہن میں اسے تعلیمی فرض کے ساتھ خاص طور پر اس لیے مخصوص کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ نئی پود کی تعلیم کا کافی کام اس کے ذمہ سپرد کیا گیا ہے۔ لیکن تعلیم کے متذکرہ صدر دوسرے ذرائع کی تاثیر سے کسی کو انکار نہیں۔ ان میں سے بعض کی کشش کئی حالتوں میں مدرسے کی کوششوں پر پانی پھیر دیتی ہے۔ تاہم اس قدر ضرور ہے کہ موجودہ دور میں کوئی مہذب ملک اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی فرد یا جماعت کھلم کھلا ناپسندیدہ اقدار کو اچھالے۔ مختلف تعلیمی قوتوں کے مقاصد اور طریقہ ہائے کار میں خواہ کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو وہ سب کم از کم زبانی طور پر یہ دعویٰ ضرور کریں گی کہ وہ پسندیدہ اقدار کی اشاعت کر رہی ہیں۔ یہ پسندیدہ اقدار معاشرے کے فلسفہ حیات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اس فلسفہ کی حیثیت ثقافتی بنیاد کی ہوتی ہے اور ریاست کی تہذیبی قوت قوم کی طرف سے اس کی محافظ و نگراں مقرر کی گئی ہوتی ہے۔ مغربی ممالک میں یہ بنیادی فلسفہ جمہوری اقدار کے نام سے موسوم ہے۔ تاہم یہ خیال نہ کر لینا چاہیے کہ تمام مغربی ملکوں میں ایک ہی قسم کی جمہوری اقدار رائج ہیں۔ برطانوی جمہوریت اپنے خدوخال میں امریکی جمہوریت سے الگ ہے اور روسی جمہوریت بالکل ایک علیحدہ چھاپ کی جمہوریت ہے ہم پاکستان میں اسلامی جمہوریت کو رواج دینے کے دعویدار ہیں۔ غرض تعلیم کی نہائی اغراض کا فیصلہ کسی قوم کی ثقافتی زندگی کی بنیادیں کرتی ہیں۔ مدرسہ ان ثقافتی بنیادوں کو قائم و برقرار رکھنے والے متعدد خادموں میں سے ایک خادم ہے اور بس۔ تاہم ان سب میں اس کا مقام ایک جداگانہ خصوصیت رکھتا ہے۔ وہ دوسروں کے لیے نمونہ اور مثال قائم کرتا ہے۔ دوسروں کو زود یا بدیر اس کے قدم کے ساتھ قدم ملانا پڑتا ہے۔ خود غرض و نفع پرست افراد اور جماعتیں وقتی طور پر

اس سے مخالف سمت میں قدم اٹھا سکتی ہیں۔ وہ اس کے خلاف مستقل محاذ قائم نہیں کر سکتیں۔ مدرسہ جو تعلیمی قدم اٹھاتا ہے۔ وہ پورے خلوص اور علم الیقین کے ساتھ اٹھاتا ہے۔ دوسری قوتیں بر ملا اسکی مخالفت نہیں کر سکتیں۔ اور اگر مدرسہ رائے عامہ کی تربیت سے غافل نہ رہے تو ان کی درپردہ مخاصمت بھی بہت دیر تک نبھ نہیں سکتی۔

اس ضمن میں ایک مثال کا تذکرہ افادیت سے خالی نہ ہوگا۔ راقم کو ریاست ہائے متحدہ کے مدرسوں اور کالجوں کو کچھ عرصہ تک دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ ایک ماہ تک ایک یونیورسٹی کے پروفیسر کے ساتھ رہا۔ یہ پروفیسر ہفتہ میں دو بار رات کے وقت کوئی پچیس تیس میل دور استادوں کی ایک جماعت کو پڑھانے جایا کرتے تھے۔ ان کے لیکچروں کا موضوع جدید سمعی بصری امدادیں تھا۔ راقم بھی ان کے ہمراہ ہوتا۔ اس نے دیکھا کہ تقریباً ہر لکچر کے موقع پر کسی نہ کسی تعلیمی سواد تیار کرنے والی کمپنی کا ایک نمائندہ موجود ہوتا تھا جس نے پہلے سے پروفیسر موصوف کے ساتھ بات چیت کر رکھی ہوتی تھی۔ سبق کے بعد وہ جماعت کو اپنی تعلیمی فلمیں، سلائیڈیں، یا فلمی پٹیاں دکھاتا۔ اس چیز کا سارا اہتمام کمپنی کے خرچ پر ہوتا۔ اس سارے خرچ اور کاوش سے کمپنی کا صرف یہ مقصد ہوتا کہ اس کے تیار کردہ تعلیمی مواد کی تشہیر استادوں کے درمیان ہو جائے۔ کمپنی کی اصل غایت نفع اندوزی کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی۔ لیکن اس غایت کو حاصل کرنے کے لیے اسے حقیقی تعلیمی خدمت بھی انجام دینا پڑتی تھی۔ یہی حال امریکہ کے ناشران کتب کا ہے۔ انگریزی مدرسین کی قومی انجمن کا سالانہ اجتماع ہو رہا تھا۔ اس موقع پر ناشروں نے اپنی مطبوعات کی نمائش کا اہتمام کیا تھا۔ لیکن اپنی کتابوں کی تشہیر کے ساتھ ان لوگوں نے چھوٹے کتابچے بھی شائع کر رکھے تھے جو تدریس انگریزی کے مختلف پہلوؤں پر سائنسی روشنی ڈالتے تھے۔ یہ کتابچے مفت بانٹے جا رہے تھے۔ بعدازاں استادوں کے جتنے اجتماع دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان سب میں ناشروں کی طرف سے اس قسم کی تعلیمی خدمت کی سعی دیکھنے میں آئی۔

اس مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر مدرسے تنظیم و تعاون سے اپنی آواز مؤثر بنا لیں تو وہ تعلیمی میدان میں ایسی رہنمائی کر سکتے ہیں جسے چار و ناچار سب کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ تعلیمی رہنمائی

مدرسے ہی کا امتیازی حق ہے، جسے کوئی دوسری قوت غصب نہیں کر سکتی۔ اس رہنمائی کا بوجھ اعتماد اور ثابت قدمی کے ساتھ قبول کرنا مدرسے کی اہم ترین معاشرتی ذمہ داری ہے۔

فنِ تدریس میں مہارت

جب تدریس ایک فن اور استاد ایک فن کار ٹھہرا تو اس سے یہ بھی لازم آیا کہ اس فن میں مہارت پیدا کرنے کے لیے استاد کو فنی طریقوں اور تکنیکوں میں دسترس حاصل کرنی چاہیے۔ فن کار کے لیے فنی تربیت کا حاصل کرنا صریح طور پر ضروری نظر آئے گا۔ ممکن ہے یہاں بعض لوگوں کی نگاہ بعض مشہور مستثنیات کی طرف اٹھ آئے۔ مثلاً مولانا روم نے اپنے فن کاری کے متعلق کہا ہے:-

شعر میگویم بہ از قند و نبات من ندانم فاعلاتن فاعلات

لیکن اس شعر سے یہ مراد نہیں لی جا سکتی کہ مولانا روم عروض و قوافی سے بے خبر تھے۔ اس کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ شعر کہتے وقت مولانا کی توجہ عروض و قوافی پر نہ ہوتی تھی۔ بلکہ معانی و مطالب پر مضامین کی آمد کا یہ حال تھا کہ الفاظ خود بخود عروض و قوافی کے موزوں سانچوں میں ڈھلتے چلے جاتے تھے۔ انھیں اس بات کے لیے کبھی تردد نہ کرنا پڑتا تھا۔

بالکل یہی حال تدریس کے فن کا ہے۔ بعض نامور استاد ایسے بھی دیکھنے میں آئیں گے جنھوں نے کوئی فنی تربیت حاصل نہیں کی تھی۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے معلمی کے پیشے میں نام پیدا کیا اور اپنی مثال سے کئی لوگوں کو راستہ دکھایا۔ لیکن ایسے لوگ نوادرات میں سے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ پیدائشی استاد تھے۔ یہ امتیاز ایک اوسط استاد کے حصے میں نہیں آ سکتا۔ لہٰذا جو نوجوان مرد یا عورت اس بات کا فیصلہ کرے کہ وہ معلمی کا پیشہ اختیار کرے گا۔ اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ پہلے فنی تربیت حاصل کرے۔ فنی تربیت حاصل نہ کرنے کی صورت میں وہ دو راستوں میں سے کوئی ایک راستہ اختیار کر سکتا ہے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ وہ حافظہ پر زور ڈال کر وہ تدریسی طریقے یاد کرے جن سے اسے پڑھایا گیا تھا۔ اگر وہ ان طریقوں کو پورے طور پر ذہن میں حاضر بھی کر سکے (جس کا بہت کم امکان ہے) تو بھی یہ طریقے جدید تحقیقاتی اور نفسیاتی دریافتوں کی روشنی میں ا

غیر موزوں ہوں گے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ آزمائش و سہو کا راستہ اختیار کرے اور ٹھوکر یں کھا کھا کر کارآمد طریقہ ہائے تدریس معلوم کرے۔ لیکن اس طرح طلبہ کو جو نقصان اٹھانا پڑے گا وہ ناقابل تلافی ہوگا۔ غرض یہ دونوں راستے پُرخطر ہیں۔ سلامتی کی راہ یہی ہے کہ فن کاری کا دعویٰ کرنے سے پہلے فنی تربیت مکمل کر لی جائے۔

انسانی فطرت کا علم

فنی تربیت میں نہ صرف طریقہ ہائے تدریس اور تعلیمی امدادوں سے واقفیت شامل ہے۔ بلکہ بچوں کا ضروری علم بھی۔ پچھلی نصف صدی میں بچوں کے متعلق ہمارے علم میں جو اضافہ ہوا ہے۔ اس نے تعلیمی تکر میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ بچے کی مثال ایک خالی برتن کی ہے جس میں استاد رفتہ رفتہ علم و واقفیت بھرتا رہتا ہے۔ نفسیاتی حقائق نے اس خیال کو قطعاً غلط ثابت کر دکھایا ہے۔

حدیث میں آیا ہے۔ انما السعید من وعظ بغیرہ والشقی فی بطن اُمہٖ یعنی نیک بخت وہ ہے جو دوسرے کو دیکھ کر نصیحت پکڑے اور بدبخت ماں کے پیٹ ہی سے بدبختی لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ماں کے پیٹ میں جب بچے کی عمر ابھی چند سیکنڈ ہوتی ہے اور وہ ابھی خوردبینی قد سے آگے نہیں بڑھا ہوتا۔ اس وقت بھی وہ باپ اور ماں دونوں کے لپشت ہا ئے پشت کے متوارث خواص کا حامل ہوتا ہے بطن مادر کا ماحول ان متوارث رجحانات پر کس حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔ اس بات کے متعلق ابھی کوئی قطعی شہادت ہاتھ نہیں لگ سکی۔ لیکن بچے کے دنیا میں قدم رکھتے ہی ماحول اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ بچے کا ماحول ورثہ میں حاصل کردہ طبعی رجحانات کو ترقی دینے یا مسدود کرنے کا سامان پیدا کرنے لگتا ہے۔

جو رجحانات بچے کو ورثہ میں ملتے ہیں اور جنھیں طبعی رجحانات کا نام دیا جاتا ہے وہ اسے ایک خاص طریقے پر سوچنے محسوس کرنے اور عمل کرنے پر ابھارتے ہیں۔ یہ رجحانات مختلف افراد میں مختلف ہوں گے۔ لیکن ہر فرد کے طبعی رجحانات کو حرکت میں لانے والی صرف ایک چیز ہے

اور وہ ہے عزم بقا۔ یہی وہ قوت محرکہ ہے جو اول سے آخر تک تمام انسانی خیالات احساسات اور افعال کو جنم دیتی ہے۔ یہ قوت محرکہ طبعی رجحانات کے نکاسوں میں بہتی ہے اور اسی عمل کے ضمن میں ان نکاسوں کی کیفیت کو رفتہ رفتہ بدلتی رہتی ہے۔ استاد کے لیے یہ نکتہ بے حد اہم ہے۔ اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ طلبا کے کردار کو وہ اسی صورت میں متاثر کر سکے گا جب وہ خود سوچیں گے، محسوس کریں گے اور کام کریں گے۔ تعلیمی سواد یا استاد کی تقریر اکیلی کچھ انجام نہیں دے سکتی تدریس کو کامیاب بنانے کے لیے طلبہ کا تعاون اور اشتراک عمل ضروری ہے۔ یہ اشتراک خواہ فکری سطح پر ہو خواہ جذباتی سطح پر اور خواہ عملی سطح پر۔

ان نفسیاتی حقائق کی روشنی میں استاد کو چاہیے کہ طلبہ کی طبعی استعداد کے متعلق مندرجہ ذیل تین نکات کو ملحوظ خاطر رکھے۔

(۱) بچے کو جو استعدادیں ورثہ میں ملتی ہیں وہ محض جسمانی ذہنی اور مزاجی نشو ونما کے رجحانات ہوتے ہیں۔

(۲) یہ استعدادیں بعض کرداری رجحانوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان میں سے بعض مخصوص نوعیت کی ہوتی ہیں اور بعض عام نوعیت کی۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی منجمد اور تنگ سانچے میں ڈھلی نہیں ہوتی۔ بلکہ نشو ونما کے دوران میں یہ سب حد درجہ قابل ترمیم ہوتی ہیں۔

(۳) عزم بقا ان استعدادوں میں سے بہ کر ماحول پر زیادہ سے زیادہ قدرت پیدا کرتا جاتا ہے اور اس طرح خود اختیاری ترقی کرتی جاتی ہے۔

مدرسی کا فن

مندرجہ بالا علمی اور نفسیاتی حقائق اس بات کے متعلق کچھ شبہ نہیں چھوڑتے، کہ خیالات جذبات اور عمل میں ترمیم کرنے کی ایک ہی راہ ہے اور وہ ہے سوچنا، محسوس کرنا اور عمل کرنا۔ استاد خواہ کچھ کہتا رہے وہ اپنی مدد کے لیے خواہ کسی قسم کا مواد اکٹھا کرلے۔ اگر طالب علم سوچنے محسوس کرنے اور عمل کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تو اس کی ساری محنت بے کار ہے۔ سیکھنے کے یہ تین

لات (سوچنا، محسوس کرنا، اور کام کرنا) اس لحاظ سے یگانہ ہیں کہ معروف عمل ہونے سے ان کی کیفیت
در کمیت بدلتی رہتی ہے۔ ان کی ترمیم، اصلاح اور نشوونما کا اور کوئی طریقہ نہیں۔
ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ ہر بچہ زندگی اور قوت محرکہ کا ایک سرچشمہ ہے۔ وہ اپنی نشوونما
در بالیدگی کے مخصوص رجحانات اپنے خمیر میں لے کر پیدا ہوا ہے۔ ان رجحانات کی اصلاح و ترمیم
ن کی مخصوص ماہیت کی مناسبت ہی سے عمل میں آ سکے گی۔ استاد ان طبعی رجحانات کو نظرانداز
رکے کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ حد بندی استاد کے کام کو دوسرے فن کاروں سے مختلف بنا دیتی ہے مصور
پنے برش کو حسب منشا جدھر چاہے موڑ سکتا ہے۔ معمار، پتھر اور چونے سے جس قسم کی عمارت
چاہے بنا سکتا ہے۔ لیکن استاد اپنے شاگرد کو جو چاہے نہیں بنا سکتا۔ وہ اس کے طبعی رجحانات کے
دائرہ کے اندر رہ کر ہی کچھ کر سکتا ہے۔ یہ حد بندی استاد کو دوسرے فن کاروں کے مقابلہ میں قدرے
بے بس بنا دیتی ہے۔ لیکن ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ بعض اور باتیں اس بے بسی کی تلافی کرنے والی
بھی ہیں۔

ایک اہم نکتہ

ہم نے کہا ہے کہ مدرس کا تخلیقی فن طالب علموں کے طبعی رجحانات کے دائرہ کے اندر اندر ہی
بروئے کار آ سکتا ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ تدریس ایک خاص حد سے آگے کچھ نتائج پیدا نہیں
نہیں کر سکتی؟ اس سلسلے میں فارسی کے یہ شعر خواہ مخواہ ذہن میں آتے ہیں۔

اگر بیضہ مرغ ظلمت سرشت ÷ نہی زیر طاؤس باغ بہشت
بہنگام آں بیضہ پروردنش ÷ ز انجیر جنت دہی ارزنش
دہی آبش از چشمہ سلسبیل ÷ برآں بیضہ گردم دمد جبرئیل
شود عاقبت بچہ زاغ زاغ ÷ برد رنج بیہودہ طاؤس باغ

یہ درست ہے کہ ہر چیز اپنے فطری رجحانات کے رنگ میں ہی نشوونما پاتی ہے۔ لقوہ ہر
، پودے پہ لاکھ محنت کی جائے وہ گلاب کے پھول پیدا نہیں کر سکتا۔ لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنی

چاہیے کہ تعلیم لتھوہر کو گلاب کے پودے میں تبدیل کرنے کا ہرگز دعویٰ نہیں کرتی۔ وہ صرف اس قدر دعویٰ کرتی ہے کہ موزوں تربیت اور دیکھ بھال سے لتھوہر کے پودے کو زیادہ خوش نما اور تنومند بنایا جا سکتا ہے۔ وہ بچوں کی ان سوئی ہوئی فطری صلاحیتوں کو جگانا چاہتی ہے جو سازگار ماحول نہ ملنے کے باعث ہمیشہ سوئی پڑی رہتیں۔ وہ ان جوہروں کو پوری آب و تاب دینا چاہتی ہے جو بصورت دیگر ہمیشہ سوئے پڑے رہتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ محض ٹمٹما کر بس ہو جاتے ہیں۔ قدرت نے انسانی فطرت کو جن رنگارنگ اور انمول صلاحیتوں سے مالا مال کیا ہے ان کا صحیح اندازہ کرنا غالباً مشکل ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

اپنی فطرت کا اگر حسن نمایاں ہو جائے
آدمی کثرتِ انوار سے حیراں ہو جائے

اس میں کلام نہیں کہ بچے کی فطری صلاحیتیں تعلیم و تدریس کے لیے ایک آخری حد مقرر کرتی ہیں۔ لیکن عام حالتوں میں یہ آخری حد اس قدر دور ہوتی ہے کہ اکثر حالتوں میں تعلیم کا اس کو پیمانہ نا قریباً قریباً غیر اغلب ہوتا ہے۔

استادوں کے معتقدات

ہم نے کہا ہے کہ استاد کو اپنے فن کے اصولوں اور اس کی تکنیکوں سے باخبر ہونا چاہیے اسے بچے کی نفسیاتی زندگی سے واقف ہونا چاہیے۔ اول الذکر اس کے فنی اوزار ہیں اور ثانی الذکر اس کا خام مواد جسے اس کا تخلیقی فن ایک مطلوبہ شکل دے گا۔ یہ چیزیں اپنی جگہ بہت اہم ہیں لیکن ان سے زیادہ اہم ایک اور چیز ہے اور وہ ہے استاد کے اپنے معتقدات۔ اس کی اقدار اس کا فلسفہ حیات۔ مغرب کی صنعتی تہذیب نے اس قوت کو بہت دیر تک نظر انداز کیے رکھا کچھ برس ہوئے علم التعلیم کے ایک مشہور مغربی پروفیسر نے اپنے طالب علموں سے کہا تھا:۔

"میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ تم یہاں سیکھو، اس کا لفظ لفظ عملی تدریس میں کام آئے میں تمہیں کسی ایسی چیز میں الجھانا نہیں چاہتا جس کا تعلق محض نظریات سے ہو۔"

مغربی دنیا اب اِس غلطی سے خبردار ہوچکی ہے۔ سارا بھروسہ مادی اقتدار ہی پر رکھنے سے اسے جو تلخ مایوسیاں ہوئی ہیں انھوں نے اسے چونکا دیا ہے اور اب شدومد سے یہ کہا جانے لگا ہے کہ تعلیم کے لیے اقدار و معتقدات روح کا درجہ رکھتے ہیں۔ نہائی نصب العین اور مقصد طے کیے بغیر طریقہ ہائے تدریس اور تکنیکوں کی تکمیل اور ان میں مہارت کوئی پائدار نتائج پیدا نہیں کر سکتی۔ سائنس اور تکنالوجی کے لیے بے شک طریق کار اور تکنیک ہی سب کچھ ہیں۔ لیکن تعلیم میں ان کا درجہ ثانوی ہے۔ تعلیم فوری نتائج کو سب کچھ سمجھ کر اپنی اصلی غایت کو پورا نہیں کر سکتی۔ قرآن حکیم نے یہ نکتہ صدیاں گذریں بڑے بلیغ پیرائے میں صاف کر دیا تھا۔ اِس کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

کیا تم نے اِس شخص کی حالت پر بھی غور کیا ہے جس نے اپنی خواہشات کی پوجا شروع کر رکھی ہے۔ اللہ نے اسے باوجود اِس کے علم کے گمراہ کر دیا ہے۔ اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی ہے۔ اِس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ اللہ کے بعد کون راستہ دکھا سکتا ہے۔ کیا تم سمجھتے نہیں؟" (سورہ جاثیہ)

اس آیت کے معانی بالکل صاف ہیں۔ جو شخص علم کو محض اپنی خواہشات یعنی مادی ضروریات کے پورا کرنے کا ذریعہ بناتا ہے وہ اِس علم کے ہوتے ہوئے بھی ابدی حقیقت کے چہرے کی جھلک نہیں دیکھ سکتا۔ بے شک جو کوئی اللہ سے منہ پھیر لے، اسے ابدی حقیقت کا راستہ کون دکھا سکتا ہے۔ یہ ایک سیدھی سادی سی بات ہے۔ قرآن کو ان لوگوں کی بے بصیرتی پر حیرت ہوتی ہے جو اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن دنیا میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ قوموں اور ملکوں نے اس نکتہ کے سمجھنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے اِس کا تمسخر اڑایا اور کہا کہ جو علم اِس زندگی میں کام نہیں دیتا وہ کسی کام کا نہیں۔ مغربی تہذیب نے اِس تجربے کو بہت بڑے پیمانے پر آزمایا۔ اس طور پر اسے جو مادی ترقی نصیب ہوئی وہ تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ لیکن آخر اس کی خوش فہمی کا بھی خاتمہ ہو گیا اور اسے یہ اقرار کرنا پڑا کہ ان مٹ روحانی اقدار کو منزل قرار دیئے بغیر متوازن زندگی کی تعمیر ممکن نہیں۔ اِس احساس نے اساتذہ کے لیے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ وہ طریقہ ہائے تدریس، درسی تکنیکوں

اقدار اور معتقدات کا بھی حامل ہو۔ فنی مہارتیں اسے ایک اچھا کاریگر بنا سکتی ہیں۔ لیکن اس کی
ہیں وہ مقناطیسی کشش پیدا نہیں کرسکتیں جو اپنے ماحول کو معجز نما طریق سے متاثر کر دیا کرتی ہے۔
ان محض آلات کا درجہ رکھتے ہیں جو کسی بلند تر مقصد کے لیے استعمال ہونے چاہئیں۔ وہ
مقصد روحانی اور اخلاقی اقدار ہیں جس استاد کی شخصیت ان اقدار کو منعکس نہیں کرتی وہ اپنے
ایک اہم حصے کو ادھورا چھوڑ تا ہے۔ استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک واضح فلسفہ حیات
سے غیر متزلزل وفاداری رکھتا ہو۔ وہ خواہ ریاضی کا استاد ہو یا سائنس کا۔ اس فلسفہ کے بغیر نہ وہ
دوران میں مناسب نکات پر زور دے سکتا ہے اور نہ طالب علموں کے ساتھ موزوں قسم
کے تعلقات پیدا کر سکتا ہے۔ مدرسہ بذات خود ایک چھوٹا سا معاشرہ ہے۔ جس میں ہر فرد دوسرے
کے ساتھ گونا گوں مراسم قائم کرتا اور بڑھاتا ہے۔ استاد کو نہ صرف اپنے رفقائے کار کے ساتھ
قائم کرنے ہوتے ہیں بلکہ صدر معلم، عوام اور طلبہ کے ساتھ بھی۔ ان مراسم کی نوعیت سراسر استاد
کے نظریہ حیات پر موقوف ہو گی۔ مثلاً اگر وہ تحکم پسندی میں یقین رکھتا ہے تو یہ مراسم اور قسم کے ہوں گے۔
اگر وہ نوع انسانی کی مساوات و اخوت کا قائل ہے تو یہ مراسم مختلف نوعیت کے ہوں گے۔ اگر اس کا
عقیدہ یہ ہے کہ اس زندگی کے بعد کچھ نہیں تو دوسروں کے ساتھ اس کے تعلقات اور قسم کے ہوں گے۔
لیکن اگر اس کا یہ عقیدہ ہے کہ اسے بہت جلد ایک حاکم اعلیٰ کے سامنے پیش ہو کر اپنے چھوٹے
سے چھوٹے عمل کا جواب دینا ہے تو اس صورت میں اس کے انسانی تعلقات بالکل مختلف سانچے
میں ڈھلیں گے۔ غرض استاد کے معتقدات ہی وہ یکتا قوت ہیں جو اس کی شخصیت کا رخ متعین
کرتی ہیں۔ اگر یہ روحانی قوت موجود نہیں تو اس کی مثال کلمۃ خبیثۃ ن جتثت من فوق الارض
من قرار ما" کی ہو گی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا استاد کو ملازم رکھنے والے لوگوں کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ
وہ اس کے اخلاقی اور مذہبی اعتقادات کو معلوم کرنے کے بعد اسے ملازم رکھیں۔ اوپر جو کچھ کہا گیا ہے
اس کی روشنی میں یہ قدم ناگزیر نظر آتا ہے۔ کیا یہ بات مضحکہ خیز نہیں کہ ہم یہ معلوم کرنے کا تو بے حد

اہتمام کریں کہ کاریگر کے پاس کون کون سے اوزار ہیں۔ لیکن یہ جاننے کی تکلیف گوارا نہ کریں کہ ان اوزاروں سے وہ کون سا کام لینے والا ہے۔ مختلف علوم۔ طرح طرح کے فنون، واقفیتیں اور مہارتیں محض حصول مقصد کے ذرائع ہیں۔ بذات خود مقصود نہیں۔ زندگی کا مقصد ان کے سوا کچھ اور ہے تعلیم کے لیے یہ نہائی مقصد بنیادی درجہ رکھتا ہے اور اسی مناسبت سے استاد کے عقاید تدریس پر بہت گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ لہٰذا استادوں کو تربیت دینے والے اداروں اور مدرسوں کو چاہیے کہ وہ استادوں کے اعتقادات کے بارے میں خاموشی کی پالیسی ترک کر دیں۔ اس پالیسی نے پہلے ہی ہماری تعلیم کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اب جبکہ مغرب میں بھی اس چیز کے خلاف ردِ عمل ہو رہا ہے پاکستان کو چاہیے کہ اپنے مستقبل کے اساتذہ کو واضح روحانی اور اخلاقی اقدار کا حامل بنانے کا تسلی بخش اہتمام کرے۔ اس کے بغیر استاد کی شخصیت میں یک جہتی پیدا نہیں ہو سکتی اور اس کی تدریس تشکیل کردار کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

مغربی نقطہ نگاہ میں تبدیلی

اس سوال پر مغرب کے نقطہ نگاہ میں جو تبدیلی رونما ہوئی ہے اس کا کچھ اندازہ ذیل کے اقتباسات سے ہوگا۔

"غالباً کسی کاریگر کے فلسفہ زندگی کا اتنا اثر اس کے کام پر نہیں پڑتا جس قدر استاد کے فلسفہ حیات کا۔ چونکہ اس کے بغیر گذارہ نہیں اس لیے استاد کو چاہیے کہ تا وسعت امکان ایک دافی فلسفہ حاصل کرے۔ زندگی اور تعلیم کے فلسفہ کے بغیر چارہ نہیں۔ جو لوگ اس بات پر فخر کیا کرتے ہیں کہ وہ ہر قسم کے فلسفہ سے بے نیاز ہیں فی الحقیقت وہ بھی ایک فلسفہ رکھتے ہیں۔ لیکن یہ فلسفہ بالکل ناکافی ہوتا ہے" (رسک)

ہمارے خیال میں کسی استاد کے متعلق اہم ترین بات یہ ہے کہ وہ کس قسم کے فلسفۂ تعلیم کا حامل ہے۔ استاد کے متعلق جو چیز سب سے زیادہ روشنی ڈال سکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے تعلیمی تصورات کو نظامِ کائنات کے ساتھ کسی طور پر ہم آہنگ کرتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ انسان کے بنیادی

تصورات اِس کے کردار پر اتنا گہرا اثر ڈالتے ہیں کہ اگر کوئی استاد قطعی اور واضح طور پر یہ بتا دے کہ اس کے نزدیک تعلیم کا کیا مفہوم ہے تو ہم یہ بتا دینے کا ذمہ لیتے ہیں کہ وہ کون سے طریقے اختیار کرے گا اور اِس کا کام کس حد تک کامیاب رہے گا۔" (پروفیسر ہوگ ہارورڈ یونیورسٹی)

تدریس کے نازک مقامات پر استاد کا نظریہ حیات ایک فیصلہ کن قوت ثابت ہو سکتا ہے۔ معلم کے کام پر اِس بات کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے کہ آیا وہ زندگی کے خالص مادی پہلو ہی میں یقین رکھتا ہے۔ یا اس میں اصلی نظریاتی بلندی ہے جو اخلاقی اور روحانی اقدار کو لافانی خیال کرتی ہو۔ اس تمیز سے نہ صرف اِس کی اپنی دلچسپیوں اور سرگرمی عمل میں فرق پڑے گا۔ بلکہ اِس بات میں بھی کہ وہ تدریس کے ضمن میں کن باتوں پر خاص توجہ دیتا ہے۔" (آر۔ اے۔ ملر)

زیادہ دیر کی بات نہیں کہ مغرب نے اساتذہ کی تربیتی درسگاہوں کے نصابوں سے فلسفہ تعلیم اور تاریخ تعلیم جیسے مضامین کو محض اِس لیے اڑا دیا تھا کہ اِن نظری بحثوں سے کچھ عملی فائدہ نہیں، نصاب سازی کے مضمون میں بھی زیادہ زور نصاب کی سطحی اور میکانکی تفصیلوں ہی پر رہ گیا تھا۔ اب یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ معاشرے کی تعمیر نو کے لیے تعلیم کو نہ صرف ضروری تکنیکیں فراہم کرنی چاہئیں بلکہ اسے وہ منزل بھی واضح طور پر بتانی چاہیے جس کی طرف قدم اٹھایا جائے۔ استاد کی نگاہ زندگی کے وسیع تر اور عمیق تر مقصد پر ہونی چاہیے، خواہ وہ تاریخ پڑھائے یا ریاضی۔ اِس کی نگاہ تاریخ کے سنوں اور الجبرا کے کلیوں سے پرے زندگی اور معاشرے کی منزل مقصود پر جمی رہنی چاہیے تاکہ وہ اپنی تدریس اور ان نہائی قدروں کے درمیان رابطہ پیدا کر سکے۔ چونکہ زندگی محض ظاہری لباس سے عبارت نہیں۔ اس لیے استاد کا فرض ہے کہ نوخیز طلبہ میں فوری اور نہائی دونوں قسم کی قدروں کا احساس پیدا کرے۔ ایسی تدریس جن میں معاشرتی اور کائناتی دونوں حسن موجود ہوں جس استاد نے خود کبھی ان مسائل پر غور نہیں کیا وہ نوخیز طلبہ کا قابل اعتماد رہنما نہیں بن سکتا۔ استاد اپنے مضمون پر لاکھ حاوی ہو اور طریقہ ہائے تدریس میں خواہ کتنا ہی ماہر کیوں نہ ہو، اگر اس نے ایک خاصے جامع اور معقول فلسفے کی روشنی میں زندگی کے ہمہ گیر مقصد کو یقین کے ساتھ نہیں سمجھا تو وہ

کمل طور پر قابل اعتماد نہیں۔ ونعم ما قیل

قلندر جز دو حرف لا اِلٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

ہمارا ماضی و حال

اسلامی دنیا نے تعلیم و تدریس کی جو شاندار روایات قائم کیں ان سے کون بے خبر ہے۔ لیکن تعلیم کی یہ فلک بوس عمارت تمام تر روحانی اور اخلاقی بنیادوں پر اٹھائی گئی تھی۔ "افحسبتم انما خلقناکم عبثًا و انکم علینا لا ترجعون" کے خدائی انتباہ نے اس تعلیم کو ہمیشہ بے راہ روی سے بچائے رکھا۔ یہ اسی بات کا صدقہ تھا کہ ہمارے نامور علما اور اساتذہ اخلاق و تقوی میں بھی غیر معمولی پایہ کے لوگ ہوا کرتے تھے۔ علم اور روحانی اقدار دو متبادل نقطہ خیال کیے جانے لگے تھے۔ ہر چند کہ یہ اساتذہ جدید تدریسی تکنیکوں اور طریقہ ہائے تدریس سے ایک حد تک بے خبر تھے۔ لیکن زندگی کے مقصد کے بارے میں انھیں کوئی غلط فہمی نہ تھی تخلیق کائنات اور انسانی زندگی کا منتہا انھوں نے پوری سوجھ بوجھ کے ساتھ اچھی طرح سمجھ رکھا تھا۔ منزل کی یہ تعیین ان کی فنی کمیوں کی کافی سے زیادہ تلافی کر دیتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ان کی مساعی کی پیداوار غیر معمولی طور پر تسلی بخش تھی۔ جو لوگ ان سے تربیت حاصل کرتے تھے وہ عمومًا ایک درس گاہ اور یک رخ شخصیت لے کر نکلتے تھے۔

مغرب کے سیاسی غلبہ کے ساتھ مغرب کا نظام تعلیم بھی آیا۔ اس نظام نے پہلی مرتبہ ہمیں سیکولر تعلیم سے روشناس کرایا۔ تعلیم اور اخلاق کا صدیوں پرانا بندھن ٹوٹنے لگا۔ پھر بھی پرانی روایات کے مٹنے میں دیر لگی سالہا سال تک انگریزی مدرسوں کے استاد بھی پرانی وضع داری پر جمے رہے۔ لیکن ان روایات کو مٹانے والے اثرات پوری شدت کے ساتھ مصروف کار تھے۔ رفتہ رفتہ خالص سیکولر چھاپ کے استاد پیدا ہونے لگے۔ ان کے زور پکڑتے ہی تعلیم کی بے مقصدی ایک ہمہ گیر شکایت بن گئی۔ پڑھے لکھے نوجوانوں کا اخلاقی بودا پن ضرب المثل بننے لگا۔ لوگ حسرت کے ساتھ پہلے وقتوں کے مکتبوں اور ان میں پڑھانے والے بزرگوں کو یاد کرنے لگے۔ ہر نسل نے محسوس کیا کہ

اس کے بعد آنے والی نسل کو جو تعلیم ملی ہے وہ مقابلتاً کم مؤثر ہے۔ اس افسوسناک صورت حال کی
بہت سی توجیہیں کی گئیں۔ بعض نے کہا کہ پرانی درسی کتابیں جن اخلاقی قدروں سے بھرپور تھیں وہ بلند
تعلیمی معیاروں کی ضامن تھیں۔ بعض نے کہا کہ پرانے طریقہ ہائے تدریس زیادہ کارگر تھے۔ بعض نے یہ خیا
ظاہر کیا کہ پرانے استادوں کی مار پیٹ تعلیم کو بلند سطح پر رکھنے کی موجب تھی۔ جو شخص تعلیم کی فکری تاریخ
سے واقف ہے وہ فوراً جان لے گا کہ ان میں سے کوئی سبب بھی پست تعلیمی معیاروں کا موجب نہیں
اصل سبب جس کی جڑیں اب کافی گہری ہو چکی ہیں یہ ہے کہ ہمارے اساتذہ عموماً ایک وافی فلسفہ
سے دن بدن کورے ہوتے جا رہے ہیں۔ سکول کالج یا تربیتی درسگاہ میں اس فلسفہ کی بہم رسا
کا کوئی خاص انتظام نہیں۔ اگر اتفاقاً کسی کے ہاتھ یہ دولت لگ گئی تو لگ گئی ورنہ اکثریت زندگ
کے مادی مقاصد کے سوا کسی اور شئے سے واقف نہیں۔ جہاں استادوں کی ذہنی پرواز کی آخری
حد اتنی پست ہو وہاں شاگردوں میں بلندی ڈھونڈنا خود فریبی کے سوا کچھ نہیں ؞

نئے دور میں تعلیمی منصوبہ بندی

خان عارف برنی

علامہ اقبال علیہ الرحمتہ کے بچپن کی وہ بات کہ اقبال دیر سے آتا ہے۔ ہمارے ملک کے حالات
پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے۔ وہ نیا دور جو افق پاکستان پر ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ہلال نو اور
۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو بدر کامل بن کر چمکنا شروع ہوا، واقعی اقبال مندانہ دور ہے۔ لیکن دیر آید
درست آید کے مصداق یہ دور اپنے جلو میں ایسی تعمیری خوبیاں لے کر آیا ہے جنھوں نے صدیوں
اور برسوں کی ذہنی کثافتوں کو مہینوں اور ہفتوں میں صاف کر دیا۔

ایک مشہور کہاوت ہے نان نہیں تو جان نہیں۔ بچپن میں تیسری یا چوتھی جماعت میں
زراعت پر ایک سبق اردو کی درسی کتاب میں پڑھا تھا جس میں سارے سبق کا ماحصل یہی ایک
جملہ تھا۔ اُس وقت تو جملے کی اس ترکیب میں حرف "نون" کی تکرار صرف سامعہ نوازی کرتی تھی۔ لیکن
عملی زندگی میں اس جملے کی سچائی کچھ اس طرح نظر آئی کہ حکومتوں کو جان ناتواں قائم رکھنے کے لیے
ملک ملک سے بھیک مانگتے دیکھا۔ خدا کا شکر ہے کہ پاکستان کا وہ دور ختم ہوا، اور ہم اب
اس قابل ہو گئے ہیں کہ کچھ ہی عرصے بعد غلّے کی طرف سے پورے طور پر سکون حاصل ہو جائے
جب نان کے ساتھ جان میں جان آئی تو پیٹ میں روٹی پڑ کر "موٹی سوٹی گلاں" بھی یاد آنے
لگیں۔ اس پورے دور میں تعلیمی لحاظ سے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، سنٹرل ٹریننگ کالج
اور اس کے دانشوروں کے ہاتھوں تعلیمی ترقی کے لیے جس تندہی، خلوص اور عالی حوصلگی سے کام
کیا گیا ہے وہ تعلیم کے لیے فال نیک کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان اداروں کی پیش کردہ تجاویز اور عرض
داشتوں کی روشنی میں حکومت نے تعلیمی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے ملک کی رہنمائی
کا بیڑا اٹھایا ہے۔ آگے چل کر صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ اس ملک میں بسنے والی

دوسری قوموں کے لیے بھی مفید ثابت ہوگا۔

ماضی بعید میں، اردو زبان کے جنم دن سے ہی نہیں۔ بلکہ مشرق وسطیٰ کے ممالک کی حکومتوں کی الف لیلائی طلسماتی حکمرانی کے دور سے اِس مشرقی دنیا میں شاعر اور ادیب، مصنف اور مترجم یا تو اپنا بستر بوریا لپیٹ کر ایران سے اصفہان اور مصر تک کا سفر کرتے رہے ہیں۔ یا لکھنؤ اور دہلی آگرہ اور لاہور۔ حیدرآباد دکن، عظیم آباد اور کلکتہ کے رؤسا اور نوابوں کی حرص و آز کو مزید چمکانے اور جلا دینے کا باعث بنتے رہے ہیں۔ لیکن اب یہ گروہ خود اپنے پیروں پہ کھڑا ہونے کے منصوبے باندھ رہا ہے اور "تلک الایام نداولہا بین الناس" یا سرد مہریٔ زمانہ و معاصرین وقت کے ہاتھوں جو قلم کار گوشۂ گمنامی میں گم ہوتے رہے ہیں۔ ان کی بقا کے سامان فراہم ہوتے نظر آنے لگے ہیں۔

ہم ایک زرعی ملک کے باشندے ہیں۔ اور ہماری زیادہ آبادی دیہاتوں میں آباد ہے جس کی وجہ سے تعلیم میں خاطر خواہ پیش رفت میسر نہیں آئی تعلیم کے فقدان ہی سے وہ تاریکیاں جنم لیتی ہیں جو قتل و غارت گری، خاندانی عداوت۔ پیر پرستی۔ تعویذ اور گنڈے اور ٹونے ٹوٹکے جیسے قبیح افعال سرزد کراتی ہیں۔ بڑی مصیبت یہ ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود حکومت کے اور خود ہمارے ذرائع آمدنی محدود ہیں۔ اب نہ تو وہ الہ دین کے چراغ والا دور رہے کہ جہاں ذرا رگڑا۔ محل، محلات فرش، فروش نوکر اور خدام کی طرح کتاب۔ پریس، اخبارات، تعلیم، عالم، ادیب اور معلّم سب چیونٹیوں کی طرح اُبل پڑیں، اور آناً فاناً سب کو پڑھا لکھا کر سیدھا کر جائیں، اور نہ ہمارے اندر وہ مذہبی جوش اور روحانی کشف و کرامات باقی ہے جس کے طفیل صرف ایک ہی نظر سے دیواریں شق اور قلوب روشن ہو جایا کرتے تھے۔ ہم تو خالص مادّی بن کر رہ گئے ہیں۔

ایک سائنسدان تحقیق کرنے کے بعد کہتا ہے کہ ہم روٹی کا جو ایک لقمہ منہ میں ڈالتے ہیں اسے ہمارے منہ تک لانے کے لیے نہیں سو چھیاسٹھ ہاتھوں نے کام انجام دیا ہے۔ تب کہیں وہ اِس قابل ہوا ہے کہ کام و دہن کو لطف اندوز کر سکے۔ اسی طرح تعلیم جیسا مسئلہ جس پہ قوم کے

عروج و زوال کا انحصار ہے وہ مسئلہ جسے ڈیڑھ سو سال پہلے، اجنبی دیس کے گورے حکمرانوں نے آمرانہ ذہنیت کے ساتھ اپنی حکومت کی گاڑی کو کھینچتے رہنے کے لیے ہم پر مسلط کیا کوئی آسان مسئلہ نہیں ہے۔ لارڈ میکالے کے تعلیمی فارمولے نے مشرق کی مشرقیت کا جس جس طرح چہرہ مسخ کیا ہے اُسے دیکھ کر اقبالؒ کے الفاظ میں یہی چاہا جا سکتا ہے کہ ؏

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

تعلیم کے ساتھ جب زبان کی وحدانیت کا خیال دامنِ ذہن و دماغ میں سرسراتا ہے تو سوچنے لگتے ہیں کہ یہ کیا خبر تھی کہ ہمیں ایک ایسا وطن عنایت ہوگا جس کے دو منطقوں میں ایک ہزار میل سے زائد بُعد ہوگا۔ جہاں پر مشرق کے لوگ چاول کھاتے ہیں مغرب کے گندم۔ اُدھر بانس کے گھر بناتے ہیں۔ اِدھر فلک بوس عمارتوں سے لے کر جھونپڑے تک میں گذران ہے۔ اُدھر کی آب و ہوا مرطوب ہے اِدھر گرم خشک بھی ہے اور سرد خشک بھی۔ آپ کو کیسی مطلوب ہے؟ اُدھر دھوتی اور ساڑھی ہے اِدھر شلوار اور طرّے سے لے کر شال اور دوشالے ہیں۔ اُدھر مُردہ سنسکرت کی زندہ ٹیگور اور نذرالاسلام جیسے فطرت تراش شاعر پیدا کرنے والی، بائیں سے دائیں طرف لکھی جانے والی بنگلہ زبان ہے تو اِدھر سندھی، پنجابی، پشتو، کشمیری، بلوچی، فارسی عربی اور اُردو کا رواج ہے جس میں علّامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ جیسے قومی پیامبر کا طوطی بولتا ہے۔ اُدھر کے عامی کو اِدھر لے آئیں تو آب و ہوا ۔۔ نہیں آتی۔ تہذیب پسند نہیں آتی۔ کھانے ہضم نہیں ہوتے۔ اِدھر کے باسی کو اُدھر بھیج دیں تو وہ بخار اور ملیریا کے ہاتھوں ادھ موا ہو جاتا ہے۔ کھانا میسر نہیں آتا۔ دال بھات، مچھلی اور پات پر گذارا کی عادت نہیں۔ ان حالات میں یار لوگ دور کی کوڑی لاتے ہیں کہ اِس کا صحیح علاج یہ ہے کہ رومن رسم الخط میں بنگلہ اور اُردو، دونوں کو چالو کر دو۔ آخر ترکی اور انڈونیشیا نے بھی تو ایسا ہی کیا ہے۔ لیکن انھیں عجلت اور معکوس فہمی کی بدحواسی کے ہاتھوں یہ یاد نہیں رہتا کہ وہ تجربہ بھی اب ناکام ہیں کہ قوم کے سر پر ایک مصیبت کی شکل میں سوار ہے۔ اور انڈونیشیا ہزاروں جزیروں کا ایک مجموعہ ہے لیکن ان میں وہ بُعد المشرقین نہیں ہے۔

جس سے ہم دوچار ہیں۔ کیوں کہ ان جزیروں کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ نہیں ہے۔ آب و ہوا کا تضاد نہیں ہے۔ کلچر اور تہذیب، زبان و قلم کا فرق نہیں ہے۔ لوگوں کے چہروں اور لباسوں میں اجنبیت اور بیگانگی نہیں ہے۔ اس لیے وہ جو کچھ بھی کریں ٹھیک ہے۔ لیکن ہمیں اپنے حالات کے مطابق ہی سوچنا چاہیے۔ سوچنا ہے اور بین بین راہ بنانی ہے۔

افراد اور حکمران قومیں ملک کی سیاسی تاریخ کو تو گھنٹوں اور لمحوں میں بدل سکتی ہیں لیکن زبانیں اپنا مقام اور بین الاقوامیت صدیوں اور قرنوں میں حاصل کیا کرتی ہیں۔ وہ زبان جس کو ہم حرزِ جان بنانے کا دعویٰ اور وعدہ کرتے رہتے ہیں وہ خود بخود نہیں پھیلے گی۔ تاوقتیکہ صدیوں تک ہمارے ادیب، شاعر، مفکر، اور عالم، اپنی آنکھوں کی روشنی اور جگر کا خون اس زبان کی نذر نہیں کریں گے۔

تعلیمی اصلاحات کے پیشِ نظر ہمیں ایسے راستے اپنانے اور ایسے اصول تراشنے کی ضرورت ہے جو زندگی کی تمام اقدار کو اس انداز میں حل کر سکیں کہ ہم اپنے سیارے کے ماحول میں مشرقی رہتے ہوئے دنیا میں اپنے آپ کو اس طرح سربلند کر سکیں جس طرح کسی زمانے میں اسی مشرقِ وسطیٰ کے چند بادیہ نشینوں نے دنیا کے نقشے کو اپنے ایمان، اپنے ایقان، اپنے عمل اور اپنی انسانیت پروری کے ہاتھوں بدل کر کچھ ایسا کرشمہ دکھایا تھا کہ صدیوں تک مظلوم انسانیت امن کے گہواروں میں مست اور مدہوش ہو کر تہذیب و جستجو کے الغوزے بجاتی رہی۔

اس انسانیت کش دور میں انسانی روح کے لیے ویسی ہی دست گیری کی ضرورت ہے تاکہ عظمتِ انسانی کو قعرِ مذلت سے بچایا جائے۔ بقول لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی حالات تو ایسے ہیں کہ اس عالمی سطح پر اب صرف ـــ

بار دگر دم رہ گئے، کپڑے کھونٹے رہ گئے
آدمی تو ہیں بہت انسان تھوڑے رہ گئے

❖

اسلامی دور میں معلم کے آداب و فرائض

ڈاکٹر سلیم فارانی

غلامانہ بود و ماند کا سب سے بڑا غضب جو ہم پر ہوا یہ تھا کہ عربی زبان سے ہمیں عملاً تنفر
پیدا ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اپنی ثقافت، کلچر، تہذیب و تمدن اور شاندار قومی روایات
حقائق سے مطلق ناآشنا رہ گئے کیوں کہ ان تمام چیزوں کی معلومات کے ماخذ سب عربی زبان
میں تھے۔ یورپ کی تقلید نے ہمیں مذہب سے تو متنفر کر ہی دیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ جو ہماری
جڑیں کاٹنے کو بڑے ظلم کی بات ہوئی یہ تھی کہ ہمارے دل و دماغ میں یہ غلط چیز سما گئی کہ جو کچھ
ربی میں لکھا ہوتا ہے وہ صرف ہمارے مُلّائے دین کے محدود حلقے کی بے ہنگم باتیں ہیں۔
ور کچھ نہیں ۔

اسلامی تہذیب و تمدن اور ثقافت کے اس بڑے تاریخی دفتر کے اوراق جو عربی میں
یں پلٹ کر دیکھیں تو آپ تعجب سے پکار اٹھیں گے کہ ہیں، ہم آج جو اپنے آپ کو مغربی اقوام
ے بہت پیچھے دیکھتے ہیں۔ صدیوں پہلے موجودہ مغرب سے بھی بہت سی باتوں میں بہت آگے
تھے۔ ہماری ثقافت میں کیا کچھ نہ تھا کہ ہم گدیہ گری پر مجبور ہوئے۔ ہماری آنکھوں پہ پٹی باندھ کر
یں نابینا و محتاج کر دیا گیا، کہ دوسرے کے سہارے کے بغیر چل نہ سکیں۔ "خود ناشناس" رہے
ا تو در در کی ٹھوکریں نصیب ہوئی ہیں۔ ہائے افسوس کہ ہم کم از کم اتنے خود شناس تو ہوتے
ہمیں احساس ہوتا کہ ہماری آنکھوں پہ پٹی بندھی ہے۔ لیکن قوم غالب کی جادوگری اور
ا اپنی ذلیل عقیدت اور غلامانہ جاہ پسندی کچھ اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ یہ احساس تک
انہ ہو سکا۔

یہ بات بھی کلیتہً قابلِ تسلیم نہیں کہ ہر کام کے لیے حکومت ہی کی امداد چاہیے یا جو کام ہوتے ہیں حکومت ہی کے التفات سے ہوتے ہیں۔ اس میں سے غلو اور مبالغے کی بو آتی ہے۔ کام تو کام کرنے والے کی نیت سے زیادہ وابستہ ہے۔ بہ نسبت حکومت کے التفات سے متعلق ہونے کے حکیم بو علی سینا کی جان حکومت کی طرف سے مسلسل خطرے میں رہی۔ لیکن انہی خطرات کے زمانے کا نتیجہ کیا تھا۔ اس کی معرکتہ الآرا تصنیف "القانون" جس کا ایک ایک فقرہ جدید ترین ترقی یافتہ یورپ کے سینے میں بھی گڑھ کے رہ گیا ہے۔ اور مغرب و مشرق کا ہر حکیم انگشت بدنداں ہے۔

کام کے لیے تو ماننیائی طبیعت چاہیے۔ ولولہ و شوق پیہم کی ضرورت ہے نہ کہ التفات و داد کی۔ جزا کی خاطر کام پورے انہماک سے نہیں ہو سکتا۔ اور تو اور عبادات میں بھی کچھ جزا کا خیال آ جائے تو خلل پڑ جاتا ہے ؎

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے (اقبال)

جزا تو بے عملوں کو عمل کی طرف راغب کرنے کی چیز ہے۔ صحیح عامل کے نزدیک عمل کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ بہ نسبت جزا کے۔

قیام پاکستان کے بعد اب ہماری آنکھوں سے پٹی ہٹنی چاہیے اور ہمیں اپنی ثقافت سے آشنا ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور کوشش بھی ایسی کہ جو ماننیائی قسم کی ہو۔ جزائی احتیاج کے ماتحت نہ ہو۔

ہم اب دورِ اصلاح سے گذر رہے ہیں اور ہمیں اپنے تمام نقائص کی اصلاح تعلیم میں نظر آ رہی ہے۔ مغرب کی نقالی اور فرمائش کے مطابق ہم نے اصلاحی اقدامات میں مختلف پہلو بدلے۔ لیکن تعلیم کا حال وہی رہا۔ ظاہریت باطنیت کے بغیر دیرپا نہیں ہوتی۔ نصاب کی اصلاح اور نظام کی اصلاح تو اکثر و بیشتر مدنظر رہی اور اس پر خاص زور رہا کہ استاد کو تربیت دی جائے، جسے یہ نظام چلانا ہے۔ وہ ایک علمی و عملی سند کا حامل ہو۔

تب مدرسے میں تدریس کا کام انجام دے۔ لیکن علم و عمل کی اس تربیت اور اصلاح نصاب و نظام کے باوجود تعلیم کا جو حال رہا اس سے کبھی اطمینان نصیب نہ ہوا۔ تاریخی اوراق پلٹ کر اپنے شاندار ماضی کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ اسلامی دور میں تعلیم سے کبھی بے اطمینانی نہیں ہوئی۔

اسلامی دور میں اساتذہ اور طلبہ دونوں میں خلوص تھا۔ ان کی نیت صرف علم تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ انھیں اس علم سے وہ مفاد بھی پہنچے تھے جن کی خاطر اب علم سکھایا جاتا ہے۔ موجودہ دور کے اساتذہ اور طلبہ کی نیت اول تو اقتصادی بہبودی کے سوا کچھ نہیں۔ اور اگر کوئی نیت اس کے علاوہ ہوتی بھی ہے۔ تو متغیر الحال۔ لیکن "علم برائے علم" کبھی نیت نہیں رہی۔ متغیر الحال نیت تو کیا پوری ہوگی عمل جو نیت میں شامل ہی نہیں رہتا۔ اس کا صحیح حصول تو ممکن ہی نہیں۔ جہاں تک غرض پوری ہوئی وہاں تک کچھ علم آیا۔ اور جب تک غرض رہی وہ تھوڑا بہت علم ذہن میں محبوس رہا۔ غرض پوری ہو جانے پر اس کا دماغ میں رہنا بے سود۔ ہزاروں کی تعداد میں تعلیم یافتہ ایسے موجود ہیں جنھوں نے صرف امتحانات پاس کرنے کی غرض سے مختلف علوم پڑھے۔ لیکن امتحان میں کامیابی کے بعد ان کا شمہ تک ان کے دماغ میں باقی نہ رہا۔

اسلامی دور میں اساتذہ کو اس طرح کی ٹریننگ نہیں ملتی تھی جو تعلیم و تربیت مغربی میں مروج ہے۔ لیکن ان کے مقررہ اوصاف کچھ ایسے تھے کہ نظام کتنا ہی بگڑا ہوا ہو تعلیم کو ٹھیس نہیں لگتی تھی۔ ہم اگر بنظر غائر دیکھیں تو معلوم ہو کہ باوجود مختلف قسم کی اصلاحی کوشش کے ہماری تعلیمی بے اطمینانی کا باعث یہی ہے کہ ہم اس قسم کے اوصاف نہ اپنے اساتذہ میں پاتے ہیں نہ ان کی تخلیق کے لیے کوشاں ہوتے ہیں۔

اسلامی دور میں اساتذہ کا فرض تھا کہ وہ چند امور و آداب کا لحاظ رکھیں اور اپنے اندر مقررہ اوصاف پیدا کریں ورنہ وہ مسند استادی کے قابل نہیں رہتے تھے۔ استاد نہیں بن سکتے تھے۔ ان آداب و اوصاف کو غزالی، ابن خلدون اور دیگر اسلامی علماء نے اپنی تصنیفات میں جو عربی میں ہیں، مخصوص بابوں اور فصلوں میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ذرا ان اوصاف پر نگاہ ڈالیے

.رہ دیکھیے کہ ہمارے استادوں میں اگر یہ اوصاف موجود ہوں تو ان کے طلبہ تعلیم و تربیت میں کس قدر
بیں نشوونما حاصل کر سکتے ہیں اور قومی مستقبل کی تعمیر کس قدر نفیس ہو سکتی ہے۔ ذیل میں یہ اوصاف
یان کیے جاتے ہیں۔ ہر ایک وصف کا ساتھ ساتھ جائزہ لیتے جائیے۔ اگر کھاریات کی خاطر ملک بھر کے
ساتذہ میں ان اوصاف کی تلاش کا استفسار یہ بھیجا جائے تو شائد ہمیں ندامت ہو۔

۱۔ مذہب و اخلاق

سب سے پہلا اور بڑا اہم فرض ہر معلم کا خواہ وہ دینی علوم کی تعلیم دیتا تھا یا دنیاوی
ں، یہ تھا کہ وہ شریعت کا ہر طرح پابند ہو۔ اس کا کوئی عمل اسلامی شعائر و احکام سے گریزاں
رہو۔ کلام پاک کی روزانہ تلاوت اس کا شعار ہو۔ اور اس کلام کے معانی و مطالب پر غور و
وض کرنا اور امر و نواہی، وعدہ و وعید کو سمجھنا اور سمجھاتے رہنا اس کا وطیرہ ہو۔ یامرون
المعروف و ینھون عن المنکر اس کا اصول زندگی ہو۔ برائیوں سے روکے اور نیکیوں
ی تلقین کرے۔ مصائب و شدائد کا صبر و استقلال کے ساتھ مقابلہ کرے۔ صوم و صلوٰۃ کا پابند
ہو۔ اس کے دماغ میں کافرانہ نخوت نہ ہو۔ بلکہ اسلامی تواضع ہو۔ سلام کا متوقع نہ ہو بلکہ خود سلام
رنے میں پیش دستی کرے۔ شریعت مطہرہ کی روشنی میں اپنے ذاتی اخلاق کو منور کرے، اور
ندگی کو مجموعہ محاسن بنائے۔ غصہ کو پینے کی عادت ڈالے۔ خیرات و صدقات کا عامل ہو۔ اپنے
زور سوخ سے غریبوں اور بیکسوں کو فائدہ پہنچانے پر آمادہ ہو۔ کسی سے سختی سے پیش نہ آئے
رمصائب میں دوسروں کا ہمدرد ہو۔ حریص نہ ہو بلکہ قانع ہو۔ باطن صاف رکھے۔ بدظنی کی طرف
بھی مائل نہ ہو بلکہ ہمیشہ حسن ظن سے کام لے۔ شرم و حیا کا مجسمہ ہو۔ بے جا اور غیر شرعی رسوم و اعمال
ں منہمک نہ ہو۔ دل و دماغ میں جذبۂ اخلاص و یقین موجود ہو۔ رذیل قسم کے اخلاق سے قطعی
ہیز کرے۔ بغض و حسد کو دل میں جگہ نہ دے۔ کینہ پرور نہ ہو۔ غرور و تکبر نہ کرے۔ غیبت و چغل خوری کو
یسا سمجھے جیسے مردہ بھائی کا گوشت کھانا۔ ہمیشہ سچ بولے۔ کذب و افترا کی کمینہ عادات اس میں
ھر نہ کرنے پائیں۔ زبان سے کوئی فحش یا فضول لفظ نہ نکالے۔ ہزل پسند نہ ہو۔ ٹھٹھے مخول سے

پرہیز کرے حقیقت پر نگاہ رکھے۔ اپنے باطن کا نگہبان ہو۔ نمود و نمائش کا دلدادہ نہ ہو۔ منافق نہ ہو۔ حق گو ہو حق پسند ہو۔

بھلا جس استاد میں یہ خوبیاں ہوں وہ قوم کے لیے باعث ناز نہیں ہوگا تو کیا ہوگا۔ اب ذرا اپنے دور کے مدارس کے اساتذہ پر نگاہ ڈالیے اور جائزہ لیجئے کہ مندرجہ بالا اوصاف میں وہ کس وصف کے حامل ہیں۔ شریعت کی پابندی کا تو سرے سے دعویٰ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ کلام پاک کی تلاوت اور پھر اس کا سمجھنا تو ایک امر موہوم ہے۔ برائیوں سے روکنا اور نیکیوں کی تلقین کرنے کے فرائض کس طرح انجام پائیں گے۔ جب خود برائیوں میں کامیابی اور نیکیوں میں نقصان کا اعتقاد ہو مصائب و شدائد میں صبر و استقلال کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ جب ننگا ناچ، تیزی اور بے راہ روی کی راہیں کھلی ہوں۔ اسلامی تواضع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب عہدہ و مراتب، رعب و جلال کا قیام ہی کا فرانہ نخوت پر ہو۔ اس نخوت کی خاطر سلام ڈانٹ ڈپٹ اور زجر و توبیخ سے نہ خریدا جائے تو کیا ہو۔ خیرات و صدقات تو تب ہوں جب خود دست احتیاج دراز نہ ہو۔ قناعت کس طرح نصیب ہو جب سارا جہاں بڑھتا ہوا نظر آئے۔ کذب و افترا، حسد و بغض تو کامیابی اور خود داری کے ضروری عناصر ٹھہرے۔ ہزل و استہزا زندگی کا اہم عنصر قرار دیا جاتا ہے۔ فحش الفاظ کے بغیر اطاعت تلامذہ کے حصول کی کوئی صورت ہی نہیں۔ ایسی حالت میں بھلا تعلیم سے ہم اور کیا نتیجہ حاصل کر سکتے ہیں سوائے اس کے کہ اسی قسم کے قومی افراد پیدا ہوں جو جنگل خوریاں کریں۔ دھوکے دیں۔ برائیوں کو احیا میں نیکیوں کی تضحیک و تحقیر کریں۔ تشدد کو روا رکھیں، نخوت و تکبر سے کام لے کر ماتحتوں کا خون [illegible] جاہ و دولت رہیں۔ اور آخر دم تک ان کا طامع شکم سیر نہ ہو۔ بلکہ وہ دست احتیاج [illegible] مِن ھَل مِن مزید پھیلائے رکھیں اور رشوتیں لیتے رہیں۔ ہزل و فواحش سے جی بہلائیں نمود و نمائش سے اپنا وقار قائم رکھیں، بغض و حسد کو نوازیں۔ اور حق گوئی کو دبائیں اور چپکیں

اسلامی دور کے استاد کے فریضۂ اول کی پابندی ہمارے موجودہ معاشرے اور تعلیم کی ان تمام قباحتوں کو دور کرنے میں اکسیر کا کام دے سکتی ہے۔

۲۔احترام

پابندی شریعت و اخلاقِ حسنہ کے بعد اسلامی دور کے اساتذہ پر جو چیز فرض تھی وہ احترامِ علم تھا۔ ان کا فرض تھا کہ علم کا احترام کریں اور خود اپنے آپ کو بھی محترم بنائیں اور اس قسم کی تمام چیزوں سے گریز کریں جن سے علم کے وقار کو کسی قسم کی ٹھیس لگے۔ وہ اپنی صورت، وضع قطع، رہن سہن، طرز بود و ماند سلیقہ، سلوک، معاشرت اور لین دین اس قسم کا رکھیں کہ اس سے علم کا جلال ظاہر ہو، نہ کہ علم کی توہین یا تحقیر ہو۔ چنانچہ اس احترام میں انھیں یہاں تک پابند ہونا پڑتا تھا کہ کسی مجبوری یا مصلحت کے سوا کسی معلم کا کسی طالب علم کے گھر پر جا کر تعلیم دینا علم کے لیے کسرِ شان سمجھا جاتا تھا (اس میں مصلحت کی بنا پر خلفا کی اولاد اکثر مستثنیٰ رہی ہے) علم کی شان اس قدر بلند سمجھی جاتی تھی کہ اس کے طالب علم کے اس کے آستان تک پہنچنا ضروری تھا۔ نہ یہ کہ اس قدر و قیمت چیز اپنے طالب کے در پر پہنچے۔ چنانچہ امام زہری کا قول ہے کہ یہ علم کی تذلیل ہے کہ اسے اس کے طالب کے گھر خواہ وہ کتنا ہی عالی مرتبہ اور کیسی ہی دولت و وسعت کیوں نہ رکھتا ہو پہنچایا جائے۔ زرنوجی کے رسالہ تعلیم المتعلم سے پتہ چلتا ہے کہ اس احتیاج و تذلیل سے معلم کو محفوظ کرنے کی خاطر اسلامی دور کے دستور تعلیم میں معلم کے لیے دنیوی نمود و عزت و جاہ کو مقصد قرار دینا گویا بد ترین اخلاقی جرم قرار دیا جاتا تھا۔ امام شافعی تو نام و نمود سے اس حد تک گریزاں تھے، کہ فرمایا کرتے تھے۔ میری خواہش ہے کہ اہل عالم مجھ سے اس طرح علم حاصل کریں کہ ایک حرف بھی مجھ سے منسوب نہ ہو۔ اس احترام و وقار کو قائم رکھنے کی خاطر اساتذہ کے لیے بعض پیشے اختیار کرنا بھی ممنوع قرار دیے گئے تھے۔ مثلاً حجام، رنگ ساز دباغ اور صراف وغیرہ ہونا معلم کے لیے بدنما داغ تھا۔ ان پیشوں سے دور رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ پیشے عوام کی نظروں میں کم پایہ تھے۔ جو چیز عوام کی نظروں میں پہلے حقیر ہو، اس قسم کے پیشے والے انسان کی قدر و منزلت کا قیام دشوار ہے۔ چنانچہ اس قدر احتیاط منظور تھی کہ کسی نسبت سے علم یا عالم کم پایہ و حقیر نہ سمجھا جائے۔ اسی مقصد کے پیش نظر یہ بھی ہدایت تھی کہ معلم ایسے حالات سے بھی گریز کرے کہ اس کے متعلق کسی قسم کی بدگمانی یا تہمت کا موقع کسی کو میسر آئے، تاکہ

اور سنجیدگی کو بہت ضروری قرار دیا جاتا تھا۔ اور معلم کے لیے ہر اُس چیز سے پرہیز ضروری تھا جس سے اس کی متانت میں فرق آئے۔ متانت کے اثر سے معلم کی موجودگی میں کوئی بے حجابات نہیں ہو سکتی۔ امام مالک کے متعلق مشہور ہے کہ ان کی مجلس میں ان کی متانت و وقار کا اتنا اثر تھا کہ ذرا سا شور نہیں ہو سکتا تھا۔ اور کوئی بے جا آواز بلند نہیں ہو سکتی تھی۔

ذرا ان ضوابط پر نگاہ ڈالیے اور پھر اپنے زمانہ کے معلموں کی حالت پر غور کیجیے۔ زمین و آسمان دگرگوں نظر آتا ہے۔ احترام علم تو شاید ہی کہیں قائم ہو۔ البتہ علم کی توہین و تضحیک کے مناظر تو بہت نظر آئیں گے۔ ٹیوشنوں کا بے پناہ سلسلہ اور اس کے اسباب و مقاصد کا جائزہ لیجیے، تو تعلیم اچھی خاصی بنئے کی دکان نظر آتی ہے۔ گویا بے توجہ اور ناقدرشناس طالب علم کو لکھے سیر نام نہاد علم گھر پہنچ جاتا ہے اور معلم سے

وہ دن گئے کہ خدمتِ استاد کے عوض
جی چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجیے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجیے

کے مصداق اچھا خاصا ہوٹل کا انچارج یا دبا غ و عوام سے بھی گیا گزرا ایک چھا بڑی والے کے درجہ کے لگ بھگ ہستی معلوم ہوتا ہے۔ وقار کے قیام کی خاطر مواقع تہمت سے پرہیز کرنا الگ رہا، کتنے ہیں جو تہمتوں سے محفوظ ہیں یا ان کی پروا کرتے ہیں۔ متانت تو بہت دور کی چیز ہے۔ جہاں لغو گوئی، بڑیں ہانکنا اور ہزل و مذاق شعار ہو جائے اور اس کا نام آزاد منشی رکھا جائے تو وہاں علم کے صحیح اقتدار کی تلاش کس طرح ہو سکتی ہے۔

۳۔ توسیع و تبلیغ علم

تیسری چیز جو اسلامی دور کے اساتذہ پر فرض قرار دی گئی تھی وہ توسیع و تبلیغ علم تھی۔

تصنیف و تالیف کے ذریعے اس علم کی تبلیغ و توسیع کرتے رہیں۔ ان کے نزدیک عالم اسی وقت تک عالم تصور کیا جا سکتا تھا، جب تک کہ وہ طلب علم میں کوشاں ہے۔ مطالعہ نہ کرنیوالا ان کے نزدیک جاہل تھا۔ پڑھنا ترک کر دینا اور سمجھ لینا کہ جو کچھ علم حاصل ہو چکا ہے کافی ہے اور اب مطلقاً بے نیازی حاصل ہو چکی ہے جہالت کے مترادف تھا۔ توسیع علم کی خاطر علمائے اسلام نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور وہ اس بات کو باعث حقارت نہیں سمجھتے تھے کہ اپنے سے کم تر درجہ کے آدمی یا کم عمر لوگوں سے علمی فائدہ اٹھائیں، وہ اس استفادہ کے لیے بیتاب رہتے تھے اور ہر اُس ہستی کی قدر کرتے تھے جس سے انھیں اس قسم کا استفادہ ہو۔ توسیع علم کی خاطر اور امتحان علم کے لیے ان میں مذاکرہ و مناظرہ کا خوب رواج تھا۔ مذاکرہ و مناظرہ میں ہر طرح سے عہدہ برائی استاد پر فرض تھی، ورنہ اس کی خفت ہوتی۔ تصنیف و تالیف کا فرض جو اساتذہ پر عاید تھا، اس کے چند لوازمات بھی تھے، جن کا پورا کرنا ضروری تھا۔ تصنیف و تالیف کی استعداد، حقائق کی تفتیش اور اس کی خاطر وسیع مطالعہ، غور و فکر کی عادت، قوت انشاء، بحث و تکرار، توجہ و خلوت اور سائل و مباحث کا پورا علم۔ ظاہر ہے کہ تصنیف و تالیف کے فرض کو نباہنے کے لیے ان لوازمات کی تکمیل معلم کو کس پائے کا محقق بنا دیتی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے تقریباً ہر معلم کی تصنیف سے آج کے ارباب علم انگشت بدنداں ہیں تصنیفی استعداد کی انتہا کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ کئی کئی اساتذہ نے کئی کئی سو رسائل و کتب تصنیف کر ڈالیں اور ہر ایک کتاب معتبر درجہ حاصل کر گئی۔

دور حاضر کے معلمین کا ذرا اس نقطۂ نگاہ سے بھی جائزہ لیجیے۔ طلب زر کی خاطر خلاصوں اور معمولی درسی انتخابوں کے مصنف تو شاید ان میں اکثر نظر آئیں۔ لیکن تحقیقی و تدقیقی علمی تصانیف خال خال نظر آئیں گی۔ اور وہ بھی یہ کہ اگر ایک دو تصنیفیں ایسی کی جا چکی ہیں تو گویا علامۃ العصر اور نہایۃ الدہر ہو گئے۔ اب ان کے پائے کا کوئی آدمی نہیں۔ اساتذہ اس کام کو فرض نہیں سمجھے ورنہ شاید موجودہ دور میں لائبریریوں کے اعلیٰ انتظامات کے باوجود اساتذہ کی طرف سے علمی کتب کی پیداوار میں قحط نظر نہ آتا۔ اور شاید یہ بھی وجہ ہو کہ اب معلمی کی شرائط میں یہ چیز داخل نہیں جس زمانے میں معلمی کی

شرائط میں تصنیف و تالیف شامل تھی، اِس زمانے میں شاید آج کی طرح دنیا کے باقی تمام کاموں کا داماندہ معلمی کے پیشہ کو اختیار کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ بلکہ اِس میدان میں وہی گردے والے ہی اترتے ہوں گے۔ آج کل معلمی آسان ترین کام ہے اور تصنیف و تالیف اِس سے بھی آسان تر کیوں کہ ان میں سطحی معلومات کی ضرورت ہے۔ دقتِ نظر کی نہیں انتخابات و اقتباسات کو جمع کرکے پیش کرنے کی ضرورت ہے اختراع کی نہیں۔ پرانے خیالات کو نیا جامہ پہنا دینا ہی اُپج اور جدت ہے۔ لیکن باوجود اِس کے بہت کم معلّم مصنف نظر آتے ہیں۔

۴۔ پابندیِ وقت

چوتھی چیز جو اساتذہ پر لازم تھی وہ یہ تھی کہ اپنا ایک باقاعدہ لائحہ عمل تیار کرکے انتہائی خلوص و پابندی کے ساتھ اسے نباہتے رہیں اور اِس لائحہ عمل کے سلسلے میں اتنے محتاط رہیں کہ کوئی سلسلہ منقطع نہ ہونے پائے۔ پابندی شرع میں کبھی خلل نہ آئے۔ صوم و صلوٰۃ باقاعدہ ادا ہوتے رہیں۔ پڑھنے پڑھانے میں بھی باقاعدگی رہے۔ تصنیف و تالیف کا کام کبھی نہ رکے اور غور و خوض، فکر و تدبر کے لیے بھی لمحات فرصت میسر آتے رہیں اور کسی ایسی قسم کی مصروفیتیں اختیار نہ کریں، جن سے اس لائحہ عمل میں نقص آئے۔ چناں چہ خورد و نوش، خواب و استراحت اور غیر علمی مشاغل میں وہ بہت ہی کم وقت صرف کرتے تھے۔ امام شافعی کے متعلق مشہور ہے کہ انھیں دن کے وقت کھاتے اور رات کے وقت سوتے ہوئے کم دیکھا جاتا تھا۔ ان کا زیادہ وقت تصنیف میں صرف ہوتا تھا۔ امام محمد بن حسن رات کا زیادہ حصہ جاگتے۔ پانی کا پیالہ بھر کر رکھ لیتے۔ نیند آنے لگتی تو منہ پر چھینٹے مارتے اور مسائل حل کرتے رہتے اور کہتے کہ "یہ لذتیں شاہزادوں کو کہاں نصیب ہیں"۔ آج کل تعلیم کے علاوہ علمی مشاغل تو درکنار خود تعلیم کے وقت کی پابندی بھی اساتذہ پر بار سی معلوم ہوتی ہے۔ البتہ خورد و نوش اور غیر علمی مشاغل کے لیے اوقات کا بیشتر حصہ صرف کرنے میں کسی کو دریغ نہیں ہوتا۔

۵۔ خلوص :- پانچویں چیز جس پر زیادہ زور دیا جاتا تھا وہ خلوص تھا۔ پڑھنے پڑھانے میں

اور تصانیف میں۔ استاد پر فرض تھا کہ جو کچھ پڑھائے نیک نیتی سے پڑھائے۔ یعنی موضوع تعلیم پر خود پوری طرح سے پہلے بذریعہ مطالعہ حاوی ہو جائے۔ تاکہ اس کا کوئی حصہ تشنۂ تکمیل نہ رہے۔ پھر مکمل علم خلوص کے ساتھ طلبہ تک وضاحت سے پہنچائے۔ اور کوئی چیز اس موضوع کے سلسلے میں بخل یا تکبر کی بنا پر طلبہ سے مخفی نہ رکھے، بلکہ سب کچھ ان تک پہنچا دے اور بخل و تکبر کی بد عادات کا مرتکب نہ ہو۔ تصنیف و تالیف میں بھی خلوص سے کام لے۔ ایسے موضوع پر قلم اٹھائے جس پر خود پوری طرح حاوی ہو اور پھر خوب وضاحت کے ساتھ کسی چیز کو چھپائے بغیر خلوص کے ساتھ لکھے۔ بعض مختلف فیہ یا متنازع فیہ نکات کو مصلحتاً نظر انداز کرنا بُرا نہ تھا۔ لیکن کسی ضروری امر کو اس لیے چھپانا کہ اس کے لیے وہ صرف خود ہی آشنا رہیں۔ نا جائز بلکہ گناہ قرار دیا جاتا تھا۔ یہ بھی استاد پر لازم تھا کہ موضوع پر پورے طور پر حاوی ہونے کی خاطر اسے مصائب برداشت کرنا پڑیں اور سفر کی زحمت اٹھانی پڑے تو اس سے گریز نہ کرے۔

زمانِ حال میں تو تعلیم و تعلم میں اس قسم کا خلوص بہت کم پایا جاتا ہے۔ موضوع تعلیم پر حاوی ہونا اور بذریعہ مطالعہ اس کے تمام نکات سے آشنا ہونا تو درکنار اس موضوع کا سطحی علم بھی کم ہوتا ہے اور اسی سطحی علم کو لفاظی کے ساتھ طلبہ کے اذہان پر اس طرح ٹھونسا جاتا ہے کہ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔ یا اگر کچھ پتے پڑے تو یہ کہ ع۔ جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی۔ کسی موضوع کے متعلق اول تو مکمل علم دینا ہی ممکن نہیں کیوں کہ خود استاد کو مکمل علم پر یقین نہیں یا وہ اپنے مکمل علم کی حقیقت سے آشنا ہے۔ لیکن اگر کہیں واقعی مکمل علم ہو بھی سہی تو سب کچھ بتا دینا گویا کشتی کے سب داؤ پیچ حریف کو بتا دینا ہے۔

۶ - طلبہ سے شفقت

اساتذہ پر سب سے اہم فرض جو تعلیم کے خاص فرائض میں سے ہے یہ تھا کہ وہ طلبہ سے مشفقانہ سلوک رکھیں۔ استاد کی حیثیت روحانی باپ کی سی تھی اور اس کا تعلق طلبہ سے شفقت و محبت کا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ طلبہ کو ہر طرح کی آزادی تھی۔ اور انھیں غلط شعاری پر

کسی قسم کی تنبیہ نہیں ہوتی تھی۔ نہیں بلکہ استاد شفیق باپ کا سا سلوک کرتا تھا۔ جہاں تنبیہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ مناسب طریق پر تنبیہ بھی کرتا تھا۔ لیکن یہ تنبیہ اکثر اوقات اشاروں اور کنایوں سے ہوتی۔ جب زیادہ وضاحت کی ضرورت ہوتی تو صریح الفاظ میں تنبیہ کی جاتی۔ استاد کا فرض تھا کہ طلبہ کے اخلاق کی کڑی نگرانی کریں۔ اور طلبہ کے اخلاق سکھانے کا سب سے بہترین طریق یہی تھا کہ استاد اخلاق کا بہترین نمونہ تھا۔ اس کی ساری زندگی حسنِ اخلاق کے سانچے میں ڈھلی تھی۔ اس لیے ہر کام میں استاد کا طرزِ عمل طلبہ کی ہدایت کرتا جاتا۔ کسی طالب علم کا حلقہ درس سے غیر حاضر ہو جانا استاد کے لیے باعث تشویش ہوتا۔ اس کا فرض ہوتا کہ اس کی غیر حاضری کا صحیح سبب معلوم کرے۔ بیمار ہو تو اس کی عیادت کو جائے۔ کوئی عزیز فوت ہو گیا ہو تو تعزیت کو جائے۔ اور اگر کسی اور قسم کا حادثہ ہوا ہے تو مناسب طور پر ہمدردی کا اقدام کرے۔

استاد کا یہ بھی فرض تھا کہ طالب علم کی تمام قسم کی ضرورتوں کا خیال رکھے اور اپنی استطاعت کے مطابق اس کی امداد کرے اور تمام قسم کے ایسے موانعات کو دور کرنے کی کوشش کرے جو طالب علم کی تعلیمی کوشش میں حائل ہوں۔ تاریخ میں بے شمار مثالیں ہیں کہ طلبہ کے افلاس اور کس مپرسی کی حالت میں استادوں نے ان کی پوشیدہ مالی امداد بھی کی اور پڑھایا بھی اور اس سلسلہ میں کسی قسم کا ڈھنڈورا اپنی سخاوت واستادی کا نہیں پیٹا۔

طلبہ پر سختی کرنا کسی طرح روا نہیں تھا کیونکہ سختی کو تربیت کے لیے سخت مضر خیال کیا جاتا تھا۔ اور اس سے کاہلی، سستی، کندذہنی اور سزا سے بچنے کی خاطر جھوٹ، نفاق اور مکر و فریب کی سی بد عادات پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ تادیب میں جبر و استبداد کا طریقہ ممنوع تھا۔ اور بقول امام غزالی استاد کا فرض تھا کہ طالب علم کو بداخلاقی سے اشاروں اور کنایوں سے ہر ممکن حد تک روکے۔ اور مہربانی کا طریق اختیار کرے۔ اور اس وقت تک تصریح سے کام نہ لے جب تک کہ باقی تمام تدابیر بے اثر ثابت نہ ہوں۔ ڈانٹ ڈپٹ اور تصریح سے ہیبت جاتی رہتی ہے اور مخالفت پر طبیعت آمادہ ہوتی ہے۔

مقصد تو یہ ہے کہ طالب علم میں حسن تربیت پیدا ہو، اس کے اخلاق سنوریں اور اس کی حالت درست ہو۔ نہ یہ کہ مخالفت کی بنا پر وہ گندہ عادات کی طرف مائل ہو۔

استاد کی زبان پہ غیر مہذب الفاظ سرزنش کے طور پہ آنا جرم عظیم تھا۔ استاد کی ہیبت اور اس کا وقار اس بات کی مطلق اجازت نہیں دیتا تھا۔ کہ اس کی زبان تہذیب کے معیار سے گرے یا بُرے الفاظ اس سے نکلیں۔

اسلامی دور کے اساتذہ کے یہ آداب و فرائض اگر زبانِ حال کے اساتذہ پر بھی عائد ہوں اور وہ خلوص کے ساتھ ان کی پابندی کریں تو ہماری تعلیم کے اکثر نقائص دور ہو جائیں اور طلبہ کی بہترین اخلاقی سانچوں میں ڈھلیں۔ لیکن غلامانہ دور کی پیدا کردہ بھوک اور افلاس نے استاد کو اس قدر حریص پیسے کا بندہ اور کام چور بنا دیا ہے کہ ان آداب کے ذکر پر وہ صرف ہنس ہی دے گا اور اگلے وقتوں کے ناقابل توجہ خیالات سے زیادہ اسے کچھ وقعت نہیں دے گا۔

ضعف نے غالب نکما کر دیا

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان آداب و فرائض سے اسلامی مدارس کے اساتذہ کی وہ اخلاقی بلندی نظر آتی ہے جس تک مغربی متمدن اقوام کے اساتذہ بھی کیا پہنچیں گے۔

☆

نظم و ضبط اور جمہوریت

محمد عبد العزیز

سیاسی اعتبار ہی سے نہیں ذہنی اور فکری لحاظ سے بھی ہم ایک عبوری دور سے گذر رہے ہیں اور آج پرانے ایوانِ فکر کو ڈھا کر جدید ادارۂ فکر کی تاسیس و تشکیل کا مسئلہ ہمیں زندگی اور اس کے حقائق کے سمجھنے اور سمجھانے کی دعوت دے رہا ہے اور یہ کش مکش اس لیے جاری ہے کہ قدیم معاشرتی تقاضے ہماری موجودہ رفتارِ ترقی کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس لیے منزل تک پہنچنے کے لیے نیز گام ہو کر ہمیں ترقی پسندی کی راہوں کو جگمگانا ہوگا۔ ورنہ ہم اپنی تنگ نائے سے نکل کر زندگی کی وسعت اور اس کی ہمہ گیریوں کا کبھی جائزہ نہیں لے سکیں گے۔

یہ فکری تبدیلیاں بعض اوقات زندگی کو حقائق امروز فردا کے شعور و وجدان سے بھی ماورا لے جاتی ہیں۔ لیکن ان کی رفتار اتنی تیز اور ان کی منزل اتنی مختلف ہوتی ہے کہ وحدتِ فکر اور یکسانیٔ کار کے سوا کم اور زیادہ ہوتے رہتے ہیں جس سے ذہنی افلاس اور سماجی تعطل پیدا ہونے کا اندیشہ بھی لاحق رہتا ہے۔ آج اس معاشری اور سماجی انقلاب کا اثر زندگی کے مختلف شعبوں پر پڑ رہا ہے اور اس ہمہ گیری کے نقوش مرتسم کر رہا ہے۔ اس سے ہمارے مدرسے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ کیونکہ ہماری سماجی زندگی کا مرکز مدرسہ ہوتا ہے۔ فیضان کے سرچشمے یہیں سے پھوٹتے ہیں۔ قوم کی تعمیر و تخریب کی بنیاد کی خشتِ اول یہیں رکھی جاتی ہے اور معاشرے کو بنانے یا بگاڑنے کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ اس لیے اگر مدرسے میں آزادیٔ فکر اور آزادیٔ عمل کے مواقع نہ ہوئے تو ملک و قوم کے سیاسی اور اقتصادی بقا کے امکانات ضعیف ہو جاتے ہیں۔ اس سے صرف ترقی کے راستے ہی مسدود نہیں ہو جاتے زندگی کی بالیدگی اور توانائی بھی ختم ہو جاتی ہے اور ایک گھٹے ہوئے ماحول میں

شیروں کا روباہ مزاج ہو جانا بھی کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔

ہمارا ملک ایک جمہوری ملک ہے جس کے دستور کو قرآن و سنن نبوی کی روشنی میں مرتب کرنے کے وسائل کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ ان حالات میں ہماری ذمہ داریاں اور بڑھ جاتی ہیں جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انسانی زندگی کا تابع نظم و ضبط ہونا از بس ضروری ہے۔ وہ معاشرہ جس میں نظم و ضبط کا فقدان ہو، زندگی کے سوز و ساز سے یکسر خالی ہوتا ہے، اور انتشار سماج کی یک جہتی کو کچھ اس طرح توڑ دیتا ہے کہ ہم زندگی سے بہت دور تخیل و تصوّر کی ایک موہوم دنیا میں قلابازیاں کھاتے رہتے ہیں اور بے کار محض ہو کر سماج کو تباہ کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اس لیے تمدن کے اس بنیادی اصول سے اگر مدرسوں ہی میں اغماض برتا گیا تو قوم کی ترقیوں کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

جمہوری نظام

کسی جمہوری نظام کی بنیادوں کو مضبوط اور استوار بنانے کے لیے اچھے کارکنوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیوں کہ یہی کارکن اپنے اشتراک عمل اور تعاون کار سے اس جمہوری معاشرے کو ترقی دے سکتے ہیں یہ ان کی اپنی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس لیے اگر یہی کارکن جو دراصل اس عمارت میں چونے گارے کا کام دیتے ہیں۔ اس احساس سے خالی ہوں تو جمہوری افکار حیات کی تربیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس معاشرے میں اگر ہمیں کچھ حقوق حاصل ہیں تو ہماری کچھ ذمہ داریاں بھی ہیں۔ اگر ہمیں آزادی فکر اور آزادئ عمل حاصل ہے تو دوسروں کے احساسات کا احترام بھی ہمارا فرض ہے۔ ہمیں اس سے مفر نہیں۔ اور اگر ہم اس سے بیگانہ ہو کر محض اپنی ذات کو مقدم رکھنا ہی ہمارا شعار ہو گا تو ہم معاشری فلاح کو اپنے ذاتی مفاد پر کبھی ترجیح نہ دے سکیں گے۔ لیکن یہاں قومی اور اجتماعی مفاد کے پیش نظر ہمیں اپنی خواہشات کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ اور یہی ایثار یا قیود اور پابندیاں جو دراصل اجتماعی مفاد کے لیے ہم اپنی ذات پر خود عائد کرتے ہیں نظم و ضبط کہلاتی ہیں

مفہوم

مدرسوں میں نظم و ضبط کا مفہوم ہمیشہ بدلتا رہا۔ پرانے اور روایتی مدارس میں آج بھی

نظم و ضبط سے مراد سکوت اور خاموشی ہوتی ہے جس میں طلبا کا مدرس کے سامنے دم بخود ہو کر بیٹھنا اور اس کے اشارۂ چشم و ابرو کے مطابق ہی نقل و حرکت کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ایک ایسے ماحول میں مدرس، معلم نہیں، آمر کی حیثیت سے محض اپنے احکام کی پابندی کراتا رہتا ہے اور اسی پہ سر دھنتا رہتا ہے۔ یہ ایک ظن بے جا ہے کہ بچے کی ذاتی صلاحیتوں کو بالکل فراموش کر کے اسے ناکارہ بنا دیا جائے۔ لیکن صدیوں سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے اور مدرسین کا ایک بڑا طبقہ آج بھی اسی کلیے پہ عمل کر رہا ہے مگر کسی جمہوری نظام میں بچوں کی تخلیقی قوتوں کو اس طرح برباد کرنا فی الواقع اس قوم کی ہیئت ترکیبی کے اجزا کو منتشر کر دینے کے مترادف ہے۔ اس میں قصور متعلم کا کم مدرس کا زیادہ ہے اور ایک ماہر تعلیم کے الفاظ میں "اے طبیب پہلے تو آپ اپنا علاج کر، اپنے دل و دماغ سے ان پردوں کو ہٹا جو تجھے بچے کی شخصیت کی صحیح تشخیص سے دور رکھتے ہیں"

مدرس کی ایک تھوڑی سی غفلت سے بچے کی زندگی کے تباہ و برباد ہو جانے کا ہر وقت خطرہ رہتا ہے۔ مجھے خود اس قسم کے ایک ایسے واقعے کا علم ہے جس میں مدرس کے موہوم تصورات کے بے جا تصور نے ایک بچے کو ایسا برباد کیا کہ وہ آگے چل کر نظم و ضبط سے گریزاں ہی نہیں، ننگ معاشرہ بن گیا۔ حالاں کہ مدرس اگر ذرا محبت و خلوص اور ہمدردی سے کام لیتا تو جو بُرے نتائج اس ضمن میں پیدا ہوئے وہ یقیناً نہ ہوتے۔ اس کی تیزی طبع کو مدرس نے اپنے مبلغ علم پہ ڈاکہ سمجھا۔ اس کے استفسارات کو اس نے بے ادبی پہ محمول کیا۔ اس کے تبسم کو اس نے طنز و تشنیع گردانا۔ اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں اس نے شرارت کی جھلک دیکھی۔ ان خیالات سے مدرس کا ذہنی توازن قائم نہ رہ سکا۔ اس نے بچے کو ڈانٹا، اسے بُرا بھلا کہا۔ اسے ایک ایک بات پہ مطعون کیا۔ اس کی اچھی بات کو بُرا سمجھا۔ اور اگر یہ بات محض بات کی حد سے آگے نہ بڑھتی تو شاید نتائج اتنے خراب نہ ہوتے۔ لیکن تنبیہ کے لیے ایک دن اسے اتنا مارا گیا کہ اس نے اس بُرے سلوک کے خلاف آوازۂ احتجاج بلند کیا۔ یہ احتجاج

اس کا دوسرا جرم تھا۔ اس سے اسے مزید جسمانی سزا ملی۔ اس سزا کا ردِ عمل یہ ہوا کہ اسے تعلیم سے، مدرس سے اور مدرسے سے ایسی نفرت ہو گئی کہ اس نے مدرسے جانا ہی چھوڑ دیا۔ اور سمجھانے بجھانے کے باوجود اس نے اپنے اسی فیصلے کو ناطق سمجھا۔ وہ مدرس آج بھی اسی جبروت و طنطنہ کے ساتھ مصروفِ کار ہے۔ شاید بچوں کی زندگی کی اصلاح میں۔ لیکن غالباً اسے یہ احساس نہیں ہے کہ اس نے ایسی زندگی کو نذرِ حوادث کر دیا ہے جو مستقبل میں ہمارے لیے زیادہ مفید ثابت ہو سکتی۔

عدمِ انتشار

بعض مدرسین کے نزدیک نظم و ضبط کا مفہوم عدمِ انتشار ہوتا ہے یعنی جماعت میں ایک ایسی فضا پیدا نہ ہونے پائے جو مدرسی نظام ہی کو درہم برہم کر دے۔ نظم و ضبط کا یہ مفہوم نظری اعتبار سے تو درست ہے لیکن اس نظریے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے فکر و عمل کی وسعت کی ضرورت ہے۔ جماعت میں عدمِ انتشار سے بچنے کے لیے مدرس کی اپنی ذات ہی سب سے بڑی معاون و مددگار ہوتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ مدرس کس طرح، اور کس عنوان سے اپنے اقتدار کو قائم کرتا ہے اور کس طرح جماعت میں اتنا نظم و ضبط پیدا کر لیتا ہے کہ بچے آمادۂ کار ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ بچہ طبعاً گریز پا ہوتا ہے۔ اگر اسے جماعت میں نظم و ضبط کے توڑنے کا موقع مل جائے تو وہ اس سے احتراز نہیں کرتا۔ بلکہ اس سے فائدہ اٹھا کر ایک شور ہائے ہو برپا کر دیتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے اچھے یا برے؟ اس کے سوچنے کی اسے فرصت کہاں۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے، اس کی ایک وجہ تو بچے کے کردار کی ناپختگی ہے اور دوسرے اس عمر میں وہ طبعاً فعال ہوتا ہے۔ اسے کچھ بولنے اور کچھ کرنے کے مواقع حاصل ہوں وہ زیادہ دیر تک بندھ کر نہیں بیٹھ سکتا۔ پچھلے دنوں وارویک شائر ٹیچرز ایسوسی ایشن (انگلستان) نے نظم و ضبط پر توسیعی تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا جس میں مختلف اساتذہ نے حصہ لیا۔ ایک نشست میں ایلن ڈیل نے ایک تقریر کی۔

موضوعِ تقریر یہ تھا۔ جماعت میں نظم و ضبط' ڈیل خود مدرس ہے۔ اس نے نظم و ضبط کے اس مفہوم کو اپنے تجربات کی روشنی میں کچھ اس طرح بیان کیا کہ اس سے لوگ بہت ہی زیادہ متاثر ہوئے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ میں کس طرح پڑھاتا ہوں کس طرح لڑکوں سے برتاؤ کرتا ہوں طلبہ کا ردِّ عمل کیا ہوتا ہے۔ اور مختلف حالات میں ان کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوں۔ اس کے خیال میں اچھے نظم و ضبط کے لیے مدرس کا اپنے اعمال و کردار میں متوازن اور مستقل رہنا ضروری ہے۔ طلبہ غلطیاں کر سکتے ہیں، بلکہ غلطیاں کرنا ان کا خاصا ہے۔ اور مدرس کا کام انہی غلطیوں کا درست کرنا اور ان خرابیوں کو دور کرنا ہے۔ جو بچے میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات اسکی غلطی پر اسے ٹوک دینا اچھا ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات اس کی حرکت پر جسے مدرس بے جا اور غلط سمجھتا ہے۔ آنکھیں بند کر لینا مناسب ہوتا ہے۔ اگر بچوں کو اس میانہ روی سے چلایا گیا تو وہ زندگی کی ماہیت کو سمجھنے میں صبر و ہمت سے کام لے کر اپنی زندگی کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال سکیں گے جو اسے منزل آشنا بنا سکے ورنہ ان کے بگڑ جانے کا امکان قوی ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں مجھے ایک متعلم کا ذاتی تجربہ ہے۔ یہ خود بہت ذہین اور تیز طرار ہے۔ لیکن کسی جگہ خاموشی اور سکون کے ساتھ بیٹھ کر کام کرنا اس کے بس کا روگ نہیں۔ میں ایک مرتبہ اس پر برہم بھی ہوا۔ اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش بھی کی۔ لیکن اس پر میری باتوں کا کوئی خوش گوار اثر نہ ہوا۔ اب مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ اسے تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں اور محض تفنن طبع کے لیے یہاں آتا ہے۔ میں نے اس امر پر مزید سختی کا فیصلہ کیا اور اپنے پچھلے فیصلے پر نظر ثانی کی۔ دو چار دن تک تو میں نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی، نہ اس سے تعرض کیا اور نہ اس سے کوئی سوال پوچھا نہ اسے برا بھلا کہا اور نہ اس کو تھپتھپانے کی کوشش کی۔ وہ بھی جماعت میں دم بخود بیٹھا رہا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے یارائے گفتگو نہیں۔ یا کچھ بولنا چاہتا ہے تو بولنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہ نگاہیں اوپر اٹھاتا اور پھر خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ جاتا۔ اس کی ذہنی کشمکش دو تین دن تک جاری رہی۔ لیکن میں ایسا بے پروا ہوا جیسے مجھے کچھ علم ہی نہ ہو۔ یہ متعلم

ایک عمدہ کھلاڑی بھی ہے۔ اس کی اس ذہنی کشمکش کے ایام میں ایک روز دوران تدریس میں کھیل کا ذکر آیا تو میں نے اس سے دریافت کیا۔ "احمد تم نے کھیل میں کیا سیکھا؟" میرے لہجے میں قدرے تلخی تھی اس نے جواب دیا "صبر" اس کی نگاہیں نیچی تھیں اور اس کے بعد اس نے مزید کچھ نہ کہا۔ اس کے اس جواب سے میں بہت ہی متاثر ہوا۔ اسی دن چھٹی کے بعد میں نے اس سے علاحدہ بات چیت کی وہ سہما سہما میرے پاس آیا۔ دو چار باتوں ہی کے بعد اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور وہ کچھ نہ کہہ سکا میں نے اس کی ڈھارس بندھائی اور جب اسے یہ احساس ہوگیا کہ میرا مقصد اسے مزید سزا دینا نہیں بلکہ اس کی پریشانیوں میں اس کا ساتھ دینا ہے تو اس نے کھل کر اپنی دقتوں کو بیان کیا اور کہا "چوں کہ جو کچھ آپ پڑھاتے ہیں بنیادی طور پر یہ چیزیں مجھے نہیں آتیں، اس سے سبق میں اپنی دلچسپی کو قائم نہیں رکھ سکتا" میں نے اسے تسلی دی اور سمجھایا کہ "یہ تو کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ تم بہت جلد اپنی دقت پر قابو پالو گے" اور محض دو ماہ کی علیحدہ تدریس سے احمد اپنے ساتھیوں کے برابر آگیا۔ اب وہ بالکل بدل گیا ہے شوخ و شنگ ضرور ہے لیکن مودب اور سلیقہ شعار۔

تدریس

جماعت میں نظم و ضبط کا انحصار بالعموم اچھی تدریس پر ہوتا ہے۔ اگر مدرس سبق کو اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ اس میں طلبہ کی دلچسپیاں قائم رہتی ہیں۔ ان کے ذوق معلومات کو خوراک ملتی ہے تو ان کے منجمد ذہنوں میں خود ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور وہ سبق کے ساتھ آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس مدرس کا انداز بیان غیر دلچسپ، بھونڈا اور اس کی زندگی سے غیر مربوط ہوگا تو مدرس کی کوشش کو کند ذہن کا دکھاوا دردن سے زیادہ وقیع نہ ہو گی۔ مدرس کی تدریس ہی نظم و ضبط کی ضامن ہوتی ہے۔ اور یہی نظم و ضبط ایک ایسی چیز ہے جس کی ہر مدرس کو اپنی جماعت میں ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔ بلکہ یہی اس کی متاع اور اس کا سرمایہ ہوتا ہے۔ اس کے مقصد کے حصول کے لیے مدرس کو جس تدریسی تکنیک کی ضرورت ہوتی ہے اس سے قطع کہ جماعت میں مدرس کا کامیاب ہوجانا ممکن نہیں اور یہ تکنیک اچھی تدریس کے سوا

ں نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے اس کا براہ راست تعلق مدرس کی ذات اور
میت سے ہے۔ آیا وہ طلبہ کی زندگی میں حرارت اور سرگرمی عمل پیدا کر سکتا ہے یا نہیں
نہیں متاثر کر سکتا ہے تو اس کی تکنیک کامیاب اور اگر اسے اس میں کامیابی
تی تو اس کی تدریس ناکافی یا دور از کار ہوتی ہے۔

سپیرا اپنی بین بجا کر سانپ کو رام کر لیتا ہے۔ اس کی خوش آئند دھن سانپ کو مبہوت
ہے، وہ جھومتا ہے، ناچتا ہے اور سپیرے کے قدموں پر لوٹنے لگتا ہے اور یہ انسان
پنی فطرت کو بھول کر سپیرے کے افسوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس بے خودی کے عالم میں
اس سے وہ کچھ کام لیتا ہے جن کی عام حالات میں توقع نہیں ہوتی مدرس کی حیثیت بعینہٖ
یرے کی سی ہوتی ہے۔ اس لیے اگر ایک زہریلا جانور جو انسانی فہم و فراست سے عاری
سان کی سحر آفریں تانوں سے متاثر ہو جاتا ہے تو پھر عقیل و فہیم بچوں کو اپنی تدریس سے متاثر
مشکل نہیں۔ ضرورت صرف بچوں کی فطرت، ان کی ذہنی سطح اور ان کے کردار و عمل کو سمجھنے
۔ اگر مدرس اس کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اگلی منزلیں آسان سے آسان تر ہو جاتی

ے کی ضرورت

پنی ایک تقریر میں ڈاکٹر الکزنڈر نے نظم و ضبط کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بیان
و ضبط کے مختلف پہلو مختلف انداز میں طلبہ اور مدرس کی زندگی پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں
ے ہر شخص اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے اچھا یا برا سمجھ سکتا ہے یا بنا سکتا ہے۔ لیکن میرے
ں نظم و ضبط کا مفہوم صرف جماعت میں بچوں کو تدریس کے لیے خاموش رکھنا نہیں ہے۔
ایک "معاشری ضرورت ہے" اور معاشرے کو حق ہے کہ وہ ہم سے اس کی صحیح تربیت کا
کرے۔"

نظم و ضبط فی الواقع ایک معاشری اور قومی ضرورت ہے۔ جمہوریت کی بقا کے لیے نظم و ضبط

اصلاحِ حال کی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے جتنی ہمیں اپنی زندگی کی بقا کے لیے خوراک کی ضرورت
ہوتی ہے۔ اگر انسان کو ایک دن خوراک نہ ملے تو موت و زیست کی کشمکش میں گرفتار ہو کر زندگی
کی اعلیٰ اقدار کو کھو سکتا ہے۔ اس لیے طلبہ کو نظم و ضبط کا پابند بنا کر اصولی طور پر اس کی تربیت
نہیں اس کی ذمہ داری کا احساس دلا سکتی ہے۔ ورنہ معاشرے کو اپنے ہر رکن سے جن اوصافِ
حمیدہ کی توقع ہے وہ ان میں ناپید ہوں گے، اور وہ معاشرے کے لیے ایک مصیبت بن جائیں گے۔
اس لیے تعلیم گاہوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے طلبہ کو زندگی کے اس پہلو سے بھی روشناس
کریں کیوں کہ وہ دنیا جو مدرسے کی فضا سے دور شہر اور ہنگامہ آرا ماحول میں ہے، اس سے بالکل مختلف
ہے۔ اگر آج وہ ان ذمہ داریوں کو محسوس کر کے ان پابندیوں کو اپنی زندگی کا جزو نہیں بنائیں گے
تو وہ اپنے سماج کی کوئی معتدبہ خدمت نہیں کر سکیں گے۔

نظم و ضبط کا یہ مفہوم اور ذمہ داری کے احساس کا یہ نظریہ اہم بھی ہے اور وسیع بھی۔ اور
اس کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ایک جدید جمہوریت کے لیے اس کی سب سے زیادہ ضرورت
ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں ابھی صحیح جمہوری فضا قائم نہیں ہو سکی اور اس کے لیے ابھی ایک
طویل مدت درکار ہے۔ اس لیے ایک جمہوری نظام کو صحیح خطوط پر چلانے کی خاطر نظم و ضبط کی ضرورت
اور شدید ہو جاتی ہے اور اس کے ایک ایک فرد کا اجتماعی فلاح کے پیشِ نظر اپنی ذات کو رضاکارانہ
طور پر نظم و ضبط کا خوگر بنانا ضروری ہے۔ ہمارا ایک غلط اقدام۔ ہماری ایک قانون شکنی ہمیں برسوں
پیچھے ہٹا سکتی ہے اور زمانہ اس تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے کہ ہم اس کا اس وقت ساتھ
دے سکیں گے جب اجتماعی مفاد کے پیشِ نظر ہم اپنی ذات اور اپنے مفاد کو قربان کرنا سیکھیں گے۔
ورنہ ہماری ایک لغزش ہمیں منزل سے بہت دور کر دے گی۔

یہی وہ نظم و ضبط ہے جو مدرسے کی فضا سے دور جماعتوں کو اکثریت کے فیصلے کا تابع بناتا ہے۔
ورنہ یہ ملک کسی وقت بھی نذرِ انتشار ہو سکتا ہے۔ جمہوریت کی بقا کے لیے عوام کا پڑھا لکھا اور
تربیت یافتہ ہونا بہت ضروری ہے۔ تعلیم کا فقدان کسی وقت بھی سیاسی اور سماجی بدنظمی کا پیش خیمہ

بن سکتا ہے۔ کیا جمہوریت کے ان ابتدائی ایام میں ہم کسی ایسے خطرے کو برداشت کر سکتے ہیں۔

شہریت

جمہوریت کی بقا کے لیے معاشرتی تنظیم بھی بہت اہم ہوتی ہے۔ ورنہ دوسروں کی خدمت کا جذبہ عوامی مفاد کا احساس کب اور کیسے پیدا ہوگا۔ اگر ہر شخص اپنی باتوں کو دوسروں پر مسلط کرنے کی فکر کریگا تو نظم و ضبط اور تربیت و تنظیم کی جملہ خوبیاں ختم ہو جائیں گی۔ اس لیے بنیادی طور پر معاشرے کے ہر رکن کے لیے شہریت کی تعلیم و تربیت لازمی بلکہ ناگزیر ہو جاتی ہے۔ معاشرے میں دوسروں کے احساسات کا احترام ہی ہمیں حقائق آشنا بنا سکتا ہے۔

ڈاکٹر الکزینڈر نے اپنی تقریر میں ان خطرات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو آج جمہوریت کو لاحق ہیں۔ اگر معاشرے کا ایک ایک فرد اپنے نمائندوں کے وضع کردہ قوانین کا احترام نہیں کرتا یا فکری اور نظری اعتبار سے وہ ان سے اختلاف رکھتا ہے اور اس کے خلاف احتجاج جائز نہیں، بلکہ ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جس سے قوم کی مزید تخریب ہوتی ہے۔ لیکن اگر مدرسے کی فضا میں ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے جس میں بچے، بجائے خود دلچسپی لیں اپنے بھلے برے کو جانچیں اور پھر اپنی زندگی کو اس ڈگر پر ڈالنے کی کوشش کریں جو ان میں خود اعتمادی اور احساس کا دہ پیدا کر سکے تو یہی زندگی قابل رشک بن جائے اور مدرسہ اس انتشار میں آئین و اصلاح کی ایک ایسی فضا پیدا کر سکتا ہے جو معاشری استحکام کی ضامن ہو سکتی ہے۔ دراصل ان کے ہاتھ میں تلوار ہے جس سے وہ قوم و ملت کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ ہر بلا اور ہر مصیبت کا مقابلہ کر کے وہ خون آشام گردباد سے اپنی سلامت طبع اور ذہنی بلندی کا اعتراف کرا سکتے ہیں اس تلوار کی باڑھ جوہر اور اسی قسم کے دوسرے تباہ کن اسلحہ سے کہیں زیادہ شدید اور نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔

کیا جمہوریت بیمار ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا جمہوریت واقعی بیمار ہے۔ آیا اس کے دکھوں کا علاج نظم و ضبط کی یہی پابندی ہے۔ اور کیا مدرسے اس اہم معاشرتی ضرورت کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اس کا

جواب ہمیں اس جماعتی نظم و ضبط میں مل سکتا ہے جو ہر اچھے مدرسے کا خاصہ ہے۔

جو تبدیلیاں اس وقت مدرسوں میں رونما ہو رہی ہیں یا نظم و ضبط کو جس عنوان سے ان مدرسوں میں جاری کیا جا رہا ہے، یہ بھی دراصل دورِ جدید کے رجحاناتِ فکر کی ترجمانی ہے۔ معاشرے کو اس کی ضرورت تھی، افراد اس کے آرزومند تھے، جمہوریت اس کی متقضی تھی۔ دو عالمگیر لڑائیاں ہمارے نظامِ خیال میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کر چکی ہیں۔ اگر اس وقت مدرسے میں نظم و ضبط کے پرانے نظریات کو بروئے کار لانے کی کوشش بھی کی جائے تو یہ کوشش بے معنی اور ناممکن العمل ہو گی۔ گھریلو زندگی اور معاشرہ انسان کے تمام مظاہر اس کے خلاف ہوں گے۔ بلکہ پرانے ساغر و مینا لے کر محفل آرائی کا خیال بہت ہی مضحکہ خیز ہو گا۔ البتہ یہ درست ہے کہ مدرسہ مروجہ طریق فکر اور زندگی کے آداب و اطوار میں ایک نمایاں تغیر پیدا کر سکتا ہے۔ وہ اسے بہت آگے لے جا سکتا ہے ہماری توقعات سے بھی آگے۔ کیوں کہ اگر بچہ مدرسے میں اپنی حدود سے تجاوز نہیں کرتا تو وہ اپنی سماجی زندگی میں بھی ایک اچھے کردار اور ایک اچھے نظم و ضبط کا نمونہ پیش کر سکے گا۔ صحیح نظم و ضبط کسی کو سکھایا نہیں جا سکتا۔ اس کا دھارا تو دراصل بچے کے اپنے اطمینان سے پھوٹتا ہے۔ وہ کس طرح اپنے اقدارِ حیات کو اپناتا ہے کس طرح ان کا اظہار کرتا ہے۔ کس طرح اور کیسے معاشرے میں اپنے ایسے نظام پیدا کرتا ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جو ایک بچے کی زندگی کو بہتر بنا سکتی ہیں۔ اور یہی کلیات معاشرہ پر بھی پوری طرح منطبق ہوتے ہیں۔ اگر معاشرہ بھی اپنے ہر رکن کے لیے ایسے ہی حالات پیدا کر دے جو ایک اچھے مدرسے میں بچوں کو میسر آتے ہیں تو یقیناً ہماری بہت سی دشواریاں آپ سے آپ حل ہو جائیں۔

لیکن ہمارے موجودہ ماحول میں اس قسم کے حالات نہ تو مدرسے میں پیدا کیے جا سکتے ہیں اور نہ معاشرے میں ایسی فکری عادات کی طرح ڈالی جا سکتی ہے۔ جو اس کے ایک ایک فرد کو عملاً اور قولاً ایک حساس انسان بنا دیں۔ آخر ان مناسب اور جائز حد بندیوں کو توڑ کر ہی کون سی معاشرتی یا اخلاقی فلاح ممکن ہے۔ جمہوری نظام ہمارے لیے ایک تجربہ ہے، ایک ایسا تجربہ جس میں ہم کامیاب

بھی ہو سکتے ہیں اور ناکام بھی۔ یہ ہمارے لیے مفید بھی ہو سکتا ہے اور غیر مفید بھی۔ اس لیے جمہوریت کو ایک ادارۂ فکر کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ اسے ایک عملی جولان گاہ بنا کر ہمارا کام زندگی کے نشیب و فراز، اخلاق و کردار اور جہد و عمل کے صحیح خدوخال کو اجاگر کرنا ہے اور اس فکری بلندی اور ذہنی پرواز کے لیے نظم و ضبط کی پابندیوں کی ہر وقت ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ بقول گارڈنر ہماری مثال اس روسی عمر رسیدہ عورت کی ہو گی جو حصولِ آزادی کے بعد ماسکو کی ایک معروف شاہراہ میں کبھی اس طرف اور کبھی بیچ سڑک میں پھرتی رہی۔ اس سے لوگوں کی آمد و رفت اور ٹریفک میں بڑی دشواریاں پیش آنے لگیں۔ جب لوگوں نے اس کی اس ناعاقبت اندیشانہ حرکت کی طرف اسکی توجہ دلائی تو اس نے تلملا کر جواب دیا کہ ملک آزاد ہو چکا ہے۔ اب مجھے کوئی اس حق سے محروم نہیں کر سکتا۔ میں سڑک پر جس طرح چاہوں چلوں گی تم منع کرنے والے کون ہوتے ہو؟ لیکن اسے شاید یہ معلوم نہ تھا کہ وہ جسے آزادی کا نام دے رہی ہے، دراصل سماجی انتشار ہے اور اس کے اس اقدام نے کتنوں کو مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے ❊

پس چہ باید کرد ۔۔۔۔۔

محمد مرتضےٰ زیدی

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ پاکستان اسلام اور صرف اسلام ہی کے نام پر وجود میں
یا ہے۔ اسلامیانِ ہند کی یہ دلی خواہش تھی کہ انھیں ایک ایسا خطۂ زمین میسر آ جائے جہاں وہ
پنی زندگی آزادی کے ساتھ اسلامی اصولوں کے تحت گزار سکیں۔ اور اپنے تمدن و تہذیب کو زندہ رکھ
سکیں۔

حصولِ پاکستان کے بعد تمام مسلمانانِ پاکستان کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنی زندگی کو اسلام کے
انچے میں ڈھالنے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ مگر نہایت افسوس کے ساتھ ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ آجکل
کستان میں مغرب کی نقالی کی وبا روز بروز شدت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اور اسلامیانِ پاکستان اہلِ
غرب کی کورانہ تقلید کے سیلاب میں بری طرح بہے چلے جا رہے ہیں۔ آرٹ اور ثقافت کی آڑ میں
فاشی اور لامذہبیت زوروں پر ہے۔ خاص طور پر ہمارے نوجوان تو مغرب کی اندھی تقلید کا بری طرح
شکار ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں آئندہ نسلوں کے متعلق خوش فہمی کی بظاہر کوئی گنجائش
تی نہیں رہتی ہے۔ اس کے علل و اسباب پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان تمام
راہیوں کی ذمہ داری صرف دو چیزوں پر عاید ہوتی ہے۔ ایک ہمارے گھر کا ماحول اور دوسرے
ارے اسکول یا کالج کی فضا۔ کیوں کہ قوم کے نونہالوں کو اسلام اور اس کی تعلیمات سے باخبر رکھنے
ر اُن سے دلچسپی پیدا کرانے کے فقط دو ہی ذریعے ہو سکتے ہیں۔

(۱) گھر۔ بلاشبہ بچوں کی پہلی تربیت گاہ ہمارے گھر ہی ہیں۔ اگر ہم اپنے بچوں کو اپنے گھروں
میں مذہبی تعلیم دیں۔ انھیں نماز روزہ اور تلاوتِ قرآن کا پابند بنائیں اور انھیں اسلامی

تعلیمات سے روشناس کرائیں تو یہ چیزیں ان کی زندگی میں رچ بس جائیں گی۔ اور آئندہ وہ اسی تعلیم کو اپنی زندگی میں مشعل راہ بنائیں گے۔ اور پھر اسلام کے ساتھ ان کی دلچسپی اور اسلامی تعلیمات کے ساتھ ان کی وابستگی ہمیشہ قائم رہے گی۔

لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ بچوں کے والدین خود بھی اسلامی زندگی بسر کرتے ہوں۔ آئیے تھوڑی دیر کے لیے ہم اپنے گھروں کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ آجکل ہمارے گھروں میں کیا ہو رہا ہے، اور ہمارے بچوں کو گھروں میں کس قسم کی تربیت مل رہی ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ہمارے گھروں میں نماز، روزہ، اور تلاوت کلام پاک کی بجائے ریڈیو پر فلمی گانے ہو رہے ہیں۔ ماں باپ بھی ان گانوں سے دلچسپی لیتے ہیں اور ان کے بچے بھی خوب مزے لے لے کر انھیں سنتے اور یاد کرتے ہیں۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں ہوتی بلکہ والدین اپنے بچوں کے لیے ہر ہفتہ سینما کا پروگرام بھی بناتے ہیں۔ اور اس طرح ہمارے بچے گانے والوں اور گانے والیوں سے بھی خوب اچھی طرح متعارف ہو جاتے ہیں۔ وہ بچے جو ایسے ماحول میں پلے بڑھے ہوں کیا ان سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ جوان ہو کر اسلام کے فدائی اور دین و مذہب کے شیدائی بنیں گے۔ یا ان کو اسلام کی تعلیمات سے کوئی دلچسپی ہو سکے گی! ہرگز نہیں کیوں کہ مثل مشہور ہے جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے۔

(۲) ہمارے بچوں کی دوسری تربیت گاہ ہمارے تعلیمی ادارے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے مدرسے اور ہمارے تعلیمی ادارے اخلاق و آداب کا گہوارہ ہوتے تھے۔ جہاں قوم کے بچوں کو مذہبی، اخلاقی اور انسانی تعلیم و تربیت دی جاتی تھی۔ انھیں رہنے سہنے اور اچھے شہری بننے کا سلیقہ سکھایا جاتا تھا۔ تاکہ جب وہ فارغ ہو کر نکلیں تو اپنے ملک و ملت کے لیے سرمایۂ افتخار بن سکیں۔ لیکن اس کے برعکس آجکل ہمارے تعلیمی اداروں میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ کم از اخلاقیات سکھانے میں تو بُری طرح ناکام رہا ہے۔ کیوں کہ بچوں کے

شہری بنانے کے بجائے اب انھیں ڈرامے سٹیج کرنا سکھانے پر کافی زور دیا جا رہا ہے۔ یہ ڈرامے زنانہ اور مردانہ اسکولوں اور کالجوں میں یکساں طور پر سٹیج ہوتے ہیں اور یہ بات بلا خوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ ان ڈراموں کے اکثر پارٹ اخلاقی نقطۂ نظر سے نہایت ہی قابلِ اعتراض ہوتے ہیں۔ ان ڈراموں میں سب سے بہتر ایکٹنگ کرنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کو انعامات دے کر ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اور اس طرح آرٹ کے پردہ میں مخربِ اخلاق باتوں کو ہوا دی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ نونہالانِ ملت میں ایکٹر اور ایکٹرس بننے کا شوق بڑھتا جا رہا ہے۔ ان حالات کو دیکھ کر میں تو اکثر سوچا کرتا ہوں کہ قوم کے نونہال اچھے لیلےٰ مجنوں بنیں گے یا اچھے مجاہد ملت ؟

ان سب کے علاوہ ایک اور خطرناک چیز جس نے اسلامی معاشرہ کی چولیں ہلا دی ہیں وہ ٹیڈی کلچر اور ٹیڈی نظریات ہیں۔ جو آجکل ہمارے نوجوانوں میں وبائی بیماری کی طرح پھیلتے جا رہے ہیں۔ اگر وقت پر اس کی روک تھام نہ کی گئی اور صحیح طور پر اس کا علاج نہ ہوا تو وہ دن دور نہیں کہ ہمارے معاشرہ میں ٹیڈی ازم اپنی مستقل جگہ بنا لے گا اور دین و مذہب صرف کتابوں کی زینت بن کر رہ جائے گا ٭

بچّوں کی تربیت
اور
...ین کی ذمہ داری

...شبیر احمد قاری

بچوں کی تربیت اور سماج میں چولی دامن کا ساتھ ہے یہ مسئلہ کہ تعلیم نے پہلے جنم لیا یا سماج
...ا مسئلہ ہے جس کا آج تک فیصلہ نہ ہو سکا۔ یہ بات اپنی جگہ کافی وزن رکھتی ہے کہ ایک اچھا
...ظام ایسے ہی سماج میں جنم پا سکتا ہے جو ہر اعتبار سے ترقی پا چکا ہو۔ مگر یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا
...ی ترقی کی تمام تحریکیں کوئی نہ کوئی بنیاد رکھتی ہیں۔ بہر حال اس قدر واضح ہے کہ بہتر طریقۂ تعلیم
اعلیٰ سماج پیدا کر سکتا ہے۔

پاکستان ایک نوزائیدہ ملک ہے اور جن مقاصد کے حصول کی خاطر اسے معرض وجود میں
...یا وہ سب کے پیش نظر ہیں۔ ہماری قدیم تہذیب اور تمدن کیا تھے۔ ہم نے مہذب دنیا کی
...ں کیا حصہ لیا۔ کس طرح تہذیب کو آگے بڑھایا اور کیوں سب سے پیچھے رہ گئے۔ یہ سوالات
...طلب ہیں۔ مجھے اس وقت صرف یہ کہنا ہے کہ ہم وہ نہیں رہے جو ہونا چاہیے تھے اور
...ستان کے قیام کا مقصد اولین اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اپنی کھوئی ہوئی تہذیب و شائستگی
حاصل کر لیں۔ ہم اپنی منزل سے بہت دور رہ گئے ہیں۔ وہ لوگ جن کی جمعیت کو آج قوم کہا جاتا
پاکستان کے خواب کی تعبیر نہیں ہیں۔ بلکہ وہ نسل جو موجودہ قوم کی جگہ لے گی۔ ہماری امیدوں کا
ہے۔ ہماری موجودہ نسل اپنا وقت پورا کر چکی اور نئی نسل اس کی جگہ لینے والی ہے۔ ہم نے
...ں ماحول میں پرورش پائی اس میں ہم وہی بن سکتے تھے جو ہم آج ہیں۔ مگر ہم یہ نہیں
...تے کہ ہماری نئی نسل ہماری طرح ہو۔ تعمیری قوم کی منزل کٹھن ہے۔ اور اس کے لیے بہترین

جو ہم میں پختہ ہو چکی ہیں ہماری آئندہ نسل کو ورثے میں نہ مل سکیں۔ ہمیں اپنے بچوں کی تربیت کے لیے ایک صحت مند ماحول پیدا کرنا ہوگا تاکہ وہ ہمارا نہیں بلکہ ہماری آرزوؤں کا جواب ہوں۔

یوں تو انسان آغوش مادر سے لیکر آغوش لحد تک کچھ نہ کچھ سیکھتا ہی رہتا ہے، مگر اس کی زندگی کا ابتدائی حصہ اس سلسلہ میں سب سے اہم ہوتا ہے۔ ان چند سالوں میں ہی انسان کی سیرت کا سنگ بنیاد رکھا جاتا ہے۔ اس ابتدائی دور میں پہلے والدین اور پھر استاد پر بچہ کی تربیت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا درست ہوگا کہ پہلے والدین تنہا اور اس کے بعد اساتذہ کی شرکت میں یا تربیت اٹھاتے ہیں۔ ہمارے ابتدائی مدارس میں جس طرح تعلیم ہوتی ہے اور اساتذہ میں جس طرح خامیاں موجود ہیں۔ اس کے لیے ایک الگ مضمون درکار ہے۔ ہمیں اس وقت صرف آغوش مادر سے بحث ہے۔ ماں باپ کی تربیت بچہ کی سیرت پر اس وقت اثر انداز ہوتی ہے جب اس کے دل و دماغ کا آئینہ ہر نقش سے مبرا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے نقوش سب سے زیادہ دیرپا ہوتے ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں لاتعداد مثالیں ان لوگوں کی موجود ہیں جن کی سیرت کا سنگ بنیاد والدین نے اس طرح رکھا کہ اس کی بدولت وہ ایک عظیم الشان شخصیت کا محل تعمیر کر سکے۔

روزمرہ زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ والدین کی شخصیت قدم قدم اپنے بچوں کی سیرت میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ خدا ترس اور نیک والدین کے بچے عموماً نیک اور خدا ترس ہوتے ہیں۔ بعض خصائل قوموں اور نسلوں کے لیے مخصوص ہوتی ہیں۔ ہمارے ملک میں شرافت خاندانی کو اسی لیے اہمیت حاصل تھی کہ شرفا کے بچے ایک اعلیٰ اور صحت مند ماحول میں پرورش پاتے تھے اس لیے ان سے عوام کی نسبت زیادہ ارفع و اعلیٰ کردار کی توقع کی جاتی تھی۔ آج کل بھی عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ خاندانی اور شریف النسل لوگوں کے بچوں میں عموماً اپنے خاندانی اوصاف موجود ہوتے ہیں۔ بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں گھر اور ہمسایہ ماحول کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم قصبہ میں پائی۔

بچپن میں وہ آئے دن زمین وغیرہ کے جھگڑے اور معمولی معمولی باتوں پر نااتفاقیاں اور شکر رنجیاں دیکھتا تھا۔ اس کی ثانوی تعلیم نسبتاً ایک بڑے اسکول میں ہوئی اور کالج کی تعلیم ہندوستان کے ایک بہترین ادارے میں ہوئی۔ اور پھر اس نے ولایت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ محنت شاقہ اور بُری عادتوں سے پرہیز اس کی بہترین خوبیاں تھیں۔ اب وہ ایک افسر اعلیٰ تھا۔ اپنی محنت اور فرض شناسی کے جوہر رکھنے کے باوجود وہ اپنے ماتحتوں میں محبوب نہ بن سکا۔ اس کی غیر محبوبیت کی وجہ ماتحتوں کی سہل انگاری نہیں تھی۔ بلکہ اس کا ذرا ذرا سی باتوں پر ادنیٰ ترین طازم سے اُلجھ پڑنا تھا۔ یہ نتیجہ ہے ادنیٰ دیہاتی ماحول میں ابتدائی تربیت پانے کا جہاں ایک ہی خاندان کے لوگ معمولی معمولی باتوں پر لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، اور جس کا اثر اعلیٰ تعلیم اور بلند عہدہ جیسی چیزیں بھی دور نہ کر سکیں۔

اس تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ گھر کا ماحول اور والدین کی شخصیت اور تربیت بچے کی سیرت کا سنگ بنیاد ہیں۔ والدین کو بچے کی نفسیات سے اس قدر ضرور واقف ہونا چاہیے جو بچے کی سیرت کی تشکیل کے لیے ضروری ہے۔ اگر والدین بچے کی سیرت کا سنگ بنیاد درست نہ رکھ سکے تو نتیجہ اس کے علاوہ کچھ نہ ہوگا کہ "تا ثریا می رسد دیوار کج" استاد کی تربیت بعد کی چیز ہے۔ اگر ابتدا ہی غلط طریقہ سے ہوئی ہے تو اچھے استاد کو بھی بے پناہ دقتوں کا سامنا ہوتا ہے۔ یوں بھی گھریلو تربیت کا اثر زائل کرنا مشکل کام ہے۔ خصوصاً ہمارے ملک میں بچے اپنے وقت کا زیادہ تر حصہ والدین ہی کے ساتھ گذارتے ہیں۔ اس لیے نتیجہ یہی ہوگا کہ ایک طرف استاد سودائے خام میں مبتلا رہے گا۔ اور دوسری طرف والدین کو انتہائی احتیاط اور تحمل سے کام لینا چاہیے۔ بچے کی عمر کے پہلے دو سال ماہر نفسیات کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ تجسس کا مادہ بچے کی سیرت میں قدرت کی طرف سے اسی لیے ودیعت ہوا ہے کہ وہ علم حاصل کرنے میں اس کا معاون ثابت ہو۔ بچہ دنیا میں آنکھیں کھولتے ہی ہر چیز کو حیرت اور اشتیاق سے دیکھتا ہے۔ ہر چیز کے متعلق اس کے دل میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ معمولی سے معمولی چیز اس کے لیے دلچسپی کا سامان ہوتی ہے۔ پہلے اور دوسرے سال کی درمیانی عمر میں بچہ اپنے اندر بڑوں کی خصوصیات پیدا کرنا

شروع کرتا ہے۔ وہ چلنا اور بولنا سیکھتا ہے اور ہر کام میں بڑوں کی نقل کی کوشش کرتا ہے۔ یہ وقت اس کی سیرت کی تکمیل کے سلسلہ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ سمجھدار والدین اسی وقت سے بچے کو اچھی عادات کی طرف مائل اور بری عادات سے متنفر کر سکتے ہیں۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو جائیں تو آئندہ کے مراحل ان کے لیے بہت آسان ہو جاتے ہیں۔ مگر ہمارے یہاں سب سے بڑی بدقسمتی یہی ہے کہ لوگ اس عمر میں بچوں کی تربیت کی طرف قطعاً توجہ نہیں دیتے۔ بلکہ اس عمر میں بے جا پیار کر کے ان کی عادات خراب کر دی جاتی ہیں جب بچہ قدرے بڑا ہوتا ہے تو والدین اسے تہذیب سکھانے اور تعلیم دینے کی طرف توجہ دیتے ہیں اور اپنی ناسمجھی کے باعث بچے کو اپنے معیار پر جانچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بچے کی فطری صلاحیتوں اور اس کی نفسیات سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ ان کے ذہن میں پہلے سے ایک خاکہ موجود ہوتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ بچے کے اطوار و عادات خاکے کے عین مطابق ہوں۔ بچہ اپنی فطری ناواقفیت کی بنا پر جب ان کے معیار سے گرتا نظر آتا ہے تو وہ بجائے اس سے ہمدردی سے پیش آنے کے ناراض ہوتے ہیں اور سزا دینا چاہتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس عمل سے بچے کے لیے سیکھنے کا کام ناگوار اور اس کی سیکھنے کی فطری صلاحیت کو بے کار کر دیتے ہیں۔

بچے کی سیرت کی تشکیل کے لیے پہلے سے ذہن میں ایک پروگرام ہونا کوئی بری بات نہیں (اگرچہ سمجھدار والدین بچے کی فطری صلاحیتوں کا جائزہ لے کر اس کی نشوونما کا پروگرام بنا دیتے ہیں) تاہم اس پروگرام پر جس طرح عمل کیا جاتا ہے وہ سراسر غلط اور غیر فطری طریقہ ہے۔ ننھے بچے کی مثال ایک نوزائیدہ پودے کی سی ہے جس طرح ایک اچھا باغبان اگرچہ ہر پودے کو ایک خاص انداز کا درخت بنانا چاہتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ زبردستی کرنے کی بجائے اس کی نزاکت کو پوری طرح مدنظر رکھتے ہوئے اس کی پرورش کے لیے ایک تدریجی پروگرام بناتا ہے۔ عین اسی طرح والدین کو بھی بچے کی نفسیات کو پوری طرح مدنظر رکھتے ہوئے ان کی تربیت کرنی چاہیے۔ انھیں بچے کی فطرت کا پورا خیال رکھتے ہوئے کبھی نرمی کبھی سختی اور کبھی کھیل کود کی باتوں میں اس کی اپنی پسندیدہ باتیں اور مذہبی نکات سکھانے چاہئیں۔

ی زندگی کسی ضبط کے ماتحت ضرور ہونی چاہیے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس پر بے جا جبر
ے۔ اِس نظم و ضبط کے لیے پیار و محبت سزا کی نسبت زیادہ مفید ثابت ہوں گے۔ محبت و پیار
د سے بڑھ جائیں تو یقیناً مضر اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ ناجائز روک ٹوک اور بے جا پیار
ے اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔ والدین کو ان دونوں چیزوں میں توازن رکھنا چاہیے لاڈلے
ضدی اور بد دماغ ہوتے ہیں۔ خود اعتمادی کا مادہ ان میں بہت کم ہوتا ہے۔ زمانہ کے سرد
کی ان میں تاب نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ والدین اس کی جائز و ناجائز باتوں میں
یں کرتے۔ وہ محبت کے جوش میں ان کی ہر آرزو پوری کرتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ
کے بعد یہ عادات بچے میں پختہ ہو جاتی ہیں اور پھر اگر اس کی بات نہ مانی جائے تو وہ
ے لگتا ہے۔ اسی طرح والدین انتہائی محبت کی وجہ سے بچے کی ہر اُس کام میں مدد کرنا چاہتے
ں کے کرنے میں وہ لطف حاصل کرتا ہے۔ مثلاً وہ کوئی زیادہ وزن اٹھانا چاہتا ہے۔ والدین
ما دیتے ہیں۔ یا وہ سیڑھیاں چڑھنا چاہتا ہے والدین گود میں اٹھا کر اسے اوپر پہنچا دیتے ہیں
رح کھیل کود سیر و تفریح ہر معاملہ میں اس کی مدد کرتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے کا
ی شوق ختم ہو جاتا ہے۔ اس میں نہ تو عملی صلاحیت رہتی ہے اور نہ خود اعتمادی۔ پھر
م میں دوسروں کی مدد اور سہارے کا خواہاں ہوتا ہے۔ بڑے ہو کر اس میں خطرے مول لینے
معاملہ میں پہل کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ خود اعتمادی کی وجہ سے وہ ہمیشہ ناکامیوں سے
ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا والدین کو اِس کا پورا خیال رکھنا چاہیے کہ ان کی روک ٹوک اور بے جا
ے کی فطرت کے بہترین جوہر کو فنا نہ کر دے۔ انھیں بچے کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے۔ جہاں
و کنے یا اس کی مدد کرنے کی ضرورت پڑے اِس طرح مدد کریں کہ بچے کی خودداری اور
کو ٹھیس نہ لگے۔

اکہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ تجسس کا مادہ بچوں میں فطری ہوتا ہے۔ وہ جوں ہی بولنے
[illegible] کچھ سکھانے کا یہ بہترین وقت [illegible]

دیتا ہے۔ والدین کو بچے کے ہر سوال کا جواب پوری احتیاط اور ہمدردی سے دینا چاہیے اور اس طرح
پیش آنا چاہیے کہ ان میں نئی باتیں معلوم کرنے کا شوق ترقی کرے۔ کبھی کبھی خود بھی ان سے کوئی بات
اس طرح دریافت کی جائے گویا خود علم حاصل کرنا مقصود ہے۔ اس طرح بچوں میں خود اعتمادی پیدا
ہوتی ہے اور یہ احساس کہ ہم بھی کچھ جانتے ہیں ان میں ذہانت اور نئی باتیں معلوم کرنے کے ذوق کا
اضافہ کرتا ہے۔

مندرجہ بالا سطور اگرچہ اس موضوع پر بہت ہی ناکافی ہیں ایک ایسے موضوع کے متعلق
کچھ لکھنا جس پر ہر زبان میں بہت زیادہ اور بہت عمدہ لکھا گیا ہے۔ بظاہر خورشید کو آئینہ دکھانے
کے مترادف ہے۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ اس مضمون سے والدین اور اساتذہ کو بچوں کی نفسیات
کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی تحریک ہوگی اور وہ خود کو اس قابل بنانے کی کوششیں کریں گے
کہ بچوں کے مسائل اور ان کی نفسیات سے واقف ہو جائیں۔ اگر اس مضمون سے واقعی یہی اثر ہوا تو
یہ ملک اور قوم کے لیے بے حد مفید ہوگا؛ اور میں یہ سمجھوں گا کہ میرا مقصد حاصل ہو گیا۔ ٹریننگ کالج
کے طلبہ جو آگے چل کر استاد اور والدین بننے والے ہیں انہیں نفسیات کی تعلیم پر خاص طور پر زور دینا
چاہیے۔ کیوں کہ تعمیر قومی کے سلسلہ میں ان کی ذمہ داری عوام سے زیادہ ہے ؎

بچوں کی نفسیات اور تعمیرِ ملّی

ڈاکٹر عبدالرؤف

بچہ کیا ہے؟ اس کی ذہنی دنیا میں کیا کیا خیال بستے ہیں؟ اسے کام کی تحریک کیسے ہوتی ہے؟ کن باتوں سے اسے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اور کون کون سی باتیں اس پر ناگوار اثر ڈالتی ہیں۔ ایک اچھے مانس شہری بننے کے لیے بچے کی تعلیم و تربیت کو کن سانچوں پر ڈھالا جائے۔ اسے بری عادات سے کیسے محفوظ رکھا جائے اور نیک عادات کی تربیت کیسے دی جائے۔ بچے کے لیے مناسب کھیل اور تفریح کے سامان کیسے مہیا کیے جائیں؟ بچوں کی فلاح و بہبود کے بارے میں والدین اور معلم کی رہنمائی کیسے ہو۔ بچوں کی نفسیات کا ماہر ان سب باتوں کی سائنسی تحقیق کرتا ہے اور نشوونما اور ذہنی صحت کے مختلف مدارج میں بچوں کی مدد کرتا ہے۔

بچے کی زندگی مندرجہ ذیل تین قسم کے ماحول میں بسر ہوتی ہے۔

اوّل ۔ گھر

دوئم ۔ محلہ ۔ گلی ۔ کھیل کا میدان وغیرہ

سوئم ۔ مدرسہ

بچہ اپنی معاشرتی زندگی گھر سے شروع کرتا ہے۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کی سمجھ بوجھ میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور وہ گھر میں اپنے اردگرد کی اشیا میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے تجربہ اور قوت گویائی میں ترقی کے ساتھ ساتھ بچے کو چیزوں کے ناموں سے بھی واقفیت ہوتی جاتی ہے ابتدا میں اسے ہر بات اور ہر شے نئی معلوم ہوتی ہے۔ وہ ماں پر سوالوں کی بلغار کرتا رہتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ وہ کون ہے؟ اسے کیا کہتے ہیں۔ وہ ماں جو ان سوالوں کی اہمیت سمجھنے کی کوشش نہ کرے

معقول جواب دینے کی بجائے بچے کو ٹالتی رہے۔ بچوں کی پرورش کے بارے میں بہت سنگین غلطی کی مرتکب ہوتی ہے۔ یہ درست ہے کہ بچے کے ہر سوال اور ہر تجسس کی تشفی کرنا بھی ایک مستقل دردِ سر کم نہیں۔ مگر ٹال مٹول اور غلط بیانی سے بچے کی ذہنیت کا ان سمتوں میں بڑھ جانے کا احتمال ہے جو آئندہ چل کر کسی نہ کسی صورت خطرناک ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً بچہ کھیلتے کھیلتے باورچی خانے میں گھسنے ہی لگا تھا کہ آپ نے اسے "ہوں" کہہ کر روک دیا۔ وہ رکتا ہے۔ پھر آپ کی طرف دیکھتا ہے اور اندر کی طرف بڑھنے پر مصر دکھائی دیتا ہے تو آپ اسے ڈرا دھمکا کر روک لیتے ہیں۔ باورچی خانے میں جا کر ننھے نے جو اودھم مچانا تھا اس سے آپ کو وقتی نجات تو مل گئی۔ مگر آپ نے کبھی یہ نہ سوچا کہ آپ کی آئے دن کی دھمکیوں سے بچے کے اندر بیجا وہم اور مبہم خوفوں کو پلنے کا موقع ملتا ہے۔ اسی طرح شرارتی جھگڑالو اور کھانے میں ضد کرنے والے بچوں کو ہمارے ہاں جن غیر معقول طریقوں سے سیدھا کیا جاتا ہے وہ کسی طرح بھی قرین مصلحت نہیں ہیں۔

مجھے یاد آگیا لندن میں ہمارے کلینک میں ایک بیوہ صاحبہ اپنے دو جھگڑالو بچوں کو لائیں۔ بچے دن میں کئی بار گھر سے چپکے چپکے کھسک جایا کرتے تھے اور ماں کی آنکھ بچا کر ڈبل روٹی اور کھانے کی ایک آدھ چیز اٹھا کر ساتھ رکھ لیتے تھے۔ ماں ان کی غیر حاضری میں پریشان رہتی۔ لیکن جب وہ گھر میں موجود ہوتے تو اپنی ننھی بہن کو خواہ مخواہ ستاتے رہتے تھے اور طرح طرح کی شرارتوں اور دھینگا مشتیوں سے سارے گھر کا انتظام درہم برہم رکھتے تھے۔ بیچاری ماں عجب مخمصے میں گرفتار تھی۔ اس کے لیے بچوں کا گھر کے اندر یا باہر رہنا دونوں صورتیں تکلیف دہ بنی ہوئی تھیں۔ میں نے اِس خاندان اور ان کے مکان کا مختصر سا جائزہ لیا۔ والدین سے ملاقات کی پھر بچوں سے بے تکلف ہوا، اور ان کی تکلیف کی تحقیق شروع کی۔ جب بچے گھر سے کھسکتے تھے، میں بھی چپکے چپکے ان کے پیچھے ہو لیتا۔ میں نے دیکھا کہ وہ دور جا کر ایک بم زدہ عمارت میں داخل ہو جاتے۔ جہاں ایک میلا کچیلا کتا دُم ہلا ہلا کر ان کا استقبال کرتا۔ بچے اسے چرائی ہوئی چیزیں کھانے کو پیش کرتے اور پھر اس سے پہروں کھیلتے رہتے۔ میں کئی دن یہ تماشہ دیکھتا رہا۔ معاملہ بہت سیدھا ہے۔ بات دراصل یہ تھی کہ بچوں کے لیے گھر میں دلچسپی کا

کوئی سامان موجود نہیں تھا۔ چھوٹی بہن کی پیدائش کے بعد انھیں یہ وہم ہوگیا تھا کہ والدین نو وارد سے ترجیحی سلوک روا رکھتے ہیں۔ ہم زدہ مکان میں غلیظ کتے سے کھیل کر انھیں کچھ فرحت حاصل ہوتی تھی۔ مگر جب وہ گھر لوٹتے اور چوری اور بھاگنے پر امی ان کے کان کھینچتی تو وہ اس ناانصافی کا انتقام ننھی کو تنگ کرکے اور گھر میں اودھم مچانے کی صورت میں لیتے تھے۔ معاملہ جب حد سے بڑھنے لگا تو والدہ نے ہمارے کلینک سے مشورہ طلب کیا۔ میں نے بچوں کی ماں کو پالتو کتا رکھنے کا مشورہ دیا۔ مگر معلوم ہوا کہ بچوں کے والدین گھر میں پالتو جانور رکھنے کے مخالف تھے۔ اتفاق سے انھی دنوں لندن کے سینما میں ایک نفسیاتی فلم KIDINE PPESS کی نمائش ہو رہی تھی جس میں گھریلو فضا کو بچوں کی دلچسپیوں سے خالی رکھنے کے مہلک نتائج کو نہایت عام فہم انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ میرے اصرار پر والدین نے اس فلم کو دیکھا۔ میری تجویز کے افادی پہلو ان کی سمجھ میں آنے لگے تو انھوں نے بچوں کے متعلق اپنا رویہ بدل لیا، اور ایک چھوٹا سا کتا بھی خرید لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہفتوں کے اندر اندر وہی گھیتا اا بگوڑے بچے سدھرنے لگے۔ بچوں کی نفسیاتی رہبری کے لیے ان کے والدین کی رہنمائی بھی بے حد ضروری ہے۔ بسا اوقات بچوں کی مشکلات کا اصل سبب والدین کی بے شعوری ہوتی ہے اور بے شعور والدین کو سمجھانے کے لیے باتوں، کتابوں اور فلم وغیرہ سے بھی بخوبی کام لیا جاسکتا ہے۔

کام کے سلسلے میں لاہور کے گلی کوچوں میں گھومنے کا بہت موقع ملتا رہتا ہے۔ ہمارے اکثر بچے گندی گلیوں میں، نالی کے کناروں اور کوڑے کرکٹ کے متعفن ڈھیروں کے قریب بے تکلفی سے کھیلتے نظر آتے ہیں۔ بچے کھیل کود کی انھی غلیظ جگہوں سے گالی گلوچ، ہاتھا پائی اور بدنظمی کی تربیت لیتے ہیں اور یہی بچے آئندہ چل کر غلیظ عادات کے جنگل میں پھنسے رہتے ہیں۔ ہماری اوسط گلی میں بچوں کے کھیل کود کا پروگرام کچھ یوں شروع ہوتا ہے۔ صبح ہوتے ہی درجنوں چھوٹے چھوٹے بچے کسی بڑے مکان کے دروازے کی نکڑ یا کنوئیں کی منڈیر پر جمع ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اتنے میں کوئی سودا فروش مُرمُرے، گنڈیریاں، ریوڑی اور مکھیوں سے بھری ہوئی چھابڑی نالی کے کنارے لگا کر بیٹھ جاتا ہے۔ بچے اس گندی منڈی ملک شاپ کے اردگرد منڈلاتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی قریب ہی سے کوئی اعلان گونجنے لگتا ہے "یاد

یڈیو کلیئر دنڈی دی لے جاؤ" تو یہ جم غفیر کچھ دیر کے لیے اس مکان کا رخ کر لیتا ہے اور وہاں جس بے شعوری ور بد تہذیبی سے انھیں جب یہ چیز بانٹی جاتی ہے اگر اس کا خاکہ کھینچا جائے تو عقل مشترک مختل ہو جائے لی میں کوئی موٹر یا ٹانگہ آ نکلے تو کئی بچے اس کے پیچھے لٹکنا شروع کر دیتے ہیں۔ گلی کی دیواروں پر کیچڑ چھ کھیلا جاتا ہے۔ اور تحریر کی مشق کے لیے عام فہم زبان میں ابتدائی گالیاں لکھی جاتی ہیں۔ بجلی کی اروں پر کانٹیاں پھینکی جاتی ہیں۔ کیڑی۔ کاٹڑا، اور گلی ڈنڈے کھیلتے وقت بچے نہایت بے تکلفی سے الی میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔ کھیل کے دوران میں جھگڑے والی باتیں عموماً باہمی گلوچ اور ہلکی ہلکی ہاتھا پائی سے طے ہو جاتی ہیں۔ قصہ مختصر بچے اس تفریح کے ساتھ ساتھ خود بخود بری عادات اور بدنظمی میں بھی تربیت حاصل کرتے چلے جاتے ہیں۔ بسا اوقات بچوں کے باہمی جھگڑے زیادہ تشویشناک صورت اختیار کر جاتے ہیں تو بچوں کی حمایت میں والدین بھی طرح طرح کی بد اخلاقیوں اور لڑائی جھگڑوں پر اتر آتے ہیں۔ ایسے ہی ہماری گلیاں معاشرت کے اس افسوسناک پہلو کی عکاسی کرنے لگتی ہیں۔ جو ہماری فوری توجہ کی مستحق ہے۔ اور جس کا سائنسی مطالعہ اور مناسب علاج ہم آج تک نظر انداز کرتے چلے آئے ہیں۔

بچوں کی نفسیات کا ماہر ایسی کھیلوں کے خطرناک نتائج سے بخوبی واقف ہوتا ہے جس میں تفریح کے ساتھ ساتھ بچوں کی عادات و خصائل نامناسب سمتوں میں ڈھلنے لگیں۔ ہر محلے اور ہر گلی کے قرب جوار میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی بنا بنایا پارک یا قطعۂ زمین ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ جسے بچے کے کھیل کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ غلیظ ماحول کو غیر منظم فضا کے گندے مندے کھیلوں میں پڑ کر بچے کی شخصیت اور اخلاق پر بہت ناگوار اور دیرپا اثر پڑتا ہے۔ ایسا بچہ بڑا ہو کر زندگی کو کسی اصول اور تنظیم کے تحت بسر کرنے کے قطعی نااہل ثابت ہوتا ہے۔ صاف ستھرا کھیل کا میدان ہی مناسب درس گاہ ہے جہاں ایک دوسرے سے مل جل کر خوشی خوشی کام کرنے کے جمہوری اصولوں کی عملی تربیت ہوتی ہے گندی نالیوں سے گھری ہوئی تنگ گلی اس اہم تربیت کے لیے یقیناً نامناسب مقام ہے بلکہ اب مجرمانہ رجحانوں کا اڈہ بن گئی ہے۔ پاکستان اور برطانیہ کے بورسٹل جیلوں اور عام مدرسوں کے بگڑے ہوئے

بچوں کے نفسیاتی جائزوں کے بعد مجھے اس بات میں کوئی شک نظر نہیں آتا کہ ہمارے بچے مجرمانہ کردار اور بد اخلاق مشاغل کی ابتدائی تربیت گلی کے لچر ساتھیوں ہی سے لیتے ہیں۔ اگر سب بچوں کو کھیل کے میدان میسر نہ آسکتے ہوں تو پھر ہمیں اپنی گلی ہی کو صفائی اور اخلاقی اعتبار سے کھیل کے میدان کے معیار پر لانا ہوگا۔ تاکہ مجبوری کی وجہ سے ہماری ان تنگ تہذیب گلیوں میں کھیلنے والے بدنصیب بچے بھی مخرب اخلاق رجحانوں سے محفوظ رہ سکیں۔

مدرسہ سماج کا وہ اہم ترین معاشرتی مرکز ہے جہاں بڑے سے بڑے بچے کی ذہنیت میں بھی مفید اور خوشگوار انقلاب لایا جاسکتا ہے۔ جماعت کی پڑھائی اور ہم جولیوں کے ساتھ غیر کتابی تفریحوں میں تربیت پاکر ہر بچہ اچھا شہری بن سکتا ہے۔ نظام تعلیم کی بنا بچوں کی نفسیات پر رکھی جائے تو معلم بچے کی متعدد خامیوں کا عین مناسب وقت پر مداوا کر سکتا ہے۔

بچوں کی تعلیم کے دو بنیادی مقاصد یہ ہیں۔

اوّل :- بچوں کو متمدن اور با اخلاق شہری بنانا۔

دوئم :- آئندہ زندگی میں کسی مناسب فن کو بطور پیشہ اختیار کرنے میں ان کی مدد کرنا۔

ان ہر دو مقاصد میں کسی ایک کو بھی نظر انداز کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ وطن کی اخلاقی اور معاشی حالت کا طائرانہ جائزہ لیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم ان مقاصد کی تکمیل میں ناکام رہے ہوں۔ روزمرہ کی زندگی میں بے شعوری، اخلاقی قدروں میں انحطاط اور صحت عامہ میں تنزل اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ ہماری درسگاہیں بچوں کے اخلاق اور شخصیت کی نشوونما میں غفلت برت رہی ہیں۔ عام بے کاری اور مختلف علوم و فنون میں نالائقی اور افسوسناک سطحیت کے دور دورے سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ ہماری موجودہ تعلیم پیشے کی مناسب رہنمائی میں بھی ناکام رہی ہے۔

تعلیمی دنیا میں یہ افسوسناک صورت حال فوری توجہ چاہتی ہے۔ نفسیات یہاں بھی معاشرے کی صحیح خدمت سرانجام دے سکتی ہے۔ بچوں کی نفسیات سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ مدرسں کا

ہر لحاظ سے صاف ستھرا رکھنا چاہیے۔ معلم کی تربیت اور انتخاب میں احتیاط برتنی چاہیے۔ بچوں کے نصاب کی تدوین نفسیاتی اصولوں پر ہونی چاہیے۔ مختلف اختیاری مضامین کے چناؤ کے لیے بچوں کے طبعی میلانوں کا جائزہ لے کر ان کی مناسب اور بروقت رہنمائی کرنی چاہیے۔ کند ذہن بچوں کو اپنی استعداد سے زیادہ تعلیم حاصل کرنے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ اپنی مخصوص فطری صلاحیتوں کو جگانے اور انھیں بروئے کار لانے میں ہر بچے کی مدد کرنی چاہیے۔ کام چور اور لنگوٹے بچوں کا سائنسی تجزیہ ہونا چاہیے۔ اور محض سزا کی بجائے ان کا مناسب علاج کرنا چاہیے۔ ان تمام باتوں سے ہم اسی صورت پوری طرح مستفیض ہو سکتے ہیں جب معلم، والدین اور بچوں کی نفسیات کا ماہر ایک دوسرے سے تعاون کریں اور اکٹھے مل کر بچے کی رہبری کے لیے منصوبہ تیار کریں۔

افراد ہی کسی ملک کا بہترین سرمایہ ہوتے ہیں۔ آج کے بدچلن باغی شہری کل یہ سے بچے تھے اگر ابتدا میں ان بُرے بچوں کا سائنسی مطالعہ اور علاج ہوا ہوتا تو آج سماج ان میں سے بہتوں کے مہلک مشاغل کی زد سے محفوظ ہوتا۔ اگر ہم اپنے وطن کو طرح طرح کے فسادوں تنگ نظریوں اور روزافزوں بداخلاقیوں سے پاک رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے ملی پروگراموں میں بچوں کی سائنسی تربیت کو مقدم مقام دینا ہوگا۔ اس قسم کی منصوبہ بندی میں ہمیں معلم اور والدین کی سائنسی تربیت۔ تفریح اور کھیل کے مناسب اہتمامات اور مدرسہ میں بچوں کی تعلیم کو نفسیاتی اصولوں پر ڈھالنا ہوگا۔ قوتِ افراد کو اخلاقی اور علمی قلعوں اور پرزنار شخصیتوں کی صورت میں ڈھالنے کے لیے اپنے تعمیری کاموں میں بھلا ہم بچوں کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں؟ ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

٭

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

دولت مشترکہ کے طلبا کے لیے تعلیمی سہولتیں

برطانیہ کی یونیورسٹیوں اور فنی کالجوں کی توسیع کا مطلب یہ ہے کہ سمندر پار ممالک سے آنے والے طلبہ کے لیے زیادہ سے زیادہ نشستیں فراہم کی جائیں گی۔ برطانوی وزیر اعظم مسٹر ہیرلڈ میکمیلن نے پارلیمنٹ کے لیبر ممبر مسٹر فینیر براک وے کے ایک خط کے جواب میں یہ بات کہی۔ دولت مشترکہ کے نو آزاد ملکوں کے طلباء کو جو تعلیمی سہولتیں میسر ہیں خط میں ان کے بارے میں استفسار کیا گیا تھا۔ وزیر اعظم نے لکھا ہے کہ برطانیہ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اس چیلنج کا جواب دے رہا ہے۔ نیز سمندر پار ملکوں کے طلباء کے لیے مزید نشستوں کی فراہمی کی غرض سے منصوبے موجود ہیں۔

مسٹر براک وے نے وزیر اعظم کے نام اپنے مکتوب میں لکھا تھا کہ افریقہ، کیریبین اور ایشیا کے لوگ تقریباً ہر مضمون آرٹ، سائنس، میکنالوجی اور قانون کے کورسوں کے بارے میں مجھ سے استفسار کرتے ہیں۔

وزیر اعظم نے جواب میں لکھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس انتہائی اہم معاملہ میں صرف ہمیں اپنی فرض کا احساس ہے بلکہ ہم حتی الامکان زیادہ سے زیادہ مدد دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بالخصوص یونیورسٹیوں اور فنی کالجوں کی حالیہ توسیع سے سمندر پار کے طلباء کو مزید نشستیں مہیا ہو جائیں گی۔ چنانچہ سمندر پار کے طلباء کے لیے ہوسٹلوں میں تقریباً پانچ ہزار نشستوں اور نئے اور وسیع سماجی اور ثقافتی مرکزوں کی فراہمی کے لیے تیس لاکھ پونڈ کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔

وزیر اعظم نے آگے چل کر کہا ہے کہ جو کچھ حاصل ہو چکا ہے۔ اس کے اعداد و شمار حوصلہ افزا ہیں ۶۱-۱۹۶۰ء میں ۴۳ ہزار سے زیادہ طلبہ ہر قسم کی علمی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ دولت مشترکہ کے طلبہ کو ہر سال تقریباً بیس لاکھ پونڈ کی رقم بلا واسطہ امداد کے طور پر ملتی ہے۔ ان طلباء کو جنھوں سے

یونیورسٹیوں میں داخلہ لیا تھا تیس لاکھ پونڈ سے زیادہ رقم اس قسم کی امداد کے طور پر حاصل ہوئی۔ اس میں کچھ رقم وہ بھی شامل تھی جو نجی چندوں سے حاصل ہوئی تھی۔ (ماخوذ از "اطلاعات")

نابینا لوگوں کی تعلیم و تربیت

لی فی ہُوا جس کے معنی ہیں خوبصورت پھول۔ ایک ۲۷ سالہ خوبصورت چینی خاتون ہیں۔ وہ لندن یونیورسٹی میں سماجی بہبود سے متعلق علوم کا مطالعہ کر رہی ہیں۔ اور تعلیمی مدت کے اختتام پر برطانیہ میں نابینا لوگوں کی نگہداشت کے بارے میں تحقیقاتی مطالعہ سپرد قلم کریں گی۔

نابینا لوگوں کے شاہی قومی ادارہ کی افسر اطلاعات سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ برطانیہ میں نابینا لوگوں کی فلاح و بہبود سے متعلق جو نظام موجود ہے وہ دنیا میں سب سے اچھا ہے۔ کیا آپ اس کی وضاحت کریں گی کہ ایسا کس وجہ سے ہے۔ مس رابرٹسن نے مسکراتے ہوئے ہوئے جواب دیا۔ یہ ایک بڑا سوال ہے تاہم میں کوشش کروں گی کہ حتی الامکان اس کا عام فہم جواب دے سکوں۔

جیسا کہ آپ کو علم ہے۔ نابینا لوگوں کو ہم کچھ مختلف نہیں سمجھتے۔ بلکہ ان کو ایسے عام مرد و خواتین متصور کرتے ہیں جو صرف دیکھنے سے معذور ہیں۔ چناں چہ ہماری کوشش یہ ہے کہ ہم انہیں حسب معمول زندگی بسر کرنے میں مدد دیں۔ تاکہ وہ اپنی معاش خود پیدا کریں اور جس معاشرہ میں وہ رہتے ہیں اس کی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیں۔

"ہم اس یقین دہانی سے کہتے ہیں کہ نابینا بچے بھی بصارت رکھنے والے بچوں کی طرح مکمل تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اور مکمل تربیت حاصل کرنے کے بعد وہ دفتروں اور کارخانوں میں بینا ساتھیوں کے ساتھ مختلف پیشوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔"

چینی لڑکی نے معلوم کیا کہ "ایسا کیوں کر ہوتا ہے؟ کیا اس مقصد کے لیے کوئی خاص سرکاری محکمہ موجود ہے؟"

مس رابرٹسن نے کہا کہ نہیں فی الحقیقت یہاں دو سو ایسے رضاکار ادارے ہیں جو نابینا لوگوں کی

دیکھ بھال کرتے ہیں اور یہ سب ادارے متعدد سرکاری محکموں اور مقامی ارباب اختیار سے قریبی رابطہ قائم رکھتے ہیں۔ اور مل جل کر کام کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا اطمینان کر لیتے ہیں کہ ان کے اضلاع میں جو نابینا لوگ ہیں ان کی باقاعدہ غور و پرداخت کی جاتی ہے۔ تربیت یافتہ اساتذہ وہاں کا دورہ کرتے ہیں اور انھیں وہ سب کچھ امداد ملتی ہے جس کی انہیں اپنی روزمرہ کی زندگی میں ضرورت ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں یہاں چار رضاکار تنظیمیں موجود ہیں۔ جو قومی بنیاد پر مخصوص خدمات فراہم کرتی ہیں۔ برطانیہ کے کسی بھی حصہ میں نابینا لوگوں کے لیے ان کی خدمات موجود ہیں۔ ان میں سے ایک تنظیم جنگ میں اندھے ہونے والوں کی نگہداشت کرتی ہے۔ دوسری تنظیم بریل کتابوں کی لائبریری کا انتظام کرتی ہے۔ تیسری رہنما کتوں کو تربیت دیتی ہے اور انہیں ضرورت مند لوگوں کو فراہم کرتی ہے۔

چوتھی تنظیم جس میں میں کام کرتی ہوں دنیا میں سب سے بڑی ہے۔ ہمارے ہاں بچوں کے لیے خاص اسکول ہیں۔ متعدد مرکز موجود ہیں۔ اور یہ ان مرد خواتین کی مدد کرتے ہیں جو کچھ ہی عرصہ پہلے اپنی بصارت سے محروم ہو گئے ہوں۔ علاوہ ازیں قدرتی طریقہ علاج شارٹ ہینڈ۔ ٹائپنگ۔ ٹیلیفون آپریٹری اور انجینئری سکھانے کے تربیتی کالج ہیں۔ اور ایک مخصوص محکمہ ہے جو فارغ التحصیل طلباء کے لیے ملازمتیں تلاش کرتا ہے۔

بی بی ہُوا نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "کتنا عظیم الشان کام ہے یہ"

"جی ہاں" مس رابرٹسن نے جواب دیا۔ لیکن صرف یہی کچھ نہیں، بلکہ کتابیں اور میگزین بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اور ہم ایسی ہزاروں کتابیں اور رسالے ہر سال اُبھرے ہوئے حروف میں شائع کرتے ہیں اور نابینائی کی تلافی کی غرض سے ہم نے تین سو کے قریب مختلف امدادی آلات اور اوزار تیار کیے ہیں۔ ان میں نابینا بیوی اور ماں کے لیے گھریلو امدادی ساز و سامان سے لے کر ضروری آلات تک شامل ہیں۔ بریل طرز کی گھڑیوں سے لے کر ایسے تاش اور کھیل تک شامل ہیں جنھیں اس طرح بنایا گیا ہے کہ نابینا مرد و خواتین بھی اپنے بینا دوستوں کے ساتھ کھیل سکتے ہیں۔"

"میں نے بولتی ہوئی کتابوں کے بارے میں سنا ہے، ان کی کیا حقیقت ہے؟" بی بی ہُوا نے پوچھا۔

افسر اطلاعات نے جواب دیا۔ ان سے وہ کتابیں مراد ہیں جنھیں ماہرین نے گراموفون ریکارڈوں اور ٹیپ ریکارڈوں کی شکل میں تیار کیا ہے۔ اور ہمارے پاس ٹیپ ریکارڈنگ اور پلے بیک کی جدید ترین مشینیں موجود ہیں۔"

لی فی ہوا نے کہا کہ اب میں سمجھی کہ آپ کا طریق کار کیوں اس قدر مقبول ہے۔ لیکن ان تمام سہولتوں کے باوجود ایک نابینا آدمی کے لیے بڑی جرأت کی ضرورت ہے۔"

مس رابنسن نے جواب دیا کہ یقیناً ان کو ضرورت ہے۔ نابینا لوگوں کو آزادی بے حد پسند ہے۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ انھیں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے میں مدد دیں۔ (این کیلورٹ)

مستقبل کی یونیورسٹیاں

برطانیہ کی بائیس یونیورسٹیوں میں تقریباً ایک لاکھ طلبہ ہیں۔ ان میں سے دس ہزار کے لگ بھگ سمندر پار سے آئے ہیں۔ یہ خاصی مؤثر تعداد ہے۔ لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ ہر سال تقریباً ۳۰،۰۰۰ ملکی اور سمندر پار کے طلبا کسی نہ کسی یونیورسٹی میں جگہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان میں ۱۲،۰۰۰ طلبا کو یقیناً مایوسی ہوتی ہے۔ اور گو ان میں خاصی تعلیمی صلاحیت ہوتی ہے۔ پھر بھی یونیورسٹیوں میں ان کیلئے جگہ نہیں ہوتی۔

یونیورسٹیوں کے حکام یہ تسلیم کرتے ہیں۔ اور ہم سب ہی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ذہین اور قابل نوجوانوں کو چاہے وہ کسی بھی ملک کے ہوں، یونیورسٹی میں داخلہ دینے سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔

لہذا فوری ضرورت کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ طلبا کو تعلیم فراہم کرنے کے لیے کچھ نئی یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آرہا ہے۔ پہلی تین برائٹن، نارورچ اور یارک میں اور دیگر تین کینٹربری، کول چیسٹر اور کوینٹری میں قائم ہوں گی۔

کسی نئی یونیورسٹی کا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ زیادہ سے زیادہ جگہیں فراہم کی جائیں بلکہ اگر صحیح معنوں میں اسے یونیورسٹی بننا ہے تو پھر اسے خود اپنا مقام بنانا ہوگا۔ اور دنیائے علم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ہوگا۔

برائیٹن کے مقام پر سسیکس یونیورسٹی کچھ ہی عرصہ پیشتر کھلی ہے، اس میں پچاس طلبہ کو عارضی رہائش
دی گئی ہے۔ اگلے سال اس میں ۴۰۰ طلبا ہوں گے۔ اور دس سال کے عرصہ میں ان کی تعداد تین ہزار
ہو جائے گی۔

سسیکس یونیورسٹی کا نیا نظریہ اس کے مستقبل کے منصوبوں سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ کسی ایک مضمون
میں گہری خصوصیت حاصل کرنے کی یہاں اجازت نہیں ہوگی۔ اور نہ ہی یہاں ایک مضمون میں آنرز کا کورس
کیا جا سکے گا۔ سائنس میں کورس وسیع ہوگا، اور ہر طالب علم کو کم از کم تین سائنسی مضامین لینے ہوں گے۔ سب سے
زیادہ دلچسپ جدت آرٹس کے شعبہ میں ہوگی۔ جہاں یوروپی، مشرق بعید، افریقی اور برصغیر کے علوم کے
ادارے ہوں گے۔

علم کے یہ نئے میدان سمندر پار کے طلبہ کے لیے بے حد دلچسپی کا باعث ہوں گے کیوں کہ وہ نئے
جغرافیائی علاقوں اور لوگوں سے آشنا ہوں گے کہ جن کی تہذیب سے اب تک یونیورسٹی کی دنیا نے سختی سے
کوتاہی برتی ہے۔

سمندر پار کے بہت سے لوگ لفظ "یونیورسٹی" سن کر فوراً آکسفورڈ یا کیمبرج کی بابت سوچتے
ہیں۔ کئی صدیوں تک وہ برطانیہ کی واحد یونیورسٹیاں تھیں۔ لیکن آجکل ان میں یونیورسٹیوں کی آبادی کا صرف
فیصدی حصہ ہے۔

بائیس یونیورسٹیوں میں سے بیس یونیورسٹیوں کو نیا کہا جاتا ہے اور یہ سب ہی بیسویں صدی میں
قائم ہوئی ہیں۔ نسبتاً کم عرصہ میں انہوں نے چند خاص مضامین پڑھانے میں خاصی شہرت حاصل کر لی ہے
جیسے لندن معاشیات، اور سیاسی بیاسیات کے لیے۔ سائنسی انجینیرنگ کے لیے۔ مانچسٹر ٹیکنالوجی کے لیے۔ اور
ایڈنبرا طب کے لیے مشہور رہیں۔ ہم کو ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کے ان چھ کالجوں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے
جو یونیورسٹی کا رتبہ رکھتے ہیں۔

نئی یونیورسٹی کے قیام کے لیے تین چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ یعنی ابتدائی سرمایہ۔ عملہ اور آمدنی
کے لیے روپیہ پیسہ۔ سسیکس کی نئی یونیورسٹی کے سلسلہ میں کچھ مایہ رہا پانچ لاکھ پونڈ۔ طلباء کا ہوسٹل بنانے کے لیے

عوام نے دیا تھا۔ موجودہ عملہ دوسری یونیورسٹیوں کے تجربہ کار استادوں میں سے لیا گیا ہے۔ یونیورسٹی کے سالانہ اخراجات کے لیے مرکزی حکومت روپیہ پیسہ فراہم کرے گی۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ یہ روپیہ پیسہ عام شہری دے گا۔ جو عام ٹیکس ادا کرتا ہے۔

لیکن کوئی نئی یونیورسٹی ایک دن میں قائم نہیں ہو جاتی۔ ایک جدید کارخانہ کھولنے کی بہ نسبت اس میں زیادہ پیچیدگیاں ہیں۔ یونیورسٹی انسانوں کا معاشرہ ہوتا ہے جس میں اساتذہ اور طلبا، علم کی کھوج میں مصروف ہوتے ہیں۔ تعلیمی معیار قائم کرنے پڑتے ہیں اور اس کے لیے ایک عرصہ درکار ہے۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کو یہ معیار قائم کرنے میں سات سو برس لگے۔ لیکن اصل میں وہ گذشتہ تاریخی دور میں اپنے معیار تک پہنچ گئی تھیں۔ پچھلے پچاس سال میں ہم نے جو سائنسی اور فنی ترقی کی ہے۔ وہ ہمارے آباؤ اجداد تیس صدیوں میں بھی نہیں کر سکے تھے۔ ہمارے تعلیمی نظام کو اس رفتار کا ساتھ دینا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ہمیں اور یونیورسٹیوں کی ضرورت ہے۔

آئندہ دس سال میں چھ یونیورسٹیاں طلبا، کے لیے ستر ہزار سے زیادہ نشستیں فراہم کریں گی اور نوجوانوں کو ہر جگہ یونیورسٹی کی تعلیم کے لیے زیادہ سے زیادہ مواقع ملیں گے۔ (جیک جونز)

دولت مشترکہ تعلیمی کانفرنس

جنوری ۱۹۶۲ء میں دہلی میں جو دوسری دولت مشترکہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس سے دولت مشترکہ تعلیمی تعاون کے تجرباتی دور کے ختم ہونے کی نشان دہی ہوئی۔ اس سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ اس نے یہ توثیق کر دی کہ ۱۹۵۹ء کی آکسفورڈ کانفرنس نے صحیح سمت میں اپنی راہ متعین کی تھی۔ ویسے آکسفورڈ میں جو فیصلے ہوئے تھے اس کانفرنس میں نہ تو ان کو بدلنا مقصود تھا اور نہ ہی یہ خوشگوار احساس پایا جاتا تھا کہ آکسفورڈ میں جو منصوبے تیار ہوئے تھے۔ ان میں سے چند منصوبے ناقابل عمل ثابت ہو چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے، کہ آکسفورڈ کانفرنس کے تمام فیصلوں کی توثیق کی گئی اور بعض کو آگے بڑھایا گیا۔

دہلی کانفرنس میں یہ فیصلہ ہوا کہ انگریزی زبان سے متعلق ایک دولت مشترکہ مرکزِ اطلاعات۔ دولت مشترکہ تعلیمی رابطہ کمیٹی کی زیرِ ہدایت لندن میں قائم کیا جائے۔

اس فیصلہ کا برطانیہ کے وزیرِ تعلیم سر ڈیوڈ ایکلیس نے خاص طور پر خیر مقدم کیا اور بیس سے تیس تک اعلیٰ سند یافتہ ماہرین کو تربیت دینے کے لیے برطانیہ کے فیصلہ کا اعلان کیا۔ یہ ماہرین اپنی تربیت کے بعد اساتذہ تربیتی کالجوں میں انگریزی کے پروفیسروں کو تربیت دیں گے۔ کانفرنس کے ابتدائی مرحلہ میں وزیرِ اعظم ہندوستان مسٹر نہرو نے انگریزی کو بطور ایک ثانوی زبان سیکھنے، دولت مشترکہ اور دنیا میں باہمی مواصلات اور اعلیٰ فنی ترقی کے ذریعہ کے طور پر اس کی اہم ضرورت پر زور دیا۔ مختلف جگہوں میں مختلف اساتذہ جو انگریزی بولتے ہیں اس میں اختلاف اور فرق پر انہوں نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ انگریزی تو بولنے لگتے ہیں لیکن ایک دوسرے کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ چنانچہ لندن میں ایک مرکز ہر جگہ انگریزی کی درس و تدریس کے لیے ایک مشترکہ اساس فراہم کرنے میں کافی کام کر سکتا ہے۔

دہلی کانفرنس میں ان منصوبوں کی ضرورت تسلیم کی گئی جو دیہی اور سماجی تعلیم پر محیط ہوں۔ کانفرنس میں سماجی تعلیم زیرِ غور آئی۔ اس سے مراد بالغ مردوں اور عورتوں کی غیر رسمی تعلیم ہے۔ تاکہ اس کی بدولت وہ معاشرہ میں بھرپور اور زیادہ مفید زندگی گذارنے کے قابل ہوں۔ اس مقصد کو آگے بڑھانے کی غرض سے تجربہ کار اور سماجی کارکنوں اور اساتذہ کو موجودہ اسکیموں کے تحت تربیت دی جا سکتی ہے۔ یا ان کی خدمات مستعار لی جا سکتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ دیہی تعلیم اعلیٰ معیار کی ہونی چاہیے۔ نیز اساتذہ کی تربیت اور ان کی خدمات مستعار دینے سے متعلق اسکیموں کو مزید توجہ ملنی چاہیے۔

کانفرنس کے بڑے بڑے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ تھا کہ ۱۹۵۹ء کے بعد سے ہونے والی ترقی کا جائزہ لیا جائے۔ نیز ان انتظامات کی توثیق کی جائے جو اس وقت کیے گئے تھے۔ کانفرنس نے اس مؤثر ترقی کا بھی جائزہ لیا جو وظائف اور فیلوشپ منصوبہ کے تحت دیکھنے میں آئی ہے۔ اس منصوبہ کا مقصد یہ ہے کہ بیک وقت ایک ہزار وظائف دیے جائیں اور یہ مقصد اس سال حاصل ہو جائے گا۔ اساتذہ تربیتی سہولتوں میں اضافہ کو کانفرنس نے تسلیم کیا۔ علاوہ ازیں اس نے پوری دولت مشترکہ میں مزید اساتذہ کی ضرورت کو بھی تسلیم کیا۔ اساتذہ کی تربیت کی نشستوں کے لیے جو آٹھ سو نئے وظائف ۱۹۵۹ء سے دیے جا چکے ہیں، وہ اب بھی ناکافی ہیں۔ اساتذہ کی خدمات فراہم کرنے کے معاملہ میں کانفرنس نے اندازہ لگایا کہ

اب بھی کافی کام کرنا باقی ہے۔ چناں چہ اس نے ترقی پذیر ممالک کے لیے اساتذہ کی خدمات حاصل کرنے کے سلسلہ میں مزید ذرائع پر سوچ بچار کی۔

آکسفورڈ یونیورسٹی نے تجربہ کے طور پر ایک "مسلسل مشینری" دولت مشترکہ تعلیمی رابطہ کمیٹی اور یونٹ کی شکل میں قائم کی تھی جو قریب قریب دو سال سے لندن میں کام کر رہی ہے۔ دہلی کانفرنس نے نہ صرف اس مشینری کی توثیق کی بلکہ اس کے فرائض میں مزید اضافوں کی بھی سفارش کی۔ مثال کے طور پر معلومات کی بہم رسانی اور ماہرین کی چھوٹی چھوٹی کانفرنسوں کا انعقاد۔ یہ کانفرنس اسی قسم کی ہوں گی جیسی مکوئیر میں انگریزی کو بطور ایک ثانوی زبان پڑھانے کے بارے میں ہوئی تھی۔

دہلی کانفرنس زیادہ تر ایک مستعد اور عملی کاروباری کانفرنس تھی۔ ویسے دولت مشترکہ تعلیم تعاون کی اب تک کی کامیابی کا اس کے انتہائی اہم گاہکوں یعنی ترقی پذیر ممالک کے ردعمل سے اندازہ کیا جائے گا۔ ان کی ضروریات عظیم اور روز افزوں ہیں۔ اور کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ تمام کی تمام پوری ہو رہی ہیں۔ دہلی میں ان ملکوں نے صاف الفاظ میں بتایا کہ وہ مزید امداد چاہتے ہیں اور بعجلت چاہتے ہیں۔ بہرحال انھوں نے اس کام کو سراہا جو پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مزید امداد ملنے والی ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ دولت مشترکہ بحیثیت مجموعی ان کی ضروریات اور ان کے مسائل کو سمجھتی ہے ؞ (راب سینفلڈ) ماخوذ از "اطلاعات" کراچی اپریل ۱۹۶۲ء

۱۴ شمارہ ۱۴ 1 AUG 1962 مئی ، جو

اس شمارے میں

آموزش لاہور

مئی و جون ۱۹۶۲ء

جلد ــــــ ۱۴
شمارہ ــــــ ۱۴ و ۱۵

سالانہ چندہ
پاکستان کے لیے ۶ روپے
غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ باسٹھ پیسے ۶۲

پبلشر
یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۳۱۹، انارکلی لاہور سے شائع کیا گیا

اداریہ

حکومتِ پاکستان کے انقلابی اقدامات میں نئی صوبائی تنظیم بھی شامل ہے جو یکم جون سے منظرِ عام پر آگئی ہے۔
ایک مدت سے ہماری صوبائی حکومتوں کی خواہش تھی کہ جس طرح بھی پڑے امورِ عامہ کے
انتظام و انصرام کو عوام کے قریب لایا جائے اور عامۃ الناس کے قضیئے حتی الوسع اپنے ہی علاقے میں
مقامی افسروں کے ذریعے سے طے ہو جایا کریں لیکن ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ کامیابی نہ
ہونی تھی نہ ہوئی۔ اور "حد سے بڑھی ہوئی مرکزیت" کے زیرِ سایہ مقامی افسروں کے ناکافی اختیار اور
ناقص نگرانیٔ کار کے باعث امورِ عامہ بخیر و خوبی انجام نہ پا سکے۔ کیونکہ محکموں کے صوبائی افسر جو نگرانی
واحتساب کا اختیار رکھتے تھے۔ اپنے اختیارات کو مؤثر طریق سے استعمال نہ کر سکے۔ جبکہ ریجن
اور ڈویژن کے متعلقہ افسران یا تو ان اختیارات سے محروم تھے یا اختیارات کو اچھی طرح
بروئے کار لانے سے قاصر۔

آخر اگست ۱۹۶۱ء میں کابینہ کے فیصلے کے مطابق نئی صوبائی تنظیم سے متعلق ایک کمیٹی
بنائی گئی جس نے اصلاحِ حال کے پیشِ نظر ریجن کے ڈائرکٹروں، کمشنروں اور اضلاع کے افسروں
کو مزید اختیارات سپرد کرنے کی سفارش کی اور یکم جون ۱۹۶۲ء سے اس پر عمل شروع ہو گیا۔

کمیٹی کی رائے میں پرانے صوبائی انصرام کا ایک غیر جمہوری پہلو یہ تھا کہ مقامی سطح پر ذمہ داری
یا خدمتِ خلق کا احساس مٹتا جاتا تھا۔ اگرچہ بنیادی جمہوریتوں کے معرضِ وجود میں آجانے سے
اس روش میں کچھ خوش گوار تبدیلی ضرور پیدا ہو گئی تھی۔

کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں ایک معلوم عام ذریعۂ زحمت کا بڑی دلسوزی سے ذکر کیا ہے اور وہ
ذریعۂ زحمت "سرخ فیتہ" ہے جو سرکاری دفاتر کی کارکردگی میں رکاوٹیں پیدا کرتا رہتا ہے۔ کمیٹی نے
دفاتر کے طریقۂ کار کی پیچیدگی اور اذیت رسانی کی نشان دہی کر کے یہ جتا دیا ہے کہ نام نہاد مرکزیت کو دور کرنے کے
باوجود خاطر خواہ فوائد حاصل نہ ہوں گے۔ تاوقتیکہ مفوضہ اختیارات کے طریق استعمال کو نسبتاً زیادہ سادہ
اور معقول پسندانہ بنا دیا جائے۔

کمیٹی کی کوشش تھی کہ ایک ایسی سکیم بنائی جائے جو لامرکزیت (DECENTRALIZATION)
ہوتے ہوئے، موثر نگرانی اور ربط و ترتیب کی حامل ہو، اور جس کی بدولت نظم و نسق کے فضول پڑت دور
ں عوام اور ارباب انتظام کے درمیان اشتراک عمل پیدا ہو، صیغہ ملازمت میں مساوات راہ پائے،
بائی تنظیم کے مختلف وسائل میں جو عدم تعاون پایا جاتا ہے وہ رفع ہو جائے۔

جہاں تک تعلیمات کا تعلق ہے یونیورسٹیاں، کالج فنی و صنعتی تعلیم، معلمین کے تربیتی ادارے،
تعلیم، ابتدائی تعلیم، لائبریریاں، عجائب گھر، کھیل اور ثقافتی فعالیتیں، محکمۂ تعلیم کی تحویل میں چلی
ہیں لیکن نئی صوبائی تنظیم کے مطابق یونیورسٹیاں، بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن، ٹیکنیکل
ین، اور پولی ٹیکنکس (وا نفنڈ ن) براہ راست صوبائی مرکز کی نگرانی میں رہیں گے۔ مرکز توسیع تعلیم
EDUCATION EXTENSION CEN) دفتر تعلیم (BUREAU OF EDUCATION) اور
مافی تعلیم PHYSICAL EDUCATION AND SPORTS CENTRE کو (EDUCATION
SECRETAI کے ملحقہ دفاتر (ATTACHED OFFICES) کے طور پر برقرار رکھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں کمیٹی کی
نات کے مطابق صوبے کے صدر مقام لاہور میں تین نئے ملحقہ دفتر (۱) دفتر مطبوعات BUREAU OF
PUBLICATI (۲) دفتر امتحانات BUREAU OF EXAMINATION اور (۳) بہرے گونگے
بینا طلبہ کے مخصوص مدارس کے لیے دفتر انسپکٹری (SPECIAL EDUCATION
INSPECTORATE OF SCHOOL FOR DEAF, DUMB AND BL
ہو گئے ہیں۔ باقی فعالیتیں صوبائی مرکزیت سے علیحدہ کر کے ریجنل ڈائرکٹرز کی تحویل میں دے دی گئی ہیں۔ اور
ت تعلیمات مغربی پاکستان (DIRECTORATE OF PUBLIC INSTRUCTION) کو ختم کر دیا گیا۔
مغربی پاکستان کے ایجوکیشن سیکرٹری کو نیابت و اعانت کے لیے دو مشیر (عام تعلیم و فنی تعلیم) اور دو ڈپٹی
ر کا (برائے انصرام تعلیم) مقرر ہوئے ہیں۔ ایجوکیشن سکرٹریٹ کے عملے میں ان چار عہدیداروں کے علاوہ مذکورہ بالا
ملحقہ دفاتر کے عملے بھی شامل ہیں، جو متعلقہ ڈائرکٹروں کے زیر نگرانی فرائض انجام دیں گے۔

نئی تنظیم سے قبل، تعلیمی مقاصد کے پیش نظر، صوبہ مغربی پاکستان، پشاور ریجن، لاہور ریجن، حیدر آباد
کوئٹہ ریجن اور کراچی ریجن میں منقسم تھا لیکن اب نئی تنظیم کے تحت، سابق لاہور ریجن کو دو حصوں میں

(باقی صفحہ ۲۰۰ کے پیچھے ملاحظہ ہو)

ثانوی مدارس میں ٹیوٹوری یل

محمد علی طالب یزدانی

ٹیوٹوری یل (TUTORIAL) انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کا ترجمہ "اتالیقی حلقۂ درس" کیا جا سکتا ہے۔ اس سے مراد تعلیمی اداروں کی ایک ایسی جاندار فعالیت ہے جس کا وجود کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نظر آتا ہے آج کل ایسے حلقوں کا مقصد صرف اتنا ہوتا ہے کہ چند متعلمین ایک معلم کے ساتھ کچھ وقت ایسا گذاریں کہ جس میں شرکائے حلقہ ایک دوسرے کو قریب سے دیکھ سکیں اور "نغمۂ با صفا در مع ماکدر" کے تحت ایک دوسرے سے عمداً متاثر اور مستفید و مستفیض ہو سکیں۔ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ تعلیم شاہد ہے کہ ہمارے لیے اس فعالیت کا نام ضرور اجنبی ہے مگر اس کا تصور اجنبی نہیں اتالیقی حلقۂ درس درحقیقت بذاتِ خود ایک مدرسہ یا درس گاہ ہے اور قدیم درس گاہوں کی عملی شکل ٹھیک ایک حلقۂ درس کی سی ہوتی تھی اور ہمارے معاشرہ کی قدیم ترین روایات میں سے یہ روایت محترم ترین اور عزیز ترین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ درس و تدریس کا اعلیٰ ترین مرحلہ آج بھی ایک حلقۂ درس کی شکل اختیار کرنے پر مجبور ہے۔ چناں چہ ہمارے ہاں ایم اے کلاسز اتالیقی حلقۂ درس کی شکل میں لگتی ہیں۔ مگر افسوس کا مقام ہے جن مدارج تعلیم میں متعلمین کو متاثر کرنے اور ہونے کی نسبتاً زیادہ ضرورت ہے۔ انھی مدارج میں یہ حلقے رواج نہ پا سکے جس کا سبب معلم و متعلمین میں "نسبت" کا مسئلہ ہے۔ یعنی ابتدائی اور ثانوی مدارس میں ایک ایک معلم کے پاس متعلمین کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے یہ ایک ایسی مشکل ہے جس کا حل بڑے بڑے ترقی یافتہ ممالک کے پاس بھی نہیں۔ مگر ان ممالک نے اپنے جملہ قومی وسائل کو کام میں لاتے ہوئے اپنے نظامِ تعلیم میں مسلسل تجربات کے

یہ انقلابی تبدیلیاں کرلی ہیں اور آج بھی تجربات کا سلسلہ جاری ہے۔ کیونکہ بمرورِ ایام افراد کا فلسفۂ حیات بدلتا رہتا ہے۔ اور نتیجتہً فلسفۂ تعلیم میں تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے۔

وطنِ عزیز میں بھی اربابِ حل و عقد نے مسئلۂ تعلیم کو جملہ قومی مسائل کی اساس خیال کر کے اس طرف توجہ دینا شروع کی ہے اور صد سالہ بے روح نظامِ تعلیم کی اصلاح کی طرف کچھ عملی قدم اٹھائے ہیں ان اقدامات کے نتائج کے متشکل ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ مگر اس وقت کو قریب سے قریب تر لانے کے لیے ہمیں یقینِ محکم کے ساتھ عملِ پیہم کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ پیشِ نظر مضمون میں انہی اصلاحی اقدامات میں سے ایک کا قابلِ عمل خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔ یعنی ثانوی مدارس میں "اتالیقی حلقے" کس نہج پر قائم کیے جا سکتے ہیں۔ مگر مکمل بحث کرنے سے بیشتر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس نئی تحریک کے پس منظر کا تفصیلی جائزہ لے لیا جائے۔

پس منظر

قومی تعلیمی کمیشن نے نونہالانِ پاکستان کی تعلیم و تربیت کے لیے نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں (۱۹۵۹ء تک) رائج الوقت نظامِ تعلیم کا جائزہ لیا اور اصلاحِ احوال کے لیے نہایت دور رس نتائج کی حامل تجاویز پیش کیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر تجاویز کو عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ اگر ان انقلاب آفریں اصلاحات کا بنظرِ امعان مطالعہ کیا جائے اور ان کی روح کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو مجموعی طور پر ان مشوروں کی تہ میں نئی پود کے متعلق یہ محکم عقیدہ کارفرما نظر آئے گا کہ ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

کمیشن کی رپورٹ میں ان تمام تعلیمی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ جو پاکستان کو درپیش ہیں اور مختلف مدارجِ تعلیم کے مخصوص مسائل کو حل کرنے کے لیے عملی تجاویز پیش کی ہیں چنانچہ ثانوی درجہ کو ایک خود مختار درجہ کی حیثیت دے کر اس درجہ میں زیرِ تعلیم بچہ کی چہار گانہ نشو و نما کے لیے اسے چار حیثیتیں دی گئی ہیں :-

فرد — شہری — کارکن — محب وطن

ثانوی درجہ کے متعلم کی متذکرۂ الصدر ہر حیثیت سے تربیت کے لیے کمیشن نے مندرجہ ذیل مشورے دیے ہیں۔

(ا) بحیثیت فرد

(۱) متعلم میں تجسس کا مادہ اور آزاد فکر کی عادت اور حاصل کردہ معلومات کو عملی زندگی میں استعمال کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔

(۲) تعلیم و تدریس کے سارے پروگرام میں سن بلوغ کی مخصوص حاجتوں اور رجحانات کو مدنظر رکھا جائے۔

(۳) مدرسے کی جملہ نصابی و ہم نصابی فعالیتوں کو اس طرح منظم کیا جائے کہ متعلم میں قائد خصائل پروان چڑھ سکیں۔

(۴) متعلمین کی جمالیاتی حس کی آبیاری کی جائے اور انھیں اس کے صحت مندانہ اظہار کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ نیز ان میں اپنی ثقافتی اقدار کے لیے جذبۂ استحسان کو ابھارا جائے۔

(۵) باقاعدہ کھیلوں اور منظم جسمانی تربیت کے ذریعہ متعلمین میں سپورٹسمین سپرٹ پیدا کی جائے۔

(ب) بحیثیت شہری

(۶) متعلمین کو ضبطِ نفس، محنت اور دیانت کے اوصاف سے متصف کیا جائے۔

(۷) ان میں سماجی ذمہ داریوں کا احساس پیدا کیا جائے اور انھیں اخلاقی و رفاہی مشاغل کی طرف مائل کیا جائے۔

(۸) خدمت و تعاون کے جذبات کی تربیت کی جائے۔

(۹) مدرسی زندگی اور تعلیم کو متعلمین کی عملی و سماجی زندگی سے ہم آہنگ رکھا جائے

(ج) بحیثیت کارکن

(۱۰) متعلم کے قلب ونظر میں احترامِ کار کا جذبہ پیدا کیا جائے۔

(۱۱) فنی، سائنسی اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے متعلم کے مخصوص میلانات اور رجحانات معلوم ومتعین کیے جائیں اور ایسی تعلیم کی مبادیات سے عملاً روشناس ہونے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

(د) بحیثیت محب وطن

(۱۲) قومی ثقافت اور اسلامی اقدارِ حیات سے متعلمین کو ایسے انداز میں روشناس کرایا جائے کہ ان کے دل ودماغ میں ان روایات واقدار کے ساتھ ایک گونہ شیفتگی پیدا ہوسکے۔ اور وہ ان پر فخر کر سکیں

(۱۳) قومی ووطنی افتخار سے سرشار کرنے کے لیے متعلم کو تاریخ وتحریک پاکستان سے ایسے انداز میں آگاہ کیا جائے کہ وطن دوستی اور خدمتِ وطن کے جذبات ابھر سکیں۔

(۱۴) حب وطن کے جذبہ کو تنگ نظری اور تعصب کی شکل اختیار کرنے سے بچانے کی خاطر انسان دوستی کے پاک جذبہ کی آبیاری کی جائے اور اخوت بین الملل کی راہیں ہموار کی جائیں۔

ان چودہ نکات کو تعلیمی کمیشن نے ثانوی تعلیم کے اغراض ومقاصد قرار دیا ہے اور انہی قندیلوں کی روشنی میں نئے نصابِ تعلیم کی تدوین کی گئی اور نئی کتبِ نصاب تیار کی گئی ہیں۔ مگر متذکرہ بالا مقاصد کو کما حقہٗ حاصل کرنے کے لیے نصابی فعالیتوں اور نئی کتبِ نصاب پر تکیہ کرنے سے کہیں زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ثانوی مدارس کے مدرسین بالعموم اور صدر مدرسین بالخصوص اپنے اپنے زاویہ ہائے نگاہ اور اسالیبِ فکر میں ایک گونہ انقلاب پیدا کریں۔ کیوں کہ تاریخ شاہد ہے کہ آج تک کسی قوم یا تعلیمی نظام میں نصاب یا کتبِ نصاب نے انقلاب پیدا نہیں کیا۔ بلکہ یہ سہرا ہمیشہ بڑے بڑے معلمین کے سر رہا ہے۔

کمیشن نے اپنے وطن عزیز کے وسائل وضروریات کو پیش نظر رکھ کر معلمین کے لیے

مشعل راہ مہیا کردی ہے۔ اب اِس راستہ پر گامزن ہوکر اہل قافلہ کو لیلائے منزل سے ہم کنار کرنا ارباب مدرسہ کا کام ہے۔ مدرسین کو یہ بات نہیں بھولنا چاہیے کہ کوئی کتاب نصاب مدرس کی جگہ نہیں لے سکتی۔ اور جامع سے جامع نصاب تعلیم ٹکر کے فقیر کو بھٹک جانے سے نہیں بچا سکتا۔

——— اور بے دلی یا نیم دلی سے تیار کی ہوئی نصابی فعالیتیں قوم میں ذہنی انقلاب پیدا نہیں کرسکتیں۔ کتب نصاب اور نصابی فعالیتیں تو محض نمرکز توجہ اور تنظیم ساعی کی ایک کوشش ہوتی ہیں اور امتحانات (جو مدرسین کے اعصاب پر سوار ہیں) ان ساعی کے ثمرات کو دیکھ سکنے کی ایک نامکمل خواہش۔ لہٰذا ضرورت اِس امر کی ہے کہ نصاب اور کتب نصاب کی زیر سطح رووں پر نظر رکھ کر ثانوی مدارس میں ہم نصابی فعالیتوں کا ایک ایسا جال بچھایا جائے جو ہم خرما و ہم ثواب کی عملی تفسیر بن سکے۔ ہمارے ثانوی مدارس میں رائج مندرجہ ذیل فعالیتوں کو "غیر نصابی" فعالیتیں کہا اور نتیجتاً "غیر" یعنی "فالتو" سمجھا جاتا ہے۔ مگر متعلمین کی ذہنی و جسمانی تربیت میں ان فعالیتوں کا عمل دخل اتنا شدید و مفید ہے کہ ہمیں ان کی پیشانی سے لفظ "غیر" مٹا دینا اور انھیں خود نصاب کے ہمدوش کھڑا کرکے انھیں "ہم نصابی" فعالیتوں کا نام دینا چاہیے۔

(۱) ادبی فعالیتیں:- بلند خوانی۔ مقالہ خوانی۔ تقریر۔ مباحثہ وغیرہ۔

(۲) ڈرامے:- تمثیلچے اسٹیج کرنا۔ اور کتب نصاب میں سے موزوں اقتباسات لے کر انھیں مکالموں اور تمثیلچوں میں ڈھالنا۔

(۳) معاشرتی فعالیتیں:- سکاؤٹنگ۔ گرل گائیڈنگ۔ کوآپریٹو سٹور چلانا وغیرہ۔

(۴) منظم کھیلیں:- نٹ بال، ہاکی، کرکٹ، کبڈی، باسکٹ بال۔ بیڈمنٹن وغیرہ

(۵) باغبانی:- باغبانی۔ سکے۔ یا ڈاک کے ٹکٹ اکٹھے کرنا، فوٹو گرافی اور تصویر کشی۔

(۶) تعلیمی سیر:- تعلیمی سیر جو محض سیر سپاٹا بن کر نہ رہ جائے بلکہ متذکرۃ الصدر بیشتر دیگر فعالیتوں کے لیے میدان عمل ثابت ہو۔

عملی طور پر ہمارے ثانوی مدارس میں کھیلوں اور سکاؤٹنگ کے علاوہ دیگر فعالیتوں کی

ت بہت کم توجہ دی جاتی ہے اور ان سے بھی معدودے چند طلباء فائدہ اٹھاتے ہیں۔ زیادہ صحیح
الفاظ میں (فائدہ نہیں بلکہ) لطف اٹھاتے ہیں۔ یعنی مدرسہ میں مہیا ہونے والی فعالیتوں کو محض
تفریح خیال کرتے ہیں۔ چند ایک مدارس میں "ادبی فعالیتوں" کے تحت جو تھوڑا بہت کام ہوتا ہے
اس کی حیثیت بالکل نمائشی ہوتی ہے۔ کبھی ثانوی تعلیمی بورڈ یا کسی دیگر ادارہ کی طرف سے تقریری یا
مضمون خوانی کا مقابلہ منعقد ہو تو اس کے لیے افراتفری کے عالم میں دو چار طلبا کو تیار کر لیا جاتا ہے اور بس
یا دس سے زیادہ ڈیڑھ "بزم ادب" کے نام سے ایک پیریڈ ٹائم ٹیبل میں رکھ دیا اور پندرہ بیس منٹ
کے اس پیریڈ میں طلبا لطیفہ گوئی اور گانے وغیرہ گا کر دل بہلا لیتے ہیں۔ یہ اور ایسی کوتاہیاں
حاصل بے تدبیری اور فقدان تنظیم کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یا پھر ان فعالیتوں کی حقیقی افادیت کو نظر انداز
کر کے محض نمود و نمائش کی خاطر ان کو جاری رکھا جاتا ہے۔ جو خود فریبی ہی نہیں بلکہ پیشہ ورانہ بددیانتی
کے مترادف ہے۔ مذکورۃ الصدر مختلف النوع فعالیتوں میں سے زیادہ سے زیادہ اپنے مدرسہ میں
جاری کرنے کے بجائے اگر کوئی ایک دو باقاعدگی اور پوری توجہ سے جاری کی جائیں تو مجموعی طور پر کہیں
بہتر نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ کسی فعالیت کا انتخاب کر کے اسے جاری کرنے سے
پیشتر اس کے لوازمات کا تا حد امکان فراہم کرنا نہایت ضروری ہے۔ جس کی مفصل بحث آئندہ
صفحات میں پیش کی جا رہی ہے۔

تعلیمی کمیشن نے ہم نصابی فعالیتوں کو جنم دینے والے تصورات اپنی رپورٹ میں جا بجا پیش
کیے ہیں۔ جو ناخدایانِ مدرسہ کے لیے دعوتِ فکر کی حیثیت رکھتے ہیں اور جو ہم نصابی فعالیتوں کی
ترتیب و تنظیم میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ مثلاً:۔

۱۔ خود مدرسین کو مثالی کردار پیش کرنا چاہیے اور ان کے قول و فعل میں تضاد نہیں ہونا چاہیے
انھیں چاہیے کہ جن اقدارِ حیات سے بچوں کو مزین کرنا چاہتے ہیں خود اس کا نمونہ پیش کریں
اور بچوں کو ان اقدار کا مظاہرہ کرنے کے لیے موزوں مواقع فراہم کریں۔

۲۔ متعلمین کے لیے حتی الامکان ہر فعالیت میں جاندار شرکت کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

۳ ۔ مدرسہ کی چار دیواری، اور حتی الامکان، اس سے باہر بھی مدرس متعلمین کے کردار پر ایک مشفق اور ماہر نفسیات باپ کی حیثیت سے نظر رکھے ۔

۴ ۔ کھیل کے میدان کو کردار سازی کی کارگاہ سمجھا جائے ۔

۵ ۔ متعلمین کے مخصوص میلانات و رجحانات کا اندازہ کرتے ہوئے انھیں اپنی اپنی صلاحیت کو جلا دینے کے مواقع فراہم کیے جائیں ۔

۶ ۔ متعلم کو صحت مند خود اظہاری کا زیادہ سے زیادہ موقع دیا جائے ۔

۷ ۔ ہر آڑے وقت (ذہنی نفسیاتی الجھن میں) اس کی رہنمائی کی جائے ۔

۸ ۔ قومی اور بین الاقوامی اہم مسائل سے متعلمین کو روشناس کرایا جائے ۔

۹ ۔ مقامی مسائل کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی جائے اور انھیں اپنی بساط کے مطابق حل کرنے کی دعوت دی جائے ۔

۱۰ ۔ ہر مدرسہ اپنی تاریخ مرتب و مدون کرے اور متعلمین کو اس تاریخ میں سنہرے ابواب کا اضافہ کرنے کا شوق دلایا جائے ۔

۱۱ ۔ ہر مدرسہ اپنا اسکول میگزین شائع کرے ۔

۱۲ ۔ سماجی رفاہی تحریکوں میں عمل شرکت کا شوق دلایا جائے ۔

یہ اور اس قسم کے دیگر بیش بہا مشورے کمیشن کی رپورٹ کے ہر باب میں مل سکتے لیکن ان خطوط پر کوئی جامع رائحہ عمل مرتب کرنا خود معلمین کا کام ہے۔ مگر تعلیمی کمیشن نے اس سلسلہ میں بھی اساتذہ کی رہنمائی ضروری ہے اور وہ اس طرح کہ اوقات مدرسہ کی تقسیم کرتے ہو اس میں Tutorials اور Guidance کے لیے مجموعی طور پر ۲۰۰ گھنٹے کی گنجائش رکھی ہے۔ مکمل تقسیم ملاحظہ ہو۔

کمیشن نے اپنی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مدرسین ثانوی مدارس سے توقع کہ وہ تعطیلات و امتحانات وغیرہ نکال کر سال بھر میں ۲۲۵ ایام کار میں کل ۱۶۰۰ گھنٹے تعلیم

کام کریں۔

مدریس	ٹیوٹوریل	گائیڈنس	تیاری اسباق	تحریری کام کی درستی
۸۰۰	۲۰۰	۱۰۰	۳۰۰	۲۰۰

ثانوی مدارس کے مدرسین کے لیے اس تقسیم کار میں دو چیزیں بالکل نئی ہیں یعنی ـــ ریل اور گائیڈنس"۔ جہاں تک گائیڈنس کا تعلق ہے کمیشن نے اس کا مفہوم اور مختلف ج تعلیم سے بحث کرتے ہوئے ہر درجہ کے لیے اس کا) دائرہ عمل متعین کر دیا ہے۔ لہذا یس لائحہ عمل ابھی معرض تعین میں ہے۔ کیوں کہ ایک طرف تو خود مدرسین کو اس کام کی نوعیت ری طرح مطالعہ کرنے کے لیے وقت اور خصوصی تربیت درکار ہے اور دوسری طرف اس و باقاعدگی اور سائنسی طریق پر کرنے) کے لیے خاص مواد تیار کرنا باقی ہے مثلاً: ذہنی آزمائشیں لنامے، ہر بچے کے مسلسل ریکارڈ کے خاکے اور گوشوارے اور رجسٹر وغیرہ۔

ان لوازمات کی عدم موجودگی میں ثانوی مدارس میں گائیڈنس کے پروگرام پر باقاعدہ عمل ا مدسکن العمل اور چنداں مفید بھی نہیں۔ یہ مسئلہ فی الحقیقت خاصا نازک ہے۔ اور بقول ڑ عبدالرؤف" اٹکل پچو گائیڈنس" مفید نہیں بلکہ مضر ثابت ہوگی تعلیمی نفسیات کے ماہرین کو ں طرف فوری توجہ دینا چاہیے۔ اور اپنے تجربات قوم کے سامنے پیش کرنے چاہئیں۔ تاکہ ولہ بالا لوازمات کی تیاری کی کوئی صورت پیدا ہو سکے۔

دوسری نئی چیز یعنی ٹیوٹوریل کے لیے مخصوص ۲۰۰ گھنٹے ۲۲۵ ایام کار میں بآسانی اس طرح پھیلائے جا سکتے ہیں کہ ہر نصف یوم کار یعنی ہفتہ کے پانچویں یا چھٹے دن کے شروع یا آخر میں ایک گھنٹہ "ٹیوٹوریل" کے لیے نقشۂ اوقات میں شامل کر لیا جائے اور اس پیریڈ کو بزم طلبا، یا بزم ادب، یا حلقۂ ادب، یا "تدریسی حلقہ" ایسا مختصر نام دے دیا جائے اور اس ہفتہ وار ایک گھنٹہ کے پروگرام کو بیک وقت مدرسہ کی جملہ ہم نصابی فعالیتوں اور سٹوڈنٹس کونسل" کا مرکزہ (NUCLEUS) بنا لیا جائے جس کا تفصیلی خاکہ درج ذیل ہے۔

ٹیوٹوریل کے اغراض و مقاصد

۱۔ سن بلوغ کے ہیجانی دور کی طرف گامزن متعلمین کے لیے خود اظہاری کے صحت مند مواقع فراہم کرنا۔

۲۔ اضافی مطالعہ، مضمون نویسی، مقالہ خوانی اور تقریر کی مشق کرانا۔

۳۔ متعلمین میں وسعتِ نظر، رواداری، خود اعتمادی پیدا کرنا، اور باہمی افہام و تفہیم اور اظہار مافی الضمیر میں مہارت پیدا کرنا۔

۴۔ بلند خوانی، مباحثوں اور دیگر بین المدارس مقابلوں کے لیے طلباء کی تربیت کرنا۔

۵۔ سکول میگزین کے لیے معتدبہ مضامین فراہم کرنا۔

۶۔ متعلمین کے طبعی میلانات اور انفرادی صلاحیتوں کا پتہ لگانا۔

۷۔ معلم و متعلمین کو موقع دینا کہ وہ ایک دوسرے کو زیادہ قریب سے دیکھ سکیں۔

۸۔ رسمی تعلیم و تدریسِ نصاب کے نتائج کا جائزہ لینا۔

۹۔ شہریت و جمہوریت کے تقاضوں سے بچوں کو عملی طور پر روشناس کرانا۔

۱۰۔ مدرسہ کی جملہ ہم نصابی فعالیتوں کی منصوبہ بندی کرنا۔

۱۱۔ سٹوڈنٹس کونسل کی فعال شاخوں کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے ہر فریق اور ہر جماعت کو کام کرنے کا موقع فراہم کرنا۔

یہ مقاصد فی الحقیقت ثانوی تعلیم کے اغراض و مقاصد کی عملی تفسیر ہیں۔ لہٰذا ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے جو فعالیتیں منظم و مرتب کی جائیں گی۔ وہ دراصل نصابی فعالیتوں کے کارآمد عملی نتائج ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علمائے تعلیم نے سرے سے نصابی و غیر نصابی یا ہم نصابی کے فرق کو ہی کارِ عبث قرار دیا ہے۔ ویسے بھی مدرسہ کی جملہ فعالیتوں کا آخری مقصد صرف اتنا ہے کہ متعلم کو اپنے ماحول سے مطابقت و ہم آہنگی پیدا کرنے کے قابل بنایا جائے اور بالآخر ہمہ جہتی نشوونما دے کر ایک متوازن شخصیت پیدا کی جائے جس پر قومی کردار کا نمانہ اپنی بہار

دکھا رہا ہو۔ بنابریں ہمیں چاہیے کہ موجودہ صورتِ حال میں نصابی فعالیتوں کے ساتھ ساتھ
ہم نصابی فعالیتوں کو محض دو حصوں میں تقسیم کرلیں۔

(ا) ذہنی ہم نصابی فعالیتیں۔

(ب) جسمانی ہم نصابی فعالیتیں

موضوع زیر بحث پہلی قسم کی ہم نصابی فعالیتوں سے متعلق ہے۔ لہٰذا مدرسہ کی جملہ ذہنی نشوونما کی ضامن ہم نصابی فعالیتوں کو یکجا کرنے کی خاطر ایک منظم لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا جو "ٹیوٹوریل گروپ پیریڈ" میں ایک حد تک حاصل ہو سکتا ہے۔ یا کم از کم متعلمین میں ایک خاص انداز کا اور انتظامِ عمل پیدا کیا جا سکتا ہے۔

"ٹیوٹوریل گروپ پیریڈ" کا تنظیمی خاکہ درج ذیل ہے۔

- یہ پیریڈ ہفتہ کے نصف یوم کار (یعنی پانچویں یا چھٹے دن) کے آغاز یا آخر میں رکھا جائے
- ہر جماعت کے ہر فریق میں اس پیریڈ کے لیے متعلمین میں سے باقاعدہ انتخاب کے ذریعہ ایک صدر، دو نائب صدر، ایک سیکریٹری، اور دو نائب سیکریٹری منتخب کرائے جائیں
- پیریڈ کی کارروائی ایک اجلاس کی صورت اختیار کرے۔
- صدر جلسہ نظم و ضبط کا ذمہ دار ہوگا۔ سیکریٹری پہلے سے تیار کردہ ایجنڈہ کے مطابق جلسہ کی کارروائی جاری رکھے گا۔ اور نائب سیکریٹری جلسہ کی روئداد مرتب کرے گا جو آئندہ اجلاس میں پڑھی جائے گی اور صدر اس پر تصدیقی دستخط کرے گا۔
- صدر مجلس کا یہ بھی فرض ہوگا کہ وہ مدرس کے مشورہ سے سارے پروگرام میں سے ا[illegible] مدرسہ کی مختلف ہم نصابی فعالیتوں کے دائرہ [illegible]

[illegible]

تدوین سیکرٹری خود کرے گا۔ سکول لائبریری یا کلاس لائبریری کا میں رکھنے کے قابل کتب و رسائل کا مطالبہ متعلقہ حضرات تک پہنچائے گا وغیرہ وغیرہ

متعلقہ معلم جلسہ میں شرکت کرے گا۔ مگر ایک مبصر اور رہنما کی حیثیت سے طلبہ کو ان کی کوتاہیوں پر دوران جلسہ تنبیہ نہ کرے گا، بلکہ جلسہ کے اختتام پر ایک شفیق رہنما کی حیثیت سے ان پر تبصرہ کرے گا۔

ٹیوٹوریل گروپ پیریڈ کا دائرۂ عمل

۱۔ تقریر، مباحثہ جس کے ضمن میں طلبا کو ایک دوسرے سے اختلاف رائے کے آداب کی تربیت دی جائے اور مخالفت اور اختلاف رائے میں عملاً تمیز کر سکنے کے قابل بنایا جائے۔

۲۔ منتخبہ مضامین اور نثری اقتباسات کی بلند خوانی و خوش خوانی۔

۳۔ کتب نصاب میں شامل مضامین کے موافق یا مخالف مضامین دیگر کتب و رسائل میں سے نکال کر سنانا اور اس پر بحث و تنقید کرنا۔

۴۔ اپنی پسند کے اشعار سنانا اور ان کی تشریح و وجہ پسندیدگی بیان کرنا۔

۵۔ مدرسہ کے مسائل کو زیر بحث لانا اور ان کو سلجھانے کے لیے تدابیر سوچنا اور اپنے فیصلے مدرسین انچارج کے ذریعے ہیڈ ماسٹر تک پہنچانا۔

۶۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی طرف سے آمدہ خاص ہدایات پر عمل درآمد کرنے کے لیے لائحہ عمل تیار کرنا۔

۷۔ سکول کی بہتری کے لیے تجاویز پیش کرنا۔

۸۔ لطیفہ گوئی اور تمثیلیے پیش کرنا۔

۹۔ کلاس میگزین مرتب کرنا اور کسی مد کے متعلق فیصلہ کرنا کہ اسے سارے مدرسہ کے سامنے سکول اسمبلی میں پیش کیا جائے۔

جسمانی صحت اور کھیلوں کے متعلق معلومات پر مبنی تقاریر کا انتظام کرنا۔ یہ کام سکول کے پی۔ ٹی۔ آئی اور مختلف کھیلوں کے انچارج صاحبان باری باری ہر فریق سے خطاب کر کے

بطریق احسن سرانجام دے سکتے ہیں۔

۱۱۔ جماعت کے کمرہ کی صفائی اور آرائش کی تدابیر اختیار کرنا۔

کامیاب اتالیقی حلقوں کے مقتضیات

اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے مندرجہ ذیل امور کی طرف خاص توجہ دینا ہو گی۔

۱۔ صدر معلم اور معاون معلمین کے تعلقات اور ان کے عملی مظاہرے نہایت صحت مند اور متعلمین کے لیے قابل تقلید ہوں۔

۲۔ معلمین کے باہمی تعلقات اور ان کے عملی مظاہرے مثالی ہوں۔

۳۔ روزانہ سکول اسمبلی میں باری باری تمام یا اکثر مدرسین طلبائے مدرسہ سے خطاب کریں۔

۴۔ نیوز بورڈ کا باقاعدہ اور درست استعمال۔ خود مدرسین کا حالات حاضرہ سے واقف رہنا، اور وقتاً فوقتاً مختلف مدرسین کا طلبائے مدرسہ سے خطاب کرنا۔ مثالی موضوعات۔ نہری پانی کا جھگڑا۔ مسئلہ کشمیر۔ لاؤس کا مسئلہ۔ تنازعہ سویز۔

۵۔ سکول لائبریری کے استعمال کے لیے جامع پروگرام مرتب کرنا اور اس پر عمل کرنا۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل امور پر خاص توجہ دینا ہو گی:۔

لائبریری میں موجودہ کتابوں کی مطبوعہ فہرست ہر طالب علم کے پاس ہونا چاہیے۔ یہ فہرست جامع ہونا چاہیے اور اس کے تین حصے ہونے چاہئیں:

(ا) مضمون یا موضوع کے اعتبار سے کتابوں کی فہرست۔

(ب) مصنفین یا موضوع کے اعتبار سے کتابوں کی فہرست۔

(ج) ہر جماعت کے لیے موزوں کتابوں کی فہرست۔

رسائل و اخبارات کے انتخاب کے سلسلہ میں صرف غیر صحت مند تحریکات کے حامل جرائد پر سکول لائبریری کا دروازہ بند ہونا چاہیے۔ حتی الوسع سارے رسائل و اخبار کا سکول لائبریری میں رکھا جانا اور ان کے باقاعدہ فائل بنوانا ضروری ہے۔ ان جرائد میں طلباء کے لیے مفید مطلب

مضامین پر اساتذہ نشانات لگاتے رہیں اور لائبریرین ان فائل میں لگائے ہوئے نشان زدہ مضامین کو فائل کے انڈکس میں درج کرتا رہے مستقل دلچسپی رکھنے والے مضامین کو کتب لائبریری کی فہرست میں شامل کرنا ہوگا۔

۷ - کلاس لائبریری :- سکول لائبریری پر دباؤ کم کرنے کی خاطر اور زیادہ سے زیادہ طلباء کو اس سے مستفید ہونے کا موقع دینے کے لیے کلاس لائبریری کی تنظیم از بس ضروری ہے زیادہ قیمتی کتب حوالہ جات اور کم یاب و نایاب کتب کے علاوہ اکثر و بیشتر کتب کلاس لائبریری میں تقسیم ہونا چاہئیں ۔

(ت) جہاں تک ممکن ہو سکے کلاس ٹیچر سسٹم اپنایا جائے۔ تاکہ ایک "فریق" میں ایک طرف نصابی و ہم نصابی اور دوسری طرف مدرسہ کی جملہ ہم نصابی فعالیتوں میں باہمی رابطہ پیدا کرنے کے لیے ایک فرد واحد اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لا سکے اور مدرسہ میں ایک صحت مند جذبۂ مسابقت پیدا ہو سکے۔

۸ - سکول اسمبلی :- ثانوی مدارس میں ہر یوم کار کا آغاز سکول اسمبلی سے ہونا چاہیے ۔ جس میں صدر معلم کا بنفس نفیس موجود ہونا ضروری ہے۔ اسمبلی کی کارروائی کلام پاک کی ایک دو آیات کی تلاوت ان کے ترجمہ اور نہایت مختصر تشریح سے ہو۔ تلاوت و ترجمہ عربی کے منتخبہ طالب علم کریں اور تشریح کوئی نہ کوئی مدرس یا پھر صدر معلم یا مختلف ہم نصابی فعالیتوں کے انچارج مدرسین اہم اعلانات (اگر کوئی ہوں) کریں اور اس کے بعد ٹیوٹوریل گروپس کے سالانہ ہفتہ کے ایک دو منتخبہ امور پیش کیے جائیں۔ یا کوئی مدرس خطاب کرے۔ یہ سارا پروگرام پندرہ سے بیس منٹ کا ہونا چاہیے۔ سٹیج سکرٹری کے فرائض سٹوڈنٹس کونسل کا صدر یا نائب صدر ادا کرے گا۔ اسمبلی کا اختتام قومی ترانہ پر ہوگا۔ عملی طور پر یہ پروگرام بے حد متنوع بنایا جا سکتا ہے۔ اور ایسا کرنا ہوگا ۔

۹ - طلبہ کی کونسل :- اس پر مفصل بحث کسی دوسری صحبت میں ہو گی۔ یہاں پر اس کا مختصر خاکہ

اور اغراض و مقاصد پیش کیے جاتے ہیں۔

"سٹوڈنٹس کونسل" طلبا کی ایک نمائندہ جماعت ہوتی ہے جس کا مقصد سکول کی بہتری اور ترقی کے لیے مختلف تجاویز پر غور کرنا اور مدرسہ کے مسائل کا حل سوچنا ہوتا ہے۔ یہ نمائندہ جماعت صدر معلم اور معلمین کے انتظامی امور میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ اس جماعت کے ذریعہ ایک ایسا ماحول اور سکول سپرٹ پیدا ہوتی ہے جس کے بل بوتے پر مدرسہ کی مختلف فعالیتیں ور ان جڑ جاتی ہیں اور مدرسہ صحیح معنوں میں ایک کمیونٹی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

سٹوڈنٹس کونسل میں مختلف جماعتوں اور کلبوں وغیرہ کے نمائندہ طلبا شامل ہوتے ہیں۔ جو فی الحقیقت سکول گورنمنٹ کی بیک وقت مجلس قانون ساز کی حیثیت بھی رکھتی ہے، اور انتظامیہ کی بھی۔ جمہوریت و خود اختیاری کے اس ماحول کی بدولت نظم و ضبط کی بہت سی الجھن . . . . کے پیدا ہونے کا امکان بہت حد تک ختم ہو جاتا ہے۔ پھر یہ ایک ایسا تجربہ ہے جو طلبا کو آئندہ زندگی بسر کرنے کے لیے عملی تربیت کا موقع فراہم کرتا ہے۔

اس کونسل کے اختیارات کا دار و مدار مدرسہ کی عام حالت پر منحصر ہے۔ جیسے حسن تدبیر سے بہتر سے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ مدرسہ کی عام حالت جتنی بہتر ہو گی اتنا ہی اس کونسل کے اختیارات کا دائرہ وسیع تر بنایا جا سکتا ہے۔

۱۰۔ سکول سپرٹ

مصطلحات مدرسہ میں سے جامع ترین اصطلاح "سکول سپرٹ" ہے جو ایک ایسے جذبہ کا نام ہے جس کے تحت ہر مدرس اور ہر متعلم اس بات پر فخر محسوس کرتا ہے کہ وہ اس خاص تعلیمی ادارہ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کے طفیل مدرسہ کی کوئی بھی فعالیت کامیابی کے جملہ مراحل طے کر سکتی ہے۔ اس جذبہ کے پیدا کرنے کے لیے مدرسین کو بالواسطہ اور بلا واسطہ بہت کچھ کرنا پڑے گا جس کا ہلکا سا خاکہ اس مضمون میں پیش کیا گیا ہے۔

سکول سپرٹ سے مراد وہ جذبہ ہے جس کے تحت متعلم اور معلم دونوں اپنے مدرسہ کو

محض زبان ہی سے اپنا نہ کہیں۔ بلکہ ذہناً و قلباً بھی اسے اپنی عزیز متاع تسلیم کریں۔ اس کے
محاسن و روایات پر فخر کا اظہار کریں اور کمزوریوں اور کوتاہیوں کو ... دور کرنے
کے لیے عمل پیرا ہوں۔ اگرچہ یہ کام آسان نہیں اور اس کی ذمہ داری صرف مدرسین (جس میں صدر
مدرس بھی شامل ہے) کے کندھوں پر ہے۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مدرسین کو مشنری سپرٹ
سے کام کرنا ہوگا۔ دراصل کسی مدرسہ کے لیے اپنے محدود وسائل کے اندر رہ کر اس جذبہ کا پیدا کرنا کوئی
مُحال نہیں کیونکہ مشاہدہ بتاتا ہے کہ غریب سے غریب انسان اپنے گھر کو بہترین سمجھتا ہے۔ مجبور سے
مجبور والدین اپنے بچے کو بہترین بچہ سمجھتے ہیں۔ اور یہ کرشمہ ہے اُس خاص زاویۂ نگاہ کا جس کا
اظہار انسان کسی شے کے ساتھ لفظ "میرا" کا اضافہ کر کے کرتا ہے۔ میرا بچہ۔ میرا گھر۔ ایک مدرسہ
سے تعلق رکھنے والے متعلمین اور معلمین میں اگر یہ سپرٹ پیدا ہو جائے تو مدرسہ کی فضا پر فعالیت نہایت
آسانی سے کامیابی کے مراحل طے کر سکتی ہے۔ مدرسہ میں پیدا ہونے والے نت نئے مسائل کی
تعداد انتہائی طور پر محدود ہو جائے گی۔ نہ مدرسہ میں گندگی پھیلے گی نہ فرنیچر ٹوٹے گا۔ نہ نتائج خراب
ہوں گے۔ اور نہ طلباء یا والدین کی شکایات صدر معلم کے قیمتی وقت کو دیمک کی طرح چاٹ سکیں گی۔

اس نئے تجربہ اور تحریک کی کامیابی کا دارومدار مندرجہ بالا مقتضیات پر ہے۔ مگر آخری اور
اہم ترین تقاضہ یہ ہے کہ ان تمام مساعی کے نتائج دیکھنے کے لیے مدرسین یا صدر مدرس یا والدین
صبر و تحمل کا دامن تھامے رہیں۔ یہ منصوبہ اینٹ پتھر جوڑنے کا منصوبہ نہیں کہ جس کی تکمیل کا اندازہ
ساتھ ہی ساتھ ہوتا رہے ...... کوشش کا نتیجہ فوری طور پر دیکھنے کی آرزو بھی ایک
طرح خود غرضی اور خود نمائش کی آرزو کو پالنے کے مترادف ہے۔ اور ایک قوم یا نسل کو بنانا کوئی
سال چھ مہینے کا کام نہیں۔ بلکہ اس کے لیے مسلسل مگر منظم کوشش کی ضرورت پڑتی ہے اور دیرینہ
پروگرام کی راہ میں تو بے شمار مشکل مقام آئیں گے۔ مدرسین کو ہی اپنا زاویۂ نگاہ بدلنے پر مائل
کرنے کے لیے صدر معلمین کو بالخصوص بہت زیادہ کوشش کرنا ہوگی۔ اور صحیح معنوں میں اپنی
قائدانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہوگا۔

متذکرۃ الصدر مقتضیات تحریک کی تفصیلی بحث سے راقم الحروف کی مراد یہ نہیں کہ جب تک یہ تمام عوامل معروفِ عمل نہ ہوں اس وقت تک اتالیقی حلقے قائم ہی نہ کیے جائیں۔ بلکہ ہر ثانوی مدرسہ کو اپنے محدود وسائل کو سامنے رکھتے ہوئے اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ کام کرنا ہی ہوگا۔

بقیہ اداریہ

تقسیم کر دیا گیا ہے جن میں سے ایک حصہ (یا ریجن) سرگودھا ڈویژن اور راولپنڈی ڈویژن پر مشتمل ہے۔ اور دوسرے ریجن میں لاہور ڈویژن، بہاولپور ڈویژن اور ملتان ڈویژن شامل ہیں۔

بچوں کی تربیت

صوفی گلزار احمد

انسانی سیرت و کردار کی تعمیر میں بچپن کا زمانہ نہایت اہم مانا گیا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں انسانی عادات و اطوار کی ابتدا ہوتی ہے۔ اور پھر ان کی نشو و نما ہوتی ہے۔ اس نشو و نما کے ساتھ ساتھ جذبات اور احساسات بھی ترقی کرتے ہیں۔ اگر ان تمام کی نشو و نما صحیح طور پر کی جائے تو متوازن شخصیت پروان چڑھے گی۔ لیکن ایسی نشو و نما میں والدین کی تعلیم و تربیت کو کافی دخل حاصل ہے۔ بچوں کے ذہن کو سمجھنا اور پھر ان کے جذبات اور احساسات کے مطابق کوئی راہِ عمل اختیار کرنا ہی تعلیم کا سب سے بڑا جوہر ہے۔ آئیے ہم بچوں کی تربیت کے اس پہلو پر نظر ڈالیں اور ان خامیوں کو بھی دیکھیں جو بچوں کی شخصیت کی تعمیر کے تحت روزمرہ زندگی میں عام نظر آتی ہیں۔

عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ بچہ پانچ سال کی عمر تک بڑی آزادی سے بڑھتا پھولتا اور نشو و نما پاتا ہے۔ جذباتی اور احساساتی لحاظ سے اُس پر کسی قسم کی روک ٹوک نہیں ہوتی۔ لیکن جونہی وہ پانچ چھ سال کی عمر کو پہنچتا ہے۔ اس تمام آزادی کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے۔ اور وہی والدین جنھوں نے اسے ہر قسم کی آزادی دے رکھی تھی اور اُسے محبت و شفقت کا مرکز بنایا تھا اس تمام آزادی کو سلب کر دیتے ہیں۔ پہلے پہل تو یہ حال ہوتا ہے کہ بچے نے جو کچھ کھانے پینے کو چاہا لا کر حاضر کر دیا۔ جس قسم کے کھلونے پسند کیے وہ مہیا کر دیئے۔ جس کسی بات پر ضد کی اسے جھٹ مان لیا۔ غرضکہ بچے کو کسی قسم کی تکلیف میں مبتلا نہ ہونے دیا اور اسے ناز و نعمت میں پالتے رہے۔ لیکن جب بچہ پانچ سال کی عمر میں والدین کے تیور بدلتے ہوئے دیکھتا ہے تو اُس کی اُمنگوں اور آرزوؤں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ مسکراتا ہوا چہرہ دیکھنے کا عادی بن چکا ہوتا ہے۔ اگر اسے لمحہ بھر کے لیے غضبناک چہرہ نظر

طر آجائے تو چیخنا چلّانا شروع کر دیتا ہے۔ اور اس وقت تک چیختا چلّاتا رہتا ہے، جب تک
دوبارہ اسے کوئی مسکراہٹ سے نہ دیکھ لے اور اسے محبت کی آغوش میں نہ لے۔ اسے یوں
محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے کوئی ہمدرد اور مونس اُس سے روٹھ کر چلا گیا ہے۔ اور اب
اس کی جگہ کسی نامہربان اور اجنبی نے لے لی ہے۔ اور اس کا اب دنیا میں کوئی بھی سہارا نہیں
رہا۔ چنانچہ وہ اپنے آپ کو تنہا خیال کرنے لگتا ہے۔ ایک ایسے فرد کی مانند جسے نازونعمت
سے محروم کر دیا گیا ہو۔ وہ اس نازونعمت کے لیے بے قرار رہتا ہے۔ اور اس ہمدردی کا متلاشی ہوتا
ہے جو اسے پہلے نصیب تھی۔ ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے والدین کا یہ فرض ہے کہ وہ بچوں
کو آزادی سونپتے ہوئے اس بات کا خیال رکھیں کہ کہیں یہ آزادی بچے کے ذہن پر اثر انداز
نہ ہو۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ بچے کو کسی بات کا پابند کرنا ہو۔

دورِ حاضر میں اکثر لوگ اس آزادی کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جہاں تک
ہو سکے بچوں کو آزاد چھوڑ دینا ہی بہتر ہے بالفاظ دیگر بچوں کو لاڈ پیار سے پالنا اور انھیں ہر قسم
کی نازونعمت سے نوازنا بچے کی شخصیت کو سنوارنا ہے۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر بچے کی ہر خواہش
کو پورا نہ کیا گیا تو یہ عین ممکن ہے کہ وہ آئندہ زندگی میں کسی ذہنی الجھن میں مبتلا ہو جائے۔ لیکن
جہاں تک نفسیاتی نقطۂ نظر کا تعلق ہے اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آزادی کا یہ راستہ بچوں
کے ذہن کی متوازن تعمیر کے لیے کسی صورت بھی مفید نہیں بلکہ مہلک ہے۔ جہاں تک ہو سکے
والدین کو ایسی آزادی سے ہمیشہ بچنا چاہیے۔ جن لوگوں نے مختلف بچوں اور نوجوانوں کی ذہنی
الجھنوں کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات پر متفق ہیں کہ اکثر بچے اور نوجوان جو ان الجھنوں میں مبتلا
نظر آتے ہیں وہ دراصل بچپن میں اسی آزادی کا شکار تھے اور ان کی پرورش بڑی نازونعمت
میں ہوئی تھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسا طریقہ ہے جس کی مدد سے بچوں کی صحیح اور متوازن
تربیت کی جا سکتی ہے اور انھیں معاشرے کا مفید فرد بنایا جا سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے۔

کہ ایسی تربیت کا دارومدار خود والدین پر ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ والدین نے بچوں کے ساتھ کتنا
مناسبت پیدا کر رکھی ہے۔ وہ بچوں کی صحیح اور متوازن نشو و نما کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ایک لائحہ
کی تعمیر کرنا ہوگی۔ ایک ایسا لائحہ عمل جس کی مدد سے بچوں کو صحیح اور مناسب راستے پر گامزن
کیا جا سکے۔ جب کبھی وہ آزادی کے مستحق ہوں تو انہیں آزادی دیدی جائے۔ اور جب کبھی انہیں
کسی بات کا پابند کرنا ہو تو ان کے ساتھ سختی سے پیش آیا جائے۔ یہ نہیں کہ انہیں ہر من مانی بات
کرنے کی آزادی نصیب ہو اور یہ چیز ان کے اخلاق و کردار کو بگاڑ کر رکھ دے۔ جہاں تک اخلاق
کو سدھارنے اور ان کی متوازن نشو و نما کا تعلق ہے والدین کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ بچوں کی
بری عادات کی روک تھام کریں اور ان کے لیے معاشرے میں بہتر جگہ پیدا کریں۔ زیادہ لاڈ پیار
تو کسی صورت بھی مفید نہیں۔ ضرورت سے زیادہ لاڈ پیار بچے کی ذہنی تعمیر کے لیے مہلک ہے۔ ...
اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ بچے جنھیں والدین سے والہانہ محبت ہوا اور وہ بڑے چاؤ چوچلے سے پلے
ہوں ان کی غیر موجودگی میں اکثر اوقات پریشانی و اضطراب کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ ہر لمحہ انہیں دیکھنے کے
متلاشی ہوتے ہیں۔ بیشتر ایسے بچوں میں اکثر بے خوابی بھی دیکھنے میں آتی ہے جس کے باعث
وہ روز بروز لاغر ہوتے جاتے ہیں۔ بھوک غائب ہو جاتی ہے اور وہ گردو پیش کی کسی چیز میں
بھی دلچسپی نہیں لیتے۔ ان کی بیماری کا واحد علاج یہی ہوتا ہے کہ انہیں دوبارہ وہی محبت نصیب
ہو جس سے وہ محروم ہو چکے ہیں۔

اس کے برعکس بچے کے ساتھ بے جا سختی کا برتاؤ بھی اس کی مناسب تربیت کے رہنمائی
ہے۔ بچے کو ہر لمحہ جھڑکنے اور مارنے پیٹنے سے اس میں بغض و کینہ کا جذبہ ابھرتا ہے اور وہ ضدی
اور ہٹ دھرم بن جاتا ہے اور اکثر اوقات وہ بغاوت پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے اور والدین کی
چوری چھپے حکم عدولی کرتا ہے۔ ایسی حالت میں بچے کے بگڑنے کا زیادہ احتمال ہے۔ ایسے
بچے گھر کے ناسازگار حالات کے باعث گھر سے باہر ہی وقت گزارنے میں مسرت محسوس
کرتے ہیں۔ اور اکثر اوقات وہ بری صحبت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بچے کو مناسب محبت کے برتاؤ کی

دیتے ہیں تو اس میں تحفظ کا احساس لازماً برقرار رہے گا اور اسے دلی سکون محسوس ہوگا چنانچہ ایسی حالت میں یہ عین ممکن ہے کہ وہ ایسی محبت و شفقت کے عوض آپ کی اس بات کو بھی ماننے کے لیے تیار ہو جائے جو اُسے ہرگز پسند نہیں۔ اسے ذاتی مطابقت کا نام دیتے ہیں۔ یعنی بچہ اپنی ذات اور والدین کی ذات میں مطابقت پیدا کر لیتا ہے۔ ان کا ہر حکم ماننا اور ان کی عادات و اطوار کو اپناتا ہے۔

ان تمام باتوں کے علاوہ والدین کا وقتی طور پر جذبات کی رو میں بہہ جانا بھی مفید نہیں رہتا وقتی خوشی اور جوش کی حالت میں کسی بچے کو مکمل آزادی دے دینی اور اسے کسی بات پر منع نہ کرنا اور دوسرے وقت جبکہ بچہ وہی چیز دہرا رہا ہو۔ تو غصے کی حالت میں اُسے جھڑکنا اور اسے سزا دینا کسی حالت میں بھی مفید نہیں۔ ایسا کرنے سے بچے پر یہ کبھی واضح نہیں ہوتا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ بچہ ہمیشہ آواز، بولنے کے انداز اور چہرے کے اثرات کو پرکھنے کا عادی ہوتا ہے۔ اور اسی پرکھ اور مطالعہ کے مطابق اپنا کردار بناتا ہے لیکن جب کبھی وہ تضاد دیکھتا ہے تو اسے سخت اضطراب لاحق ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس پر خوف طاری ہوتا ہے اور تحفظ کا احساس بھی جاتا رہتا ہے۔

گھر میں ماں باپ کی ناچاقی اور نا اتفاقی بھی بچوں کے لیے مہلک ہے۔ جب کبھی ماں نے بچے کو سرزنش کی اور اسے روکا ٹوکا تو بچے نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ اور باپ کے پاس آکر آہ و فریاد کی۔ چنانچہ باپ نے فوراً اسے دلاسا دیدیا اور اُسے ہر بُری سے بُری عادت ڈالنے کی آزادی دیدی اور اس طرح اس کی کسی ضد کو بھی قابل اعتنا خیال نہ کیا۔ اسی طرح اگر باپ نے کچھ سختی سے کام لیا تو ماں نے اسے لاڈ پیار سے چھاتی سے لگا لیا۔ ایسی حالت میں ماں اور باپ کے سلوک میں کافی تفاوت ہوتا ہے۔ ایک آدمی گھر میں بچے کے ساتھ سختی سے کام لیتا ہے تو دوسرا اس کی حمایت کے باعث محبت و شفقت کا اظہار کرنے لگتا ہے جس کا نتیجہ لازماً یہ ہوتا ہے کہ بچے کے ذہن پر یہ چیز گہرے نقوش چھوڑ جاتی ہے۔ وہ ایک فرد کو اپنا دشمن اور دوسرے کو اپنا ہمدرد

اور ساتھی خیال کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ وہ دوسرے فرد کے ساتھ اپنی محبت وابستہ کر دیتا ہے۔ اُس کے نزدیک وہی اس کی محبت کا مرکز اور اس کی امیدوں اور آرزوؤں کا گہوارہ ہوتا ہے۔ اس بات کا آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ نہایت خود سر اور ضدی بن جاتا ہے۔ وہ ہر بات کو منوانے کا عادی بن جاتا ہے خواہ وہ کتنی ہی ناجائز اور نامناسب کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اسے یہ تسلی ہوتی ہے کہ اس کا ہمدرد اور مونس گھر میں موجود ہے۔ جو اس کی ہر ناجائز بات بھی سننے کے لیے تیار ہے۔ اس کے علاوہ گھر میں والدین کی مسلسل ناچاقی بچے کو ماحول سے بیزار کر دیتی ہے۔ وہ گھر سے باہر کی دنیا میں رہنا پسند کرتا ہے۔ چنانچہ ایسے اکثر بچوں کے آوارہ ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں والدین کا اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔ بچوں کے سامنے کبھی ایسی چیز کا مظاہرہ نہ کریں جس کے باعث وہ گھر سے باہر بیزاری کا اظہار کرنے لگیں۔ چنانچہ والدین کے باہمی تعاون ہمدردی اور خندہ پیشانی سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔

بچہ ابتدائی پانچ سال کے دوران میں گھر کے ہر فرد کا غائر مطالعہ کرتا ہے۔ اور اس طرح ان کے متعلق اپنی رائے قائم کر لیتا ہے۔ رائے قائم کرنے کے بعد وہ اس کے مطابق اپنا کردار بھی دکھاتا ہے۔ اگر بچے کو ایسی صورت میں کسی قسم کی رکاوٹ پیش نہ آئے تو وہ ماحول سے جلد مناسبت پیدا کر لیتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر اسے سازگار حالات میسر نہ ہوں تو وہ اُن کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیتا ہے۔ کیونکہ وہ کسی صورت بھی یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی خودی کو کسی قسم کی ضرب پہنچے اور وہ قابلِ اعتنا نہ سمجھا جائے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ نہایت خود سر اور شرارتی بن جاتا ہے اور ہر بات کے لیے بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ آپ نے اکثر گھروں میں والدین کو یہ شکایت کرتے دیکھا ہوگا کہ ہمارا بچہ تو نہایت شرارتی اور خود سر ہے اور اس پر کسی قسم کی نصیحت کارگر نہیں ہوتی۔ انہیں اس بات کی بالکل خبر نہیں ہوتی کہ بچے کو دراصل خود انہوں نے خود سر بنایا ہے۔ اگر اس کی مناسب تربیت کی جاتی تو وہ کبھی ایسے کردار کا مظاہرہ نہ کرتا۔

ہمارے سکول اور موسمیات کا مطالعہ

پروفیسر فرحت اللہ خاں

ترقی یافتہ دور میں اگر طلبا کو ترقی پسند قوموں کی طرح اپنے ماحول سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے قابل نہ کیا جائے تو وہ نیچے قوم اور ملک، پسماندہ قوموں اور ملکوں کے زمرے میں شمار ہونے لگتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے ہمیں اپنے فضل و کرم سے دنیا میں خلیفہ بنا کر بھیجا ہے۔ اور تمام وہ چیزیں جو زمین، سمندر اور آسمان میں ہیں، انہیں ہماری خدمت کے لیے بنایا ہے۔ اس لیے کرۂ زمین کرۂ آبی اور کرۂ ہوا میں جو کچھ ہے اس کی معلومات کرنا ہمارے لیے ضروری ہے۔

ان دولتوں میں جو قدرت نے ہمیں مہیا کی ہیں۔ کرۂ ہوا ہمارے لیے سب سے اہم ہے اس میں ہم رہتے اور سانس لیتے ہیں۔ اس کے لیے سمندر کا پانی بادل بن کر ہمارے شہر تک آتا ہے اور چھم چھم کر کے برس جاتا ہے۔ اس کی گرمی اور سردی ہمارے ہر کام پر اثر ڈالتی ہے۔ ہماری عادتیں، خوراک، لباس مکان اور رہن سہن کے طریقے بدل جاتے ہیں۔ چناں چہ جن بچوں کو بڑے ہو کر اس معاشرے میں اپنی زندگیاں گزارنی ہیں ان کے لیے موسمیات کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ اگر انھیں اپنے فضائی ماحول میں دلچسپی ہو گئی تو ان کی انفرادی قابلیت قومی ترقی پر اثر انداز ہو گی۔ ایسا معاشرہ اپنے ماضی، حال اور مستقبل میں دلچسپیاں لیتا ہے اور طلباء میں عملی اور سائنسی اہلیتیں پیدا کرتا ہے۔ جن سے مالا مال ہو کر طلباء زمانۂ حاضرہ کے مفید شہری بن سکتے ہیں۔ اور مغربی اقوام کے (جو نوزائی اور آسمانی سیاروں کی دوڑ دھوپ میں پیش پیش ہیں) ہم پلّہ بن سکتے ہیں۔ کتنی خوشی کی بات ہے کہ حال ہی میں فضائی مطالعہ کرنے والے پاکستانی سائنس دانوں نے اپنے پہلے کامیاب راکٹ فضا میں چھوڑے ہیں۔ امید ہے

یہ راکٹ ہمارے ملک کی فضائی اور موسمیاتی مطالعہ میں غیر معمولی اضافہ کریں گے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

کسی مقام پر موسمیات اور آب وہوا میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ موسمیات کے مطالعے سے مراد اس مقام کی روزانہ فضائی حالت ہوتی ہے۔ یعنی درجۂ حرارت۔ ہوا کا رُخ۔ ہواؤں کی رفتار بارش۔ ہوا میں نمی وغیرہ

فضائی مطالعہ کی ایک سال کی جدوجہد کے بعد ہمیں پتہ چلتا ہے کہ کسی مقام پر آب ہوا کیسی ہوتی ہے۔ پس آب وہوا موسمیات کے کئی سالہ مطالعے کی اوسط کا نام ہے۔

موسمیات کا مطالعہ

کسی دن کی گرمی اور سردی کی حالت۔ ہوا کا دباؤ اور اس کا ہواؤں کے رُخ اور رفتار پر اثر۔ بارش کی مقدار سکول کے طلبہ میں فضائی مطالعہ کا جذبہ پیدا کر سکتے ہیں۔ ان کی پیمائش کے لیے ہر سکول میں سائنسی آلات موجود ہوتے ہیں۔ اگر نہ بھی ہوں تو ان آلات کا ہونا ضروری ہے۔

(۱) فارن ہیٹ تھرمامیٹر ..... درجہ حرارت کی پیمائش کے لیے۔

(۲) میکسیم و مینیمم تھرمامیٹر ..... زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم درجۂ حرارت کی پیمائش کے لیے۔

(۳) ویٹ اور ڈرائی بلب تھرمامیٹر ..... ہوا میں نمی کا مطالعہ کرنے کے لیے۔

(۴) ان لائڈ بیرومیٹر ..... ہوا کا دباؤ معلوم کرنے کے لیے۔

(۵) بارش پیما ..... بارش کی پیمائش کے لیے۔

(۶) مُرغ بادنما ..... ہوا کا رخ ظاہر کرنے کے لیے۔

موسمی رپورٹ

استاد اور طلباء کا تعاون سکول میں باقاعدہ موسمی حالات جمع کرنے میں بڑی مدد دیتا ہے سکول میں ہفتہ وار چند طلباء چن لیے جاتے ہیں جو روزانہ موسمی حالات جمع کرتے ہیں۔ استاد ان کی تصحیح کرتا ہے اور ہر روز موسمی حالات کے بورڈ پر لکھنے میں ان کی اعانت کرتا ہے۔ موسمی

حالات کے بورڈ کی تفاصیل مندرجہ ذیل ہیں :-

جگہ کا نام ..... لاہور ۔ دن بروز جمعہ مہینہ ..... مئی ۱۹۶۲ء

مقام کی سطح سمندر سے بلندی .... ۷۰۰ فٹ وقت ۸ بجے بعد از صبح

تاریخ	ہوا کا رُخ	بارش	دباؤ	درجہ حرارت				
				فارن ہیٹ	میکسیمم	مینمم	ویٹ	ڈرائی

طالب علم کا نام ....

اگر اس قسم کا ریکارڈ باقاعدہ رکھا جائے تو بچے اپنے کام میں عملی رنگ پیدا کر لیتے ہیں۔

کسی مقام کا موسمی جائزہ وہاں کے باشندوں پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ مثلاً انسان کے تفریحی مشاغل۔ اس کی مقامی عادات، خوراک، بیماریاں، لباس اور فصلوں کی تقسیم اور ان کی پیداوار کی مقدار کا انحصار موسمیات کی موزونیت پر ہے۔ الغرض گاؤں ہو یا شہر انسان کی روزانہ زندگی موسمیات کی تبدیلیوں سے متاثر ہوتی ہے۔ اور اچھا استاد وہ ہوتا ہے جو اپنے طلبا کو موسمیات کی تبدیلیوں سے روشناس کرا کر ان میں موسمیات کی بدعنوانیوں کو برداشت کرنے کی طاقت پیدا کرے۔ اور موسمیات کے چارٹ بنوانے اور اس سے نتائج اخذ کرنے میں طلبا کی رہنمائی کرے، وہ موسم کی نمایاں خصوصیات ہیڈ ماسٹر کو اسمبلی کے وقت مہیا کرے تاکہ تمام طلبا کو ان سے روشناس کرا دیا جا سکے۔

دوسرے موسم اور اس کے اثرات طلبا کے سامنے پیش کر کے ان میں استدلال کی قوت پیدا کرے۔

تیسرے، استاد، موسمیات کے چارٹ بنوا کر طلبا میں یہ سمجھنے کا شعور پیدا کر سکتا ہے۔ کہ موسمیات سے متعلق معلومات، سکول کا وقت، ٹائم ٹیبل کی چھٹی، موسمی تعطیلات۔ طلبا کا لباس اور خوراک وغیرہ کی باقاعدہ تبدیلی میں کہاں تک رہنمائی کرتی ہے۔ پاکستانی اساتذہ کو سائنسی نقطۂ نظر پیدا کرنا ہے۔ اس کے بعد ہی وہ اپنے شاگردوں میں سائنسی ذہنوں کی تخلیق کر سکتے ہیں ۔

سرسیّد کی تعلیمی تحریک

عبدالغفور چوہدری

غدر کے طوفان نے ہندوستان کی سماجی اور سیاسی زندگی کو بنیادوں تک ہلا دیا تھا۔ اس ہنگامے میں کئی ایک گوہر آبدار تہ میں بیٹھ گئے۔ اور بعض عنبر پارے تہ میں سے نکل کر ساحل آب سے آ لگے۔ ان میں سے ایک سرسید بھی تھے۔

غدر کا ہنگامہ بساط سیاست پر ملک گیری اور قوت پرستی کی کشمکش نہیں تھی۔ یہ دو فکری اور سماجی نظاموں کی کشمکش تھی۔ ایک حدِ فاصل جو پرانے زمانے کو نئے دور سے متمیز کرتی ہے اک سنگ میل جو قدیم اور جدید کی حدود کو متعین کرتا ہے۔ ہندوستان زندگی کے نئے تقاضوں سے آشنا ہو رہا تھا۔ اُفق پر سے ایک نئے تمدن اور نئے اقدار کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ کیا ہندوستان اس نئی اقدار کو دوسروں سے ادھار اور مستعار لے گا۔ یا خود نئی اقدار اور نئی زندگی بنانے کی کوشش کرے گا اس سوال کا جواب سیاست کے ہاتھ میں تھا اور سیاست کی تلوار نے اس کا فیصلہ ہندوستان کے حق میں نہ کیا۔

اس تلوار کا وار دوسروں پر چھچھلتا سا پڑا۔ لیکن مسلمانوں پر بھرپور پڑا۔ اس سے کہیں ان کی پرانی روایات کی رگیں دب کر رہ گئیں۔ کہیں کٹ کر ختم ہوگئیں۔ ان کے چمن کا شیرازہ درہم برہم ہوگیا۔

لیکن اس مایوس کن اور تاریک فضا میں بھی اس اُجڑے باغ کو نئے سرے سے بسانے اور آئین بندی کی طرح دوبارہ ڈالنے کے لیے مختلف گروہوں کی جانب سے کوشش کی گئی۔ ان میں مولانا محمد قاسم بانی دیوبند بھی تھے اور سرسیّد بھی بعض لوگوں کے خیال میں ان دونوں میں بعد المشرقین ہے لیکن یہ دونوں ہستیاں ان دو سرگرم جستجو راہرو کی مانند تھیں۔ جو بادی النظر میں دو مخالف سمتوں میں

جا رہے ہیں۔ لیکن زمین کی گولائی کی وجہ سے جتنا دور ہوتے جاتے ہیں اتنا ہی ایک دوسرے کے قریب آتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دن کسی ایک نقطہ پر آ کر مل ہی جاتے ہیں۔ ان دونوں بلند نگاہ شخصیتوں کا مطمح نگاہ ایک تھا جو محرک انھیں ایک والہانہ جذبۂ عمل پیدا کر رہا تھا، وہ بھی ایک تھا۔

مولانا عبیداللہ سندھی کے الفاظ میں اس جماعت (حزب شاہ ولی اللہ) کی مرکزی قوت ایک اختلاف کی بنا پر جو باہم معاربہ میں (مغل بادشاہ) کی طرفداری اور غیر جانبداری سے پیدا ہوا تھا دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اور دہلی کے عوض دیوبند اور علی گڑھ دو مرکز بن گئے۔ جس طرح مولانا محمد قاسم دہلی کالج کے عربی حصہ کو دیوبند لے گئے۔ اسی طرح سر سید احمد خاں نے دہلی کالج کے انگریزی حصے کو علی گڑھ پہنچا دیا۔

مولانا عبیداللہ سندھی کی رائے میں دیوبند اور علی گڑھ کی تحریکیں ایک ہی سرچشمے کے دو دھارے ہیں۔ جو مخالف سمت میں نہیں، ساتھ ساتھ بہہ رہے ہیں۔ مولانا محمد قاسم اور سید احمد خاں دونوں کے سینہ میں ایک ہی جذبہ موجزن تھا۔ ان کی جان ایک ہی مقصد میں اٹکی ہوئی تھی۔ انھیں سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے ایک ہی خیال تڑپا رہا تھا۔

سر سید احمد خاں نے دہلی کالج میں مولانا مملوک علی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا تھا۔ یہ مولانا محمد قاسم کے استاد اور رشتہ میں چچا ہوتے تھے۔ اور جب دیوبندی تحریک کی ذہنی بنیاد دریں مکہ معظمہ میں ڈالی گئیں تو ان کے لیے تعلیمی قالب تیار کرنے کا کام ہندوستان میں مولانا مملوک علی کے سپرد کیا گیا تھا۔ دونوں تحریکوں کے طریق کار مختلف ہوں لیکن ان کا مقصد مسلمانوں کا احیاء تھا۔ ان کی مٹتی ہوئی روحانی اور سیاسی عظمت کو دوبارہ حاصل کرنا تھا اور چونکہ کالج پارٹی انگریزی حکومت کے ساتھ پورے اشتراک کے بغیر اپنا کام شروع ہی نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے اس نے برٹش گورنمنٹ کے ساتھ تعاون کرنا اپنی سیاسی مصلحت کا حصہ بنایا۔

سر سید کے تعلیمی نظریہ کے متعلق عجیب قسم کی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ مذہبی لوگ ان میں روحانیت کا فقدان پاتے ہیں۔ سیاسی عقاید والے انھیں ایک مخصوص طبقہ دارانہ ذہنیت کا آئینہ دار سمجھتے ہیں۔ معاشرتی خوبیوں کی قدر کرنے والے ان کے خیالات کو مغربی تہذیب و معاشرت

کا ایسا عکس دیکھتے ہیں جو کسی ناہموار آئینے میں نظر آ رہا ہو۔ مادی تعلیم کے پرستار اِس میں پیشہ ورانہ رجحان کی تلاش کرتے ہیں۔ اور جب وہ اِس تعلیمی سوچ کے شاہکار کو اپنے ذہن کے دھندلے اور حقیقت سے دور نقوش کے مطابق نہیں پاتے تو اعتراض کرنے کے لیے بیتاب ہو جاتے ہیں۔ وہ مونا لیزا کی تصویر، اس کے بھولے بھولے سے گالوں پر کیوں اعتراض نہیں کرتے۔ وہ تاج محل کے دائیں بائیں کی جوابی عمارتوں پر نکتہ چینی کیوں نہیں فرماتے۔ اِس لیے کہ وہ تخلیق کا شاہکار ہیں۔ علی گڑھ بھی ایک حد تک اسی لحاظ سے سرسید کا شاہکار ہے۔ ایک بلند تخیل، ایک تخلیقی جذبے کا کارنامہ ہے۔ وہ جذبہ جو اسے راتوں کو سونے نہ دیتا تھا، اور اس کے دنوں کو رات سے زیادہ تاریک اور افسردہ بنائے رکھتا تھا۔

سرسیّد کی شخصیت ہمالیہ کی ان سربفلک چوٹیوں کی سی ہے جن تک کوئی پہنچ نہ پایا۔ کوشش کی بھی تو راستے کے گلیشیر اور بہتی ہوئی برف کے نیچے دب کر رہ گیا۔ اگر کبھی بادل اور کہر کے پردے اُٹھ بھی گئے تو دھوپ میں برف سے ڈھکی ہوئی چوٹی اِس شان سے جگمگاتی ہے کہ اِس پر آنکھ ٹھہر نہیں پاتی۔

لوگ کہتے ہیں کہ سرسیّد کا تخیل تنگ اور محدود تھا۔ وہ اِس تخیل کا اندازہ علی گڑھ کی رنگ و خشت سے لگاتے ہیں، عمارت کی بنیادوں کے نقشے سے اس کی بلندیوں کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں۔ علی گڑھ اِس کے تخیلی ایوان کی داغ بیل تھی اِس کی لوح یا کتبہ نہیں۔ علی گڑھ اس کے سفر کی پہلی منزل تھی، آخری آرامگاہ نہیں۔ ایک تخلیقی فن کار کے تخیل کی سرحدیں اس کے ذرائع اظہار مہیا کرتے ہیں۔ اسے صوت اور آہنگ، خطوط اور رنگ کی حدبندیوں کا پابند ہو کر کام کرنا پڑتا ہے۔ ایک تعلیمی فن کار کو تعلیمی نظام کی داغ بیل اپنی قوم کے ذہنی، معاشی اور اقتصادی حوصلوں کو دیکھ کر ڈالنا پڑتی ہے۔ لیکن سرسید تو ایک ٹوٹے ہوئے لنگر کا سہارا، ایک زخم خوردہ کشتی کے ناخدا تھے۔ دوسروں نے سرسیّد کی طرح اپنی قوم کی تباہی نہیں دیکھی تھی۔ ان پر اِس شخص کی حالت نہیں گزری تھی جس کے گھر کا ایک حصہ آگ سے جل گیا ہو اور باقی حصوں کے بچانے کے لیے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مار رہا ہو

انھوں نے اس انتقامی غذبے کا نظارہ نہیں کیا تھا جس سے غدر کے دوسرے رُخ کی داستان رنگین ہے جس کی ابتداء ضبطی جاگیر اور انتہا پھانسی سے آگے کسی منزل پر رکتی تھی۔

سرسید نے مسلمانوں کی سلطنت کو برباد ہوتے ہی نہیں دیکھا تھا۔ انھوں نے لال قلعہ پر یونین جیک لہرانے کا ہی نقشہ نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ ہر اچھے مسلمان خاندان کے ٹوٹے ہوئے کھنڈر پر نلاکت اور نکبت کی پرچھائیاں دیکھی تھیں۔ سرسید نے اپنی آنکھوں سے فارسی عربی پڑھے مسلمانوں کو صدر الصدور اور صدر امین، ہیڈ قاضی اور میر منشی کے عہدوں پر دیکھا تھا۔ انھیں اونچی سے اونچی ذمہ دار جگہوں پر ہوشیاری اور دیانت داری، سلیقہ اور وقار، سمجھداری اور چابکدستی سے کام کرتے دیکھا تھا۔ یہ اہلیت اور خوبی کوئی ذاتی اور محض اکتسابی شے نہیں تھی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد میں عدالت اور محکمہ قضا کی روایات ہمیشہ سے شاندار رہی ہیں۔ اور بیشتر مغربی سیاحوں نے جو ہندوستان میں آئے ان کے عدل کی تعریف کی اور قوت فیصلہ کی تیزی کو سراہا جب حکومت ہند نے ۱۸۶۲ء میں قاضیوں کا مقرر کرنا بند کر دیا تو مقدمات کی مسلیں چار سال میں ہی سہ گنا ہو گئیں۔ ارتکاب جرم بڑھ گیا اور لوگوں کے دلوں سے عقوبت اور فوری اور سچی سزا کا خوف جاتا رہا۔

یہ لوگ حکومت کے ملازم تھے۔ لیکن بے روح مشین کا پرزہ نہ تھے۔ حکومت سے تنخواہ لیتے تھے۔ لیکن اس کے بدلے انھوں نے اپنی گہری انسانیت کو حکومت کے سپرد نہیں کر دیا تھا۔ ان میں ایسے منصف بھی تھے۔ جن کے اجلاس میں بوعلی سینا کی طرح ان کے طلبا ایک طرف کتابیں لیے بیٹھے رہتے تھے۔ جوہاں فرصت ہوئی سبق پڑھ لیا اور ان میں ایسے مولوی بھی تھے جنھوں نے گیارہ گاؤں کی جاگیر کا پروانہ اس لیے پھاڑ کر پھینک دیا تھا کہ یہ ان کی علمی اور انسانی حیثیت کے شایان شان نہ تھا۔ سرسید نے ان لوگوں کو دیکھا تھا۔ دیکھا ہی نہیں وہ خود ان میں سے تھے۔ حکومت نے انھیں وفاداری کے بدلے غدر کے بعد تعلقہ جہاں آباد سادات دینا چاہا جس کی آمدنی ایک لاکھ کے قریب ہوتی تھی۔ مگر سرسید کہتے ہیں کہ میں نے

اپنے دل میں کہا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہوا اور میں ان کی جائداد سے کر تعلقہ دار بنوں۔

لیکن غدر کے بعد یہ نقشہ ہی بدل گیا۔ حکومت کی طرف سے قاضیوں کی تقرری بند ہوگئی۔ مسلمان ایک ایک کر کے سرکاری ملازمتوں سے نکالے جانے لگے۔ غدر ختم ہوگیا، لیکن اس کی بھڑکائی ہوئی منتقمانہ ذہنیت ختم نہ ہوئی۔ وہ لوگ جو پہلے کلکٹری، پولیس، عدالت اور فوج کے محکموں پر چھائے ہوئے تھے اب خال خال نظر آنے لگے۔ چند سال کے اندر اندر پنجاب کے صوبے میں جہاں پورا انتظام تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا مسلمان استاد حکومت کے مدرسوں میں نام کو نہ رہے ۱۸۶۹ء میں سندربن بنگال کے کمشنر نے ایک حکم جاری کیا جس کی رو سے مسلمانوں کو آئندہ سرکاری ملازمت سے محروم کر دیا گیا، اور اس شہر کلکتہ میں جہاں انیسویں صدی کے شروع میں راجہ رام موہن رائے نے مسلمان مختاروں اور وکلاء کو ہندوؤں سے بدرجہا اونچا پایا تھا سوائے چپراسیوں اور چٹھی رسانوں کے کوئی باقی نہ رہا۔

اب غدر کی لگائی ہوئی آگ سلگ رہی تھی کہ وہابی تحریک نے اس پر تیل کا کام دیا۔ مسلمانوں پر سے حکومت کا رہا سہا اعتماد بھی جاتا رہا۔ شیر علی ایک قیدی نے گورنر جنرل کو کالے پانی میں مار ڈالا۔ ایک وہابی نے کلکتہ کے سپریم کورٹ کے جج کو قتل کر دیا۔ دوسری قوموں نے بے اعتمادی کے جذبے کو اور بھی بھڑکا دیا۔ کعبہ کو جبینوں سے بسانے والے ایک مرتبہ پھر کالے پانی کو بسانے لگے۔ اور غدر کے بعد دوسری مرتبہ علماء اور مجاہدین زنجیر جنوں کے آہنگ دل سے انڈمان کو روانہ ہونے لگے۔

سرسید کے تعلیمی اور سیاسی فکر کی بنیادیں اسی مایوس اور تاریک زمانے میں پڑیں۔ ایک طرف مسلمان کے علم اور مذہب کے تابناک ستارے دور سمندر پار کالے پانی میں خطرناک اخلاقی مجرموں کے مابین ڈوب رہے تھے، دوسری جانب ہندوستان کی دوسری قومیں مغربی تعلیم کی مستعار روشنی کے عکس میں اُبھر رہی تھیں۔ وہ مسلمانوں کی چھوڑی ہوئی کرسئ عدالت کو سنبھال رہی تھیں۔ اور ان کے ساتھ ساتھ باوجود کانگریس اور اس کی قومیت پرستی کے وہ ایک نئے رجحان کا مظاہرہ پیش کر رہی تھیں۔ یہ تھا۔ تجدید مذہب کا رجحان جس میں مذہب اپنی قدیم روحانیت سے ایک حد تک معرا ہو کر فرقہ وارانہ

قومیت کا نشان ہو گیا تھا ۔

اب تک پچھلی صدی کے دوسرے نصف کی سماجی اور دوسری تحریکوں کا صحیح طور پہ جائزہ نہیں لیا گیا۔ ان کا تجزیہ کرنا اور ان کے بنیادی محرکات کا پتہ لگانا ہمارے قومی مسئلہ کا بڑا نازک اور اہم پہلو ہے۔ ہم نے کبھی ان محرکات کو ڈھونڈ نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ انفرادی یا سماجی زندگی کی سب سے بڑی فتح حقیقت کا تجسّس ہے۔ صرف تجسس ہی نہیں۔ اسے ایک بار نظر پھر کے دیکھ لینے کے بعد پھر مراقبہ میں چلے جانے کا نام نہیں۔ بلکہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے رام کرنے کا نام ہے۔ ہم نے اکثر کی زندگی کی حقیقتوں کو ایک نظر دیکھا اور پھر دانستہ شتر مرغ کی طرح ریت میں سر چھپا کر مطمئن ہو گئے ۔

ہماری ملکی زندگی کی حقیقت سرسیّد کے زمانے میں کانگریس نہیں تھی۔ اس کی تلخ حقیقتیں اردو اور ہندی کا مسئلہ تھا۔ گئوکشی کے انسداد کی جدوجہد تھی۔ آبادی کے ایک حصّہ کے سیاسی اور اقتصادی انحطاط اور دوسروں کا انھیں منفعت اندوزی کا ذریعہ بنانے کی حقیقت تھی۔ سیاسی انتخاب کے میدان میں ملازمتوں کے مقابلے کے امتحان میں باہمی کشمکش کی حقیقت تھی۔ ان کے علاوہ خالص مذہبی حیثیت سے آریہ سماج۔ مہامنڈل اور پرچارنی سبھاؤں کی حقیقت تھی ۔

ہم سرسیّد پہ اعتراض کرتے ہیں کہ انھوں نے کانگریس سے تعاون نہیں کیا۔ لیکن ہم نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ اس تعاون کے خلاف خود ہمارے مابین کتنی قوتیں کام کر رہی تھیں۔ کانگریس ایک سیاسی تحریک تھی اور اس زمانہ تک ہندوستانیوں کا ذہن خالص، و مجرد سیاست کے لیے ایسا کچھ تیار نہ تھا۔ سیاسی جذبہ سطح آب کی اوپری لہر تھا۔ اس کے گہرے طوفان خیز دھارے تہ آب بہ رہے تھے۔ یہ تھے مذہبیت اور مذہبی قومیت کے دھارے سماج اور زبان کے گرداب۔ کانگریس کی تحریک اوپر کے طبقے کے چند لکھے پڑھے لوگوں کی تحریک تھی۔ دوسری تحریکیں پورے عوام کے دلوں کو ایک آہنی گرفت۔ ایک گلو فشار پکڑ میں لے رہی تھیں۔ سرسید کا احتجاج کانگریس کے خلاف نہیں، اسی بڑھتی ہوئی ذہنیت کے خلاف تھا۔ یہ ذہنیت سیاسی ہم آہنگی کے خلاف نہیں

رمعاشی تعاون کے خلاف بھی کام کر رہی تھی۔ اس کی جڑیں بہت گہری ہے حد پائدار اور پھیلی ہوئی ۔ اس رجحان کے تلخ نتائج ہم آج بھی دیکھ رہے ہیں۔

ہم نے کسی اور جگہ ہندو احیاء کی تحریک اور اس کے تعلیمی اور سماجی نتائج کا تذکرہ کیا ہے زمانے کے اکثر رجحانات کو پیدا کرنے، انھیں ابھارنے، بڑھانے اور پھیلانے میں اس ہے نے روح رواں کا کام کیا۔ خود کانگریس تحریک کے بڑے مرکز شروع میں بنگال اور مہاراشٹر۔ اس تحریک کے ساتھ ساتھ بنگال میں کچھ دبا دبا اور مہاراشٹر میں کھلا جذبہ مسلمانوں کے خلاف ہو چلا تھا۔ کانگریس کی فعال نوجوان جماعت کے رہنما سٹر تلک نے جب پونا میں گنپتی کا جلوس شروع کیا تو اس کی رونق دو نعرے تھے جو انگریزوں کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف بھی لگائے ۔ تھے

کانگریس کو سچے معنوں میں کل ہند ادارہ بنانے کا سہرا تحریک خلافت کے سر ہے۔ یہ تحریک مرتبہ اسے صوبائی حد بندیوں سے نکال کر اصل ہندوستان میں لے آئی۔ اس علاقے میں جسے تاریخی ت سے ہندوستان کہا جاتا ہے۔ یعنی دہلی سے بہار تک کا علاقہ۔ اسی علاقے نے ہمارے دیس بیاسی وحدانیت بخشی تھی۔ خواہ وہ اشوک کے زمانے میں پاٹلی پتر سے نکلی یا مسلمانوں کے زمانہ دہلی یا آگرہ سے ابھری، اس کے دھارے، اس کے سیاسی اور کلچر سرچشمے ہمیشہ اسی مین سے پھوٹے۔ تحریک خلافت سے پہلے اور بعد میں تحریک کانگریس صوبائی یا ایک خاص یا اس کے بااثر حصے کی نمائندہ تھی۔ سرسید کانگریس کو ایک کل ہند تحریک نہیں سمجھتے تھے۔ ں تقریروں میں کانگرس اور بنگال مترادف ہو کے رہ گئے تھے۔ آئی۔سی۔ایس کا مسئلہ ہندوستانی انگلستانی کا نہیں بلکہ بنگالی اور انگریز کا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی نظر ان گہرے طوفانی وں پر بھی تھی جو تہ آب بہہ رہے تھے اور ہماری سماجی زندگی کی ناؤ کو غیر شعوری طور پر اپنے ساتھ لیے جا رہے تھے۔

جس زمانے میں سرسید حکومت کی سب سے بڑی باغی جماعت یعنی وہابیوں کی حمایت میں

مضمون لکھ رہے تھے۔ اسی زمانے میں دوسرے لوگ اردو ہندی کے جھگڑے کی بنیاد رکھ رہے تھے۔ انہی سالوں میں حکومت نے سب سے پہلے صوبہ بہار میں ہندی زبان کو عدالتی زبان کا درجہ دے دیا۔ اور ایسے جھگڑے کا دروازہ کھول دیا جو اب تک لاکھ کوشش سے بند نہ ہو سکا۔ یہ اردو ہندی کا مسئلہ نہیں، انتظامِ حکومت میں حصہ داری اور اقتصادی منفعت بازی کا مسئلہ تھا۔ سرسید کی اردو زبان میں ایک تخلیقی رہنما کی حیثیت ہے۔ وہ اسے ہندو اور مسلمانوں کا مشترکہ سرمایہ سمجھتے تھے۔ اور اس بے وقت کی راگنی سے انھیں جتنی کچھ روحانی اذیت پہنچی کم تھا۔ یہ مسئلہ ان کی پوری سیاسی اور سماجی زندگی پر ایک گہرے سایہ کی طرح پڑا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ ۱۸۸۲ء کے تعلیمی کمیشن کے ممبر تھے۔ وہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں ہندی زبان کے مطالبہ کو ایک حد تک سمجھ سکتے تھے۔ لیکن جب پنجاب کے دور افتادہ علاقوں میں جہاں صدیوں سے ہندو اور مسلمان ایک زبان لیے چلے آئے ایک معاشرت، ایک تہذیب ذہن کے پرستار چلے آئے۔ ہندی کے لیے میموریل اور عرضداشت پیش ہوتی تھیں تو انھیں ہندوستانی قومیت کے بلند آہنگ دعوؤں پر شبہ ہونے لگتا تھا۔ ساری عمر وہ زبان کے میدان میں کلچرل ہم آہنگی کے لیے ایک سرفروشانہ مجاہدہ کرتے رہے۔ یو پی میں وہ اس سیلاب کے خلاف ایک آہنی بند کا کام کرتے رہے۔ ان کی وفات سے جب یہ بند ٹوٹا تو اس سیلاب نے ہز اینٹونی میکڈانلڈ کے زمانے میں پورے صوبے کو آ لیا۔

پھر اس کے ساتھ ساتھ گئوکشی کے انسداد کی ایک تحریک ملک بھر میں چل رہی تھی۔ اس کا مقصد قانونی طور پر اسے بند کرانا تھا۔ بعض لوگوں کو مسلمانوں کے سیاسی انحطاط کا پورا یقین ہو چلا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ زخمی شیر، اب گائے کے نوکدار سینگوں کی تاب نہ لا سکے گا۔ مسلمانوں کو اصولاً اس مطالبے پر برافروختہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ان کے پرانے بادشاہوں نے ملک کے ایک بڑے طبقے کا دل ہاتھ میں لینے کے لیے گئوکشی کو روک دیا تھا۔ وہ بھی اپنے آبا و اجداد کی طرح فراخدل ہو سکتے تھے لیکن یہ فراخدلی تبھی پیدا ہو سکتی تھی کہ کوئی ان کے دل پر محبت کا ٹھوکا دے کر کہتا کہ اپنے ہمسایوں کا خیال کرو۔ دوسرے لوگ تو اس کی جگہ قانون کا تازیانہ اس کے سر پر چلانا چاہتے تھے۔ سرسید نے

اِس خطرے کا اندازہ لگا لیا تھا اور ایک تقریر میں انھوں نے برادرانِ وطن کو اس خطرے سے آگاہ بھی کر دیا۔ ان کے اپنے الفاظ میں "خیال کرنے کی بات ہے کہ جب سے انہوں نے گاؤ کشی کے معاملے میں ضد مچائی ہے۔ گاؤ کشی کس قدر زیادہ ہو گئی ہے۔ اور فریقین کی مذہبی فیلنگ کیسی بھڑک گئی ہے جس سے ہندوستان کے سب لوگ واقف ہیں۔ ان کو خیال کرنا چاہیے کہ کسی دباؤ اور زور سے وہ اِس چیز کو حاصل نہیں کر سکتے کہ جو آپس کی محبت اور دوستی سے حاصل ہو سکتی ہے"

یہ تھیں ہماری ملکی زندگی کی تلخ حقیقتیں اور ان میں سے بعض کی تلخی ابھی تک ہمارے کام و دہن کی تواضع کر رہی ہے۔ جب کہ وہابی تحریک وطن کو غیر ملکیوں سے آزاد کرانے کی تیاری کر رہی تھی۔ آریہ سماج ایک جنگجو مذہبی سپرٹ کے ساتھ دوسرے مذاہب سے مناظرہ کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ جب کہ سرسید عقلیت کے تحت پرانے اوہام کے بت توڑ رہے تھے۔ جبکہ وہ پرانی روایات کو دلیرانہ اور آزادانہ روندتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ مذہب کو سائنس سے مطابق کرنے کی کوشش کر رہے تھے فرگوسن کالج کے مغربی تعلیم یافتہ پروفیسر کانگریس کے پرجوش رہنما مسٹر تلک گنپتی کا جلوس نکلنے کی تیاری کر رہے تھے۔ ایسے حالات میں اگر سرسید نے اپنی قوم کے لیے سیاست کا نیا راستہ نکالا تو ان پر کیا اعتراض وارد ہو سکتا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ سرسید انگریز سے مرعوب ہو گئے تھے۔ مغربی تمدن کے عقابی حملے کے سامنے سپر انداز ہو گئے تھے۔ لیکن اگر ہم ان کی زندگی کے واقعات کا ہمدردی اور گہری نظر سے مطالعہ کریں تو یہ اعتراض سحر کاذب کی طرح دیکھتے دیکھتے کافور ہو جاتے ہیں۔ سرسید کی شخصیت کے بنیادی خطوط اِس قدر عظیم الشان ہیں کہ یہ اعتراض ان پر ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کوئی تاج محل کے مرمریں مینار کو اپنے نام اور دستخط سے میلا کر کے چلا آئے۔

غدر کے بعد خون اور بارود میں نہائی ہوئی فضا میں بغاوت ہند کے اسباب لکھنے والا کون تھا؟ وہابی تحریک کے ایسے زمانے میں جبکہ کوئی دھوکے میں بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا تو ضبطیٔ جائداد کالا پانی بلکہ پھانسی کی سزا کو پہنچ گیا۔ اِس وقت ان کی حمایت میں قلم اٹھانے والا اپنے آپ کو سزا کے

ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک مقام یعنی بامِ صداقت پہ کھڑا ہو کر وہ بی کہلانے والا کون تھا؟ آگرے کے دربار میں جب ہندوستانیوں کی کرسیاں انگریزوں کے برابر نہیں بچھائی گئی تقلیں اٹھ کے آنے والا کون تھا؟

سرسید پر سبھی قسم کے اعتراض کیے گئے۔ لیکن جرأت کی کمی کا الزام ان کے سخت سے سخت مخالف نے بھی کبھی ان پر نہیں لگایا۔ بقول مولانا حبیب الرحمٰن شروانی۔ وہ جس میدان میں گئے مردانہ اور جس راہ سے گذرے آزادانہ۔ مذہب کے میدان میں آئے تو عقلیت اور سائنس کے طریق کا نیا ہتھیار لے کر ایک دنیا کے خلاف معرکہ آرا ہو گئے۔ ساجی اصلاح کی طرف جھکے تو ہزار فتووں اور مخالفتوں کے باوجود اپنے ارادے سے باز نہ آئے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ سرسید انگریز سے نہیں ڈرتے تھے، ان کا سارا خوف مسلمانوں سے تھا۔ وہ مسلمانوں کے مذہبی جوش، ان کے نفسیاتی ہیجان، ان کے دبے ہوئے جذبے سے ڈرتے تھے۔ مسلمانوں کی زندگی کا شیرازہ انہوں نے غدر میں اپنے سامنے بکھرتا دیکھا تھا۔ اس سے زیادہ اس کی پریشانی ان سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ حکومت کی آنکھ مسلمان پہ لگی ہوئی تھی۔ اور ایک خونخوار جانور کی طرح وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی آنکھوں کی شعاع طیبیت کو اس سے علیحدہ نہیں کر سکتی تھی۔ دوسری قوم کے لوگ سیاست سے چھیڑ چھاڑ کر سکتے تھے۔ دست درازی تک کی اجازت تھی۔ لیکن مسلمان کے لیے نگاہ اٹھانا بھی زہر تھا۔ سرسید کے خیال میں جب تک اس تحریک میں غیر فوجی طبقے اور تاجر شریک ہیں اس وقت تک یہ جہاد بالقلم یا باللسان سے آگے نہیں بڑھے گی۔ لیکن جہاں اس میں مسلمان اور شمالی ہند کے ہندو شامل ہوئے تو ایسی پڑیں گی کہ رکنے پہ بھی نہ رکے گی۔

بقول سرسید۔ کیا ایک دانا منتظم اس واقعہ (غدر) کو جس کو تھوڑے برس ہوئے بھول جائے گا۔ ہرگز نہیں بھول سکتا۔ اگر مسلمان شریک ہو جائیں تو کیا نتیجہ ہوگا۔ اگر گورنمنٹ عقلمند ہے اور لارڈ ڈفرن دانا وائسرائے ہے تو اس کو اس وقت یہ خیال نہ ہوگا کہ یہ شورش مثل بنگالیوں کی شورش کے ہے۔ بلکہ اس کو ضرور ہوگا کہ وہ ان کو درست کر دے۔" سرسید نے میرٹھ کے

لیکچر کو ایک پُر زور تنبیہ کے ساتھ ختم کیا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں سے کہا۔ گورنمنٹ تم پر سخت نظر رکھ
کیوں کہ تم بڑے مفسد، بڑے بہادر، بڑے سپاہی اور بڑے لڑنے والے ہو۔

سرسید کو یقین تھا کہ مسلمان اس ملک زادے کی طرح ہیں جس کا آہنگ مبارزت" آز
باشم کہ اندر خاک دخوں بینی سرے" تھا، خود سرسید اور مسلمانوں کی سیاسی تعلیم اس درجہ نہیں
تھی کہ وہ پارلیمانی طریق کار کو اپنا کر اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتے۔ وہ ہمیشہ تلوار کے زور سے
سلطنت لینے کے عادی تھے اور تلوار کے زور سے ہی واپس دینے کے۔ تقریروں اور تجویزوں
ذریعہ سیاست کے میدان کو جیتنا اس زمانے میں ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ ہمارے علماء تحریک
تک اسی خیال میں مبتلا رہے۔ اس وقت تک ان کا ہتھیار انقلاب اور تشدد ہی رہا۔ ہتھیا
پر قلب ماہیت عدم تشدد کی تحریک میں ظہور میں آئی۔ سرسید کا عقیدہ تھا کہ انقلاب ہمیشہ تر
کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔ لوگ آئرلینڈ کی تحریک آزادی کی مثال دیتے تھے۔ لیکن سرسید کے
یہ آئینی کامیابی کی مثال نہ تھی۔ ان کے الفاظ میں ہزارہا آدمی آئرلینڈ کا تلواروں سے جان دینے
مستعد ہے۔ بڑے بڑے آدمی جو اس کے طرفدار ہیں نہ قید سے ڈرتے ہیں نہ پولیس کی سنگینو
ذرا مجھ کو بھی مہربانی سے ہندوستان میں دس آدمی نکال دیجیے جو سنگینوں کے سامنے آنا قبو
کریں۔ جب یہ نہیں ہے تو کیسا یہ غل ہے اور کیا مناسب ہے کہ ہم لوگ اس میں شریک
سرسید کانگریس کے مخالف تھے اور جب ہم اس زمانے کی کانگریس کو دیکھتے ہیں۔
کانگریس جو ایک انگریز کے سیاسی فکر کا نتیجہ تھی جس کا کام بے ضرر قسم کی تجاویز منظور کرنا
انھیں حکومت کی خدمت میں پیش کرنا تھا تو سرسید کی مخالفت کچھ ایسی سمجھ میں نہیں آتی
کہتے ہیں کہ وہ انگریز پرست تھے۔ وہ ہندوستانی قومیت کے مخالف تھے۔ وہ ہندوستانیوں کے
عہدوں پر مقرر کیے جانے کے خلاف تھے۔ مقابلہ کے امتحان سے بیزار تھے۔ طریق انتخاب پر
کرتے تھے اور نامزدگی کے قائل تھے۔ وہ احساس کہتری میں مبتلا تھے۔ وہ مغرب کے سیلاب
سامنے پریشان و گریہ اں تھے۔ اک اولوالعزم ناخدا نہیں بلکہ لنگر توڑے ہوئے، مستول چھوڑ

ملاح تھے ۔

لوگوں نے ان کے متعلق بہت کچھ کہا ہے۔ دوسروں نے نہیں اپنوں نے بھی بہت کچھ کہا اور بہت کچھ کہتے رہیں گے لیکن ان کے کہنے سے سرسید کی باعظمت شخصیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اس لیے نہیں کہ ان کی عظمت نے اپنے اردگرد کوئی فلک شگاف فصیل کھڑی کر لی ہے۔ بلکہ اس لیے کہ ان کے نکتہ چین ان کی بلندیوں تک پہنچ کر ان کو دیکھ نہیں پائے۔ ان کی ہمالیہ صفت شخصیت کے پس منظر کا صحیح تجزیہ نہ کر سکے۔ اس عظیم الشان رزمیہ اور المیہ کا نظارہ نہ کر سکے۔ جو ان کی روح کی پہنائیوں میں بپا تھا۔ ان کی نفسیاتی کیفیت، ان کے کلچرل مزاج کا اندازہ نہیں لگا سکے۔ وہ کوہسار کے سلسلہ کو دو ہاتھ کی جریب سے ناپنے کو نکلتے ہیں اور اک بلند تخیل کو اپنے محدود ذہن کے خاکوں اور چوکھٹے میں لگا کر اس پر حکم لگانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔

وہ اس زمانے کی کانگریس کو تحریک خلافت کے زمانے کی کانگریس سمجھتے ہیں۔ خلافت کے زمانہ کی کانگریس اک کل ہند تحریک تھی اور اس کے روح رواں اور خونِ دوراں شمالی ہندوستان یعنی تاریخی زبان میں اصلی ہندوستان کے لوگ تھے۔ سرسید کے زمانے کی کانگریس، انگریزی پڑھے ہوئے بنگالیوں اور ریذیڈنسی صوبوں کے چند لوگوں کی جماعت تھی۔ سرسید من حیث العمل مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ شمالی ہند کے ہندوؤں اور راجپوتوں کو اس سے علیحدہ سمجھتے تھے۔ کانگریس کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے ان کا روئے سخن ہمیشہ اپنے ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں سے ہوتا تھا۔ اور ملک سے ان کی مراد شمالی ہندوستان ہوتا تھا جس میں بنگال شامل نہیں تھا۔ وہ بنگال کے سوا پورے شمالی ہند کی کلچرل اور ایک حد تک سیاسی یگانگت کے قائل تھے ۔

وہ کانگریس کے اقتدار میں بنگالیوں کی ترقی دیکھتے تھے، پورے ہندوستان کی بھلائی نہیں دیکھتے تھے۔ یہ مسئلہ ایک حد تک اقتصادی تھا۔ بنگال اور ریذیڈنسی صوبوں کے ہندوؤں نے انگریزی تعلیم کا سہارا انیسویں صدی کے شروع ہی سے لیا تھا۔ تب ہی سے وہ اپنے آپ کو منشی گیری اور لارڈ میکالے کے تخیل کے مطابق دنیا دار خدمت گذار تعاون

کرنے والے شاگرد پیشہ بننے کے لیے تیاری کر رہے تھے [illegible] غدر کا طوفان آیا۔ لیکن ان ساحل پر بیٹھے تماشا کرنے والوں کو ایک بھی ٹھوکا نہ لگا۔ بلکہ جب مسلمان اِس کے ورطۂ فنا میں آ گئے اور حکومت کے دفتروں سے ان کی مسندیں خالی ہونے لگیں تو یہ لوگ آگے بڑھے اور اِن پر قابض ہو گئے۔ مقابلے کے امتحان ہونے لگے۔ دفتری حکومت کے لیے انسانوں کی ضرورت تھی۔ انسان تو چُن چُن کر نکال ہی دیے گئے تھے۔ اب ان کی جگہ مشین کے پُرزے کاغذ کا گھوڑے دوڑانے والے مقرر کر دیے گئے۔ پہلے حاکم ہونے کا معیار شرافت، انسانیت، تمدن و تہذیب اور علمی لیاقت تھی۔ اب اِس کا معیار چند سوالوں کے تحریری جواب پر رہ گیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اب تو حکام کو انسان کی جگہ مشل سے، دستِ شفقت کی جگہ جنبش قلم سے کام لینا تھا۔ اب سوائے معلوماتی علم اور اسے الٹی سیدھی انگریزی میں اظہار کرنے کے سوا اور کیا چاہیے تھا۔

فطرت نے سرسیّد کو بڑے باعظمت پیمانہ پر تعمیر کیا تھا۔ ان کے سامنے یہ نو سیکھئے اور لو دونے لوگ بالشتئے معلوم ہوتے تھے۔ وہ ایک ہمدرد اور شفیق حاکم رہے تھے۔ اور اپنی قوم کے یا اپنے علاقے کے لوگوں کو ان صفات سے متاز دیکھنے تھے۔ لیکن ان کے ساتھ ساتھ انھیں احساس تھا کہ وہ بنگال کے انگریزی خواں طبقے کا سیلاب آہستہ آہستہ شمال کی طرف بڑھ رہا ہے۔ کانگریس اور اس کی نجاویز اِس کے لیے بادِ موافق کا کام کر رہی ہیں۔ شہر میں ان لوگوں کی آبادیاں بس رہی ہیں۔ ہر محکمہ پر یہ لوگ چھاتے جا رہے ہیں۔ سرسید ان کے مخالف نہیں تھے۔ لیکن وہ اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے کہ آہستہ آہستہ ان کے ہاں کا وہ طبقہ جو ثقافت اور پرانی روایات کے اعتبار سے ان لوگوں سے بلند ہے جو ہر لحاظ سے ملک کی آبادی کا سرپرست اور ان کا ہمدرد نگراں بن سکتا ہے۔ اپنی جگہ خالی کر رہا ہے۔ اور اِس کی جگہ فائل تیار کرنے والے بابو اور صاحب کے جنبشِ لب کے منتظر کلرک لوگ لے رہے ہیں۔

ایک مرتبہ اپنے سیاسی مسلک کی توضیح کرتے ہوئے انھوں نے اپنے علاقے کے ہندوؤں کو مخاطب کر کے کہا۔ اے صاحبو جو کچھ کہ اب میں اپنی قوم کے لیے بیان کروں گا۔ درحقیقت وہ صرف

ہماری ہی قوم کے لیے مفید نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے ملک کے ہمارے ہندو بھائی جو کسی غلط خیال سے اس میں شریک ہوئے ان کے لیے بھی ویسی ہی مفید ہے۔ ہمارے ملک کے ہندوؤں کو سمجھنا چاہیے کہ ان کی حالت گو مسلمانوں سے کسی قدر اچھی ہے لیکن ایسی اچھی نہیں ہے کہ وہ دوڑ کر ہم سے آگے نکل جائیں گے ہم سب ایک ملک کے رہنے والے ہیں۔ بہت سے ہندو ایسے ہیں کہ ان میں مسلمانوں کی عادتیں گھس گئی ہیں، جیسے کہ ہمارے دوست کائستھ صاحب ہیں۔ ان کی عادت اور ان کی حالت ہم سے کچھ زیادہ بڑھی ہوئی نہیں ہے اور ہندو بھی کچھ ہم سے زیادہ بڑھے ہوئے نہیں ہیں۔ جو کچھ ہمارا حال ہوگا وہی حال اس ملک کے باشندوں کا بھی ہوگا۔"

ہندوستان کی سبھی الجھنوں کا بڑا سبب مختلف گروہوں میں ہم آہنگی اور توازن کی کمی ہے۔ وہ بین تفاوت ہے جو اس ملک کی دو بڑی قوموں کی اقتصادی، تعلیمی اور معاشی حیثیت میں برٹش راج کے عہد میں پیدا کر دیا گیا۔ سرسید کا مقصد ہندوؤں کی بڑھتی رفتار کو بریک لگانا نہیں تھا۔ انھیں یہ ڈر ضرور تھا کہ کہیں ہماری سماجی گاڑی جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی جوڑی جتی ہوئی ہے، ایک فریق کی منہ زوری سے الٹ کر نہ رہ جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے متناسب اور حسین چہرے کی یہ دونوں آنکھیں برابر کی تابناک رہیں۔

اور سچ تو یہ ہے کہ لبِ ساحل کے ان تماشہ کرنے والوں نے جو کانگریس میں پیش پیش تھے اپنی کشتی کو کبھی کھلے سمندر کی نذر نہ کیا تھا۔ وہ ہمیشہ محفوظ پانیوں میں رہے۔ راجہ رام موہن رائے کے ہندو کالج کے زمانے سے لے کر اب تک بنگال کے بھدرا لوگ اور بندرگاہوں کے تاجر لوگ سب کے سب ایک پُرامن فضا میں اپنے راستہ پر ترقی کر رہے تھے۔ مالی اور علمی بھی لحاظ سے ترقی کر رہے تھے، حکومت کے کچھ دروازے ان کے سامنے کھل چکے تھے اور دوسرے بند دروازوں کے کھولنے کا انتظام کانگریس کر رہی تھی۔ اس میں خواہ ملازمت ہو یا تجارت، کونسل کی نمائندگی ہو یا یونیورسٹی۔ ہر جگہ جہاں بھی ہندوستانیوں کے لیے نئی راہیں کھلتی تھیں۔ یہی طبقہ انھیں روکے کھڑا تھا۔ ان لوگوں کو حکومت کا اعتماد حاصل تھا۔ سماجی حیثیت حاصل تھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ

مال و دولت کا سہارا بھی تھا۔

سرسید نے مسلمانوں کی تعلیم کا ایک عملی پروگرام پیش کرکے اس تعلیمی اور سماجی خلیج کی پُل بندی کرنا چاہی جو دونوں قوموں کے اوسط طبقے میں پیدا ہوتی جارہی تھی۔ اس لحاظ سے یہ محض مسلمانوں کی خدمت نہ تھی بلکہ وسیع معنوں میں پورے ملک کی خدمت تھی۔

لیکن سرسید پر سب سے سخت اعتراض یہی کیا جاتا ہے کہ وہ محض درمیانی اور اونچے طبقے کی تعلیم کے قائل تھے۔ اعلیٰ تعلیم کے فدائی اور شیدائی تھے۔ انھیں عوام کی تعلیم سے کوئی دلچسپی نہ تھی ان کی بہتری اور بہبودی سے کوئی وابستگی نہ تھی۔ لیکن اگر ہم پردوں کو اٹھا کر شاہد معنی کا نظارہ کرنا چاہیں، اگر ہم سرسید کے تعلیمی افکار کا ان کے بلند تخیل خطوط کا جن پر وہ تعلیمی نظام کو اٹھانا چاہتے تھے مطالعہ کریں تو ہمیں ان کی فکری عظمت کا احساس ہوگا اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے لیے ایک ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جائے گا۔ وہ کیا کچھ کرنا چاہتے تھے اور کیا کچھ نہ کرسکے اور کیوں نہ کرسکے، ان سوالوں کا جواب ہمیں ان ابتدائی تقریروں اور مضامین میں ملے گا، جب کہ ان کے بے پناہ جوش اور ولولے کو قوم کی سرد مہری اور زمانے کی زمہریری نے ٹھنڈا نہیں کیا تھا۔

سرسید کی زندگی کا یہ دور ایسا ہے جس میں ان کا آزاد اور یہ کار تخیل پورے جوبن پر ہے۔ ابھی تک انھیں سماجی خدمت کے سلسلے میں عملی دقتوں سے واسطہ نہیں ہوا تھا۔ ابھی تک انھیں راہِ عمل میں مخالفت کے طوفانوں اور تعصب کی چٹانوں سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ ہم آج انھیں پورژوا جماعت کی تعلیم کا رہبر، اقتدار پرست طبقے کا سرپرست سمجھتے ہیں ہمارا خیال ہے کہ ان کی نظر اپنے سماجی گروہ کی مرمریں چار دیواری سے باہر نہیں جاتی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ جہاں بانی کے قائل تھے۔ جہاں بینی سے دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ لیکن جس چشم حقیقت بین نے تاریخ کے میدان میں ژرف نگہی کا ثبوت دیا ہو۔ مذہب کے عقائد کو سائنس کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی ہو۔ اور سماجی زندگی میں پرانی حدبندیوں سے بہت بلند ہو کر فراخدلی اور ہمہ گیری کا نمونہ پیش کیا ہو۔ اس سے ہم کیسے امید رکھ سکتے ہیں کہ وہ تعلیم کے مسئلہ پر گہری

اور اچھی نظر نہ رکھتا ہوگا۔ ان کے سماجی اور معاشی پس منظر کو دیکھ کر کسے خیال آ سکتا ہے، کہ سرسید نے کبھی کسانوں کی تعلیم پر بھی کچھ لکھا ہوگا، لیکن ان کے ۱۸۶۶ء کے ایک لکچر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذہن رسا ان مسائل کے تاریک گوشوں تک پہنچتا تھا۔ ان کو اپنے عظیم الشان گھیرے میں لیے ہوئے ان کے مختلف پہلوؤں کو یوں گھماتا پھراتا تھا جیسے کوئی پرکھنے والا جوہری بغیر تراشے ہوئے ہیرے کو ہاتھ میں لیے جانچ رہا ہو۔ ان کے چھپے ہوئے اشاروں۔ ان کے وقتی جملوں سے اس سوجھ بوجھ اور دانائیت کا پتہ چلتا ہے جس سے سنبھلے ہوئے دل دماغ زندگی کے ہر مسئلہ کو سمجھنے اور سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

تعلیم کے بارے میں سرسید حکومت کی جانب سے کچھ ایسے خوش اعتقاد واقع نہیں ہوئے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ قوموں کی زندگی ان کے اپنے آپ بدلنے سے بدلتی ہے۔ کسی غیر حکومت کی شیشہ گری سے نہیں بدلتی، اور قوم میں ان کی نظر رہ رہ کر اوپر کے طبقے پر پڑتی تھی وہ خود اسی طبقے کے فرد تھے اور ان کی امیدیں انہی سے وابستہ تھیں۔

۱۸۶۶ء کے اس لکچر میں انہوں نے ہندوستانی سرداروں اور عمائدین قوم کو یہ بتایا ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں کی بھلائی کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ سرسید کی رائے میں تعلیم کے لیے کئی ایک قسمیں ہونا چاہئیں۔ اور ان میں سے ایک اہم صنف کاشتکاروں کی تعلیم ہے جس کا ذریعۂ تعلیم دیسی زبان ہو جس میں کسانوں کو لکھنا پڑھنا اور حساب کی تعلیم دی جائے۔ لیکن سرسید کا تخیل کتابی تعلیم کی حد بندیوں پر آکر رک نہیں جاتا بلکہ ایک چڑھتے ہوئے دریا کی طرح اسے توڑ کر آگے نکلتا ہے۔ ان کی رائے میں کاشتکاری سکھانے کے لیے مدرسے قائم ہونا چاہئیں۔ کسان کو اچھے مویشی پالنے کا فن سکھانا چاہیے۔ آسٹریلیا کی طرح بھیڑوں بکریوں کی نسل بہتر بنانے کے لیے گر بتانا چاہیے۔ گایوں اور بیلوں کی اچھی نسل تیار کرنے میں امداد دینا چاہیے۔ اسی زمانے میں بنگال کے ایک زمیندار نے حکومت بنگال کو ایک زراعتی مدرسہ کھولنے کا مشورہ دیا تھا جسے گورنر نے قبول نہیں کیا۔ اس پر سرسید افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ حکومت نے ایسی معقول اور مفید تجویز کو منظور نہیں کیا، لیکن اک بلند ہمت پیش رو کی طرح

وہ راستہ کی ان مصیبتوں سے آزردہ خاطر نہیں ہوتے۔ اس گرد راہ کو چلتے چلتے دامن سے جھٹک دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زمیندار کو چاہیے ہر کام میں گورنمنٹ کی امداد کی آرزو نہ کریں۔

اس لکچر میں سرسید امرا کو مشورہ دیتے ہیں کہ انھیں مفید علم کی ارزانی سے اشاعت کرنی چاہیے۔ تاکہ علم اتنا عام اور سستا ہو جائے کہ لوگ چھوٹی سستی کتابیں گلی کوچوں میں بیچتے پھریں جہاں صبح و شام جمع ہوتے ہوں۔ وہاں سستا اخبار سنایا جائے۔ لیکن ان کی رائے میں ان اخبارات کا مطمح نظر تخریبی نہ ہو بلکہ تعمیری ہو، اس کا مطالعہ نظر میں وسعت اور قلب میں گہرائی پیدا کر دے نہ کہ دماغ میں بارود کی طرح چڑھ جائے۔ ان کے اپنے الفاظ میں اخبار کے ذریعہ ایسی غذا دی جائے جس میں گرمی اور جوش نہ ہو بلکہ ملائم اور ٹھنڈی ہو۔ اس کے علاوہ عوام کے لیے لکچروں کا انتظام بھی کیا جائے۔ مردوں اور عورتوں کی تعلیم کا انتظام ہو۔ تعلیم خاص اور تعلیم عام کا لحاظ رکھا جائے۔ ذہنی اور جسمانی تربیت دونوں ساتھ ساتھ ترقی کریں۔ علم کی اشاعت کے لیے ایسوسی ایشن اور سوسائٹی قائم کی جائے۔ عمدہ عمدہ علوم و فنون کو ترقی دی جائے۔ ان کے رواج کے لیے علمی روزنامے نکالے جائیں۔ علمی لیاقت اور خوبی صنعت کے لیے انعام مقرر کیے جائیں۔

آج اتنے سال گذرنے پر ہم تعلیم بالغاں کے میدان میں اپنے کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو اس تعلیم کا وہ بالیدہ تخیل نہیں پاتے جس کی طرف سرسید نے اتفاقیہ طور پر سرسری سے الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ لیکن آج مابعد جنگ کی دنیا میں تعلیم بالغاں کی بنیادیں انہی خطوط پر استوار ہو رہی ہیں۔ سارجنٹ اسکیم بھی تعلیم بالغاں کو محض لکھائی پڑھائی اور گنتی سے آگے بڑھا کر اسی تخیل کی سطح پر لے جانا چاہتی ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ سرسید کے ذہن میں ڈنمارک کے فوک اسکولوں کی تصویر موجود تھی۔ یا وہ دہلی کے کوچوں بازاروں میں بالشوک روس کے سے کوچہ کلب کھول دینا چاہتے تھے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان کے سامنے اس طرز کی تعلیم کا ایک ایسا تخیل موجود تھا جسے ہمارے ماہرین ایک عرصہ تک پا نہیں سکے۔ اس لکچر میں آگے چل کر انھوں نے محض تعلیم کے لیے نہیں بلکہ پورے ملک کی شادابی اور اس کے عوام کی فلاح اور بہبودی کے لیے مشورے دیے ہیں۔ ان کی رائے میں

ملک کی کانوں کا استحان ہونا چاہیے۔ حرفہ اور فنون کے ادارے، صنعت کے کارخانے قائم کیے جائیں شہر کے نئے نئے نقشے اور خاکے بنائے جائیں۔ ان میں صفائی اور دوائی ہر قسم کی آسانیاں مہیا کرنا چاہئیں

تعلیمی مسائل میں ان کی بالیدہ نگاہ کا اور کچھ اندازہ لگانا ہو تو ۱۸۷۰ء کی اس تعلیمی اسکیم کا مطالعہ کیجیے جو سرسید اور جسٹس محمود نے تیار کی تھی اور کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان کے سامنے پیش کی گئی تھی اس اسکیم کو مرتب کرتے وقت ان کا مطمح نظر آکسفورڈ اور کیمبرج کے سودیشی نمونے تیار کرنا نہیں تھا۔ بلکہ پوری قوم کے لیے ایک حد تک مکمل نظامِ تعلیم بنانا تھا۔ اس اسکیم میں ایک علی گڑھ کے لیے جگہ نہیں تھی۔ بلکہ ہر شہر، قصبہ اور ضلع کے لیے مدارس تجویز کیے گئے تھے جن میں ذریعۂ تعلیم اردو قرار پایا گیا اور انگریزی کی حیثیت ثانوی زبان کی رکھی گئی۔ ہر گاؤں اور ہر قصبہ میں مکتب قائم کرنے کی تجویز تھی جن میں قرآن شریف، اردو اور حساب کی تعلیم دی جائے اور کسی قدر فارسی اور انگریزی بطور دیگر زبان کے ہو۔ ان کے علاوہ حفظ قرآن کے مکاتب جن میں قرآن حکیم حفظ کرایا جائے۔ جب کہ انگلستان جیسے ملک میں بھی تعلیم عوام کا شعور پورے طور پر بیدار نہ ہوا تھا۔ بنگالی بابو بھی بعد رالوک کو ہی انگریزی سکھلانے میں لگے تھے۔ ایسے وقت میں سرسید نے تعلیم عوام کی پیش کش کرکے اپنے تخیل کی توانائی اور رعنائی کا عجب مظاہرہ پیش کیا۔ اس اسکیم میں وفاقیت اور رجائیت تھی اور انگلستان کی سیر کے اثرات کے باوجود اس میں تعلیم کا وہ خالص ایشیائی تصور موجود تھا جس کی رو سے تعلیم خلق اللہ کا پیدائشی حق سمجھا جاتا ہے۔

ایسے نظامِ تعلیم کا تصور اب تک نہ تو حکومت کو تھا اور نہ جدید تعلیم والے ہندوستانیوں کو البتہ اس کا دھندلا سا خاکہ اس ٹوٹے ہارے دیسی تعلیم کے نظام میں نظر آتا تھا جو زمانے کی نیرنگیوں اور حکومت کی کج ادائیوں سے آخری سانس لے رہا تھا۔

اگر اس عظیم الشان اسکیم کی کسی ابتدائی شکل میں بھی داغ بیل ڈال دی جاتی اور کسی صورت سے اسے پرانے نظامِ تعلیم سے پیوند کر دیا جاتا تو آج مسلمانوں کی تعلیم کو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

قومیں اسکیموں سے نہیں بنتیں۔ خوابوں سے تعمیر نہیں ہوتیں۔ ان سے قومی زندگی کے خطوط مرتب ہو سکتے ہیں۔ ان کی داغ بیل پڑ سکتی ہے لیکن دیواریں نہیں اٹھتیں۔ گنبد اور کلس نہیں بن پاتے۔ اگر سرسید اس اسکیم کو ایک زندہ حقیقت بنانے میں ناکام رہے تو اس لیے نہیں کہ ان کے شوق میں انتہا کی بلندی تھی۔ بلکہ اس لیے کہ دوسروں کی ہمت میں بلا کی پستی تھی اور اگر وہ علی گڑھ کی چند کلیوں پر قناعت کر گئے تو اسی لیے کہ قوم کے پاس تنگی داماں کا کوئی علاج نہیں تھا۔

وہ کالج کو ایک آزاد اور خود مختار یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے۔ لیکن حکومت ان کو اپنی یونیورسٹی کا حلقہ بگوش بنانا چاہتی تھی۔ ایک جانب حکومت ان کی گردن کے لیے زریں حلقہ اور سیمیں ٹیکا لیے کھڑی تھی اور دوسرے ہاتھ سے سررشتۂ تعلیم کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی تھی۔ سرسید ایسی چیز کو برداشت نہ کرتے۔ وہ ایسی چیزوں کو برداشت نہ کرنے کے عادی تھے۔ لیکن انھوں نے یہ تلخی اپنے لیے نہیں قوم کے لیے گوارا کر لی۔ زر امدادی کی خاطر انہیں اپنی تعلیمی اسکیم سے دست بردار ہونا پڑا اور حکومت کا زریں جوا کندھے پر لینا پڑا۔

سرسید کے تعلیمی فکر کا پہلا دور اک دریائے ذخار ہے جو اپنی وسعتوں میں ایک دنیا کو سمیٹ لینا چاہتا ہے۔ لیکن اس کا دوسرا دور جو سفر انگلستان کے بعد سے شروع ہوتا ہے اک ایسی میدانی ندی ہے جو مدمم سروں میں ترنم ریز ہے۔ نم ریز ہے۔ لیکن ولولہ انگیز نہیں۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب انھوں نے مرادآباد میں عوام کے لیے فارسی کا مدرسہ قائم کیا تھا۔ غازی پور کا مدرسہ بھی ایک حد تک عوام کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کھولا گیا تھا۔ سرسید نے خود دہلی کے اس علم کدے میں تعلیم حاصل کی تھی جس کے دروازے امیر اور غریب سب کے لیے کھلے تھے۔ جہاں بڑے اور چھوٹے سب کے لیے علم کی لوٹ مچی تھی۔ اب ان کی تمام امیدیں اونچے اور درمیانے طبقے کی تعلیم پر ٹھٹک کر رہ گئیں۔ اب مدرسوں کی جگہ آکسفورڈ اور کیمبرج کے نقشے نگاہوں کے سامنے پھرنے لگے۔ ایسا کیوں ہوا۔ اس کا جواب ہمیں ان کے تخیل کی پستی میں یا ان کے حوصلے کی

کمی میں نہیں ملکہ ان کے ذرائع اور وسائل کی حد بندیوں میں ملے گا۔

سرسید کو اِس امر کا احساس تھا کہ لوگ ان کی رائے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ ان کے بعض جگری دوست عام اور سستی تعلیم کے مسئلہ پر ان سے علیحدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ لوگ کان فرنس کی بھری محفل میں ان سے پوچھتے تھے کہ کیا غریبوں کے بچوں کو جہاز میں بٹھا کر دور کسی بدوؤں کی آبادی میں اتار دیا جائے۔ عوام کی نگاہیں بار بار ان سے تقاضہ کرتی تھیں کہ وہ کب تک اعلیٰ تعلیم کے رنگریز بنے رہیں گے۔ لیکن ان سب مخالفتوں کے باوجود سرسید اپنی ضد پر قائم رہے۔ اِس لیے نہیں کہ وہ ضدی اور ہٹی تھے بلکہ اِس لیے کہ انھیں اس ضد میں اپنی قوم کی بھلائی نظر آ رہی تھی۔ ہر کسی نے قوم کی نبض کو ٹٹولا۔ اس کے مرض کی تشخیص کرنا چاہی۔ سرسید نے بھی اپنے طریق سے اس کا مداوا سوچا۔ وہ بھی ہندوستان کے ان روائتی حکما میں سے تھے، جو اکٹھے مل کر فیل ہندوستان کے ناک نقشے کا اندازہ کرنے چلے تھے۔ ان کے الفاظ میں ہم لوگ جو قومی ترقی کی تدبیریں سوچتے ہیں مثل اندھوں کے ہیں، جو ٹٹول کر ہاتھی کی صورت جاننا چاہتے ہیں۔ ہر ایک نے ایک عظیم الجثہ جانور کے مختلف اعضا کو ٹٹولا۔ اور سب نے اس کی مختلف صورت بیان کی۔ اسی طرح ہم نے اِس عظیم الشان قوت کو ٹٹولا جسے قومی ترقی کہتے ہیں، اور مختلف طریقے پر اِس کو سمجھا ہے۔"

سرسیّد اپنے آپ کو قومی مرض کا بقراط نہیں سمجھتے۔ وہ اپنے آپ کو ایک خوش آیند ملیند بہت کسر نفسی سے دوسرے اٹکل بازوں میں شمار کرتے ہیں۔ اپنے کو طبیب حاذق نہیں سمجھتے۔ اپنے حل کو آخری فیصلہ نہیں گردانتے۔ اپنے مشورے کو ایک تجربی منزل، ایک ابتدائی پروگرام کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ لیکن انھیں اِس ابتدائی منزل پر بے حد اصرار ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ انہیں قومی زندگی کے آخری مقصد کا شعور رہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم کو اس نئے زینے کی پہلی سیڑھی سمجھتے ہیں اور انکی رائے ہے اِس پر چڑھ کر بھی بام مراد کچھ ایسا قریب نظر نہیں آتا۔ ان کے الفاظ میں "اعلیٰ درجہ کی تعلیم قومی ترقی کی پہلی سیڑھی ہے قومی ترقی کا حاصل ہونا ابھی دور ہے۔ مگر اِس کثرت سے جیسے کہ کھچڑی میں چاول۔ اسی قسم کے تعلیم یافتہ ہماری قوم میں پیدا ہو جائیں گے۔ تو وہ قومی ترقی کے لیے مادہ یا ہیولیٰ

ہوں گے۔ علی گڑھ کالج کے قیام سے ان کا مقصد اسی مادہ یا ہیولی کو تیار کرنا تھا۔

لوگ سرسیّد کو لاکھ تنگ نظر کہیں۔ رجعت پسند کہیں۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے مسلمانوں کے مسائل کو ان کی تعلیمی مشکلات کو حقیقت کی بھرپور نگاہ سے دیکھا تھا۔ جبکہ ملک کا لکھا پڑھا طبقہ اپنی بڑھتی ہوئی طاقت کے نشہ میں ملک کو بے سوچے سمجھے اس جمہوری تصور کی طرف لے جا رہا تھا جسے اکثریت کی حکومت اور ووٹ کی جنت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جبکہ یہ طبقہ ہماری قومی زندگی کو اس راستہ پر لے جا رہا تھا جس نے ہمیں آج ایک سیاسی دلدل میں لا پھنسایا ہے ادھر دوسری مذہبی اور سماجی تحریکیں بھی نسلی قومیت اور فرقہ وارانہ ذہنیت کو پروان چڑھا رہی تھیں۔ ایسے حالات میں سرسید نے اپنی قوم کے لیے ایسا راستہ نکالا جس میں نہ تو مذہبی رہزنا کی تھی نہ سیاست کی اقتدار پرستی۔ اگر دوسرے انگریزی جمہوریت کے اداکار تھے تو سرسیّد انگریز کے تعلیمی تخیل کے پرستار تھے۔ اگر انگریزی کی تعلیم درمیانی طبقے کے لیے تھی تو اس کی ریاست بھی اسی گروہ کے ہاتھ میں تھی۔ سرسیّد کو نظر آرہا تھا کہ اس دیش میں حالات کی باگ ڈور ایک زمانے تک درمیانی طبقے کے ہاتھ میں رہے گی جس میں عوام کالانعام جتتے ہوں گے۔ اور کچھ عرصہ تک کے لیے اچھی خدمت یہی تھی کہ اس طبقے کی ذہنیت میں سلجھاؤ اور توازن پیدا کیا جائے۔

آج ہم جس پُرآشوب دور میں سے گذر رہے ہیں اس کی ذمہ داری کس پر ہے۔ کیا عوام کے سر جو دوسروں کے ہاتھوں میں درندوں کی طرح خون کی ہولی کھیل رہے ہیں یا اس حیوان کا نب یعنی درمیانی طبقے کے سر جس نے کچھ جھوٹ سچ لکھ پڑھ کر اس حیوان ناطق کے گلّے کو آگے لگا لیا ہے۔ ہمارے دیس کی آخری اور حتمی ضرورت عوام کی تعلیم ہے۔ لیکن ہمارے اس وقتی اور فوری اعصابی حملے کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم درمیانی طبقے کی ذہنیت کو ختم کر دیں اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو اس طبقہ کو ہی ختم کر دیں جن حالات میں سرسیّد کام کر رہے تھے۔ اس میں بھی فوری اور وقتی کام اس طبقے کی امداد سے ہو سکتا تھا اور ہوا۔ اسی لیے انھوں نے سب سے پہلے اس کی تعلیم پر زور دیا۔ پھر حکومت کے نظریۂ تقاطرنے بھی ان کے خیالات کو نئے سانچے میں ڈھالا ہوگا۔ ان کی رائے میں ادنیٰ اعلیٰ کی پیروی کرتا ہے

اور جب تک اعلیٰ درجہ کی تعلیم نہ ہو ادنیٰ نہیں پھیل سکتی ۔

انگلستان کے سفر نے اس رجحان کو ایک اور سہارا دیدیا ۔ ۱۸۷۰ء کا انگلستان ملکہ وکٹوریہ کا انگلستان تھا ۔ یہ عوام کا نہیں درمیانے طبقے کا انگلستان تھا ۔ اس کی تجارت کی گرم بازاری اس کی صنعت و حرفت کی برق رفتاری سب کے سر چڑھی تھی ۔ ظاہر بیں کتنا کامیاب کس قدر بلند لیکن حقیقی معیاروں اور اقدار میں کس قدر کھلا اور نمائشی ۔ افسوس یہی ہے کہ سرسید ان کے کھوکھلے پن کو پا نہ سکے ۔ اس کے اوپر کے رنگ و روغن کو کھرچ کر اس کے نیچے سے نہ دیکھ سکے ۔ دیسے دیکھنے میں یہی لوگ سلطنت برطانیہ کے نگہبان تھے ۔ دفتری حکومت کی جان تھے ۔ اسی لیے سرسید نے بھی اپنی قوم کے اندر پاؤں میں چھبتے ہوئے خزف ریزوں کی بجائے آسمان میں چمکنے دمکنے والے ستاروں پر نگاہیں جما دیں ۔ سرسید کہتے تھے کہ وہ ان ستاروں کو دیکھنا چاہتے ہیں جو چمک رہے ہیں ۔ نہ کہ نیلا نیلا سیاہ رو ذرات کا آسمان ، ان کے معشوقانہ انداز کی چمک سے سیاہ رو آسمان کو خوبصورتی حاصل ہے ۔ ان کا کہنا یہی تھا کہ ان ستاروں کو پیدا کیے بغیر اپنی سیاہ رو اور درماندہ ذلیل قوم میں کوئی خوبصورتی پیدا نہیں کر سکتے ۔

اس کے ساتھ ساتھ انہیں اپنی ہمت کی بلندی اور اگر ہر قوم کی بے مائگی اور قومی ارادوں کی پستی کو بھی نگاہ میں رکھنا تھا ۔ ان کے خیال میں ادنیٰ اور اعلیٰ تعلیم کا بڑے پیمانہ پر بندوبست کرنا قوم کے بس کی بات نہ تھی ۔ مسلمانوں کی حالت ایک ایسے شخص کی سی ہے جو نہایت پیاسا اور بھوکا ہے ۔ ہم اسے روٹی دیتے ہیں لیکن پانی کا بندوبست نہیں کرتے ۔ ایسی حالت میں وہ روٹی چکھتے چکھتے پیاس سے دم توڑ دے گا ۔ ادنیٰ تعلیم کے لیے چھوٹے اسکول قائم کرنا ، پیاسی اور بھوکی قوم کو روٹی پیش کرنے کے مترادف ہے ، حالانکہ قوم کو ٹھنڈے پانی یعنی اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہے ۔

اس فوری علاج کے سامنے وہ دوسری سب چیزوں کو پس پشت ڈال دینا چاہتے تھے ۔ تعلیم نسواں ابھی وقت اور فرصت کا انتظار کر سکتی تھی ۔ ٹیکنیکل تعلیم کی بھی فوری ضرورت نہیں تھی

محض علوم کی اعلیٰ تعلیم ہی وہ سلسبیل اور آبِ زنجبیل تھی جو قوم کی روح کو سیراب اور اس کی زندگی کو شادآب کر سکتی تھی۔ اس سیرابی اور شادابی کا کام سرسید نے اپنی بساط اور حوصلے کے مطابق پورا کر دکھایا۔

سرسید نے ایک عظیم الشان کالج کی بنیاد ڈالی۔ لیکن اس سے زیادہ ایک عظیم الشان تحریک کی۔ انہوں نے خیالات کی منجمد جھیل میں ایک ہیجان اور روایات اور پرانے تصورات کے زمین بند سمندر میں ایک طوفان پیدا کر دیا۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسا رنگریز کہتے تھے جس کے مٹکے میں سے ایک ہی رنگ نکلتا ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو ان کے تخیل میں بلا کی رعنائیاں، ان کے عمل میں عجیب و غریب رنگ آرائیاں تھیں۔ ہمارے کسی ایک واحد لیڈر نے قومی زندگی کے اتنے پہلوؤں کو ایک ساتھ سمیٹنے کی کوشش نہیں کی۔ کسی ایک سررشتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا نے اور اس طرح سب کو آگے بڑھانے کی سعی نہیں کی۔ ہمارے کسی ایک لیڈر کی شخصیت کی اٹھان بھی ایسے عظیم الشان خطوط پر نہیں ہوئی جیسے سرسید کی جس میں ایک جانب سچی مشرقیت جھلک رہی تھی۔ دوسری جانب مغربیت اور اس کے علوم و فنون کی بے لاگ محبت کہیں کہیں آرزو کو سنوارا جا رہا تھا۔ کہیں سماجی معاشی زندگی کے آئین کو نئے سانچے میں ڈھالا جا رہا تھا۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ذریعہ سائنس کی نئی معلومات کو قوم تک پہنچانے کی کوشش ہو رہی تھی اور کہیں مذہب کو اس نئی کسوٹی پر پرکھا جا رہا تھا۔

انہوں نے زندگی کو مختلف ڈربوں اور کابکوں میں تقسیم نہیں کیا۔ بلکہ ایک مسلسل مربوط بہتی ہوئی رو تصور کیا۔ اس ہمہ گیری اور رومانیت کی برکت سے انہوں نے تعلیم کو بھی محض کتابی سطح سے اٹھا کر اکتسابی اور کرداری بلندیوں تک پہنچا دیا۔

اگر ہم اس زمانے کی دوسری تعلیمی اور سماجی تحریکوں کا مطالعہ کریں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ سرسید کے ہاں تعلیم کا تصور کتنا متوازن اور ہمہ گیر تھا۔ وہ مذہب کے معاملے میں سچے اور کرے مجاہد تھے اپنے مذہب کی حمایت میں وہ کسی لحاظ سے آریہ سماجیوں یا دوسرے لوگوں سے کم نہ تھے۔ اور اگر وہ اپنی تعلیم کی بنیاد اوروں کی طرح مذہبی نوعیت پر رکھ جاتے تو ہم انہیں حد درجہ سمجھتے تھے وہ

وہ مغربیت کے ایسے والہانہ پرستار تھے کہ اگر وہ ایک ہندوستانی ایٹون یا رگبی بنا جاتے تو ہم انہیں مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے تھے لیکن انہوں نے نہ تو گوررکل بنائے نہ رگبی۔ انھوں نے علی گڑھ کی بنیاد رکھی۔ ان کی تعلیم کا تخیل انسانیت اور ثقافت کی بنیادوں پر اٹھایا گیا۔ اسے ایک سچے مذہبی اور اور قومی جذبے نے پروان چڑھایا۔ ان کے لگائے ہوئے پودے سے وہ بچھو والی بوٹی اور ناگ پھنی پیدا نہ ہوئیں جنھوں نے دوسری تحریکوں کے ہاتھوں اس ملک میں کانٹے بو دیے ہیں۔ ان کی تحریک مسلمانوں کے لیے تھی۔ لیکن اس کے وسیع سینہ میں ہندوؤں کے لیے ہمیشہ جگہ رہی۔ اگر اس کی آغوش میں مولانا محمد علی اور حسرت موہانی نے پرورش پائی ہے تو راجہ مہندر پرتاب نے بھی اسی مادر مہربان سے رواداری محبت اور قربانی کا سبق لیا۔

لوگ اکثر علی گڑھ کے کھلنڈرا پن پر حرف رکھتے تھے۔ اس کے مزاج اور ہنسوڑپن کو کچھ مربیانہ سی نظر سے دیکھتے تھے کہتے تھے کہ علی گڑھ میں کوئی بھڑکتا ہوا آدرش نہیں۔ کوئی دہکتی ہوئی آگ نہیں لیکن عدم تعاون کی تحریک نے دکھا دیا کہ علی گڑھ میں مسکراتے ہوئے ہونٹوں کے پیچھے ایک دردمند دل، ایک حوصلہ مند جگر بھی تھا۔

بعض لوگ کہتے تھے کہ علی گڑھ انگریز کی نقالی ہے۔ ایک ایسا عکس ہے جو کسی ناہموار آئینہ میں نظر آرہا ہو۔ لیکن یہ اعتراض ان لوگوں کے منہ سے بھلا نہیں لگتا جنھوں نے انگریز کے سوٹ اور بوٹ کی نقل کی۔ اس جمہوریت اور استعماریت، اس کی دفتری حکومت اور میکانیت سبھی کو اپنا لیا۔ لیکن اس کے دل کے روزن میں سے کبھی جھانک کر نہ دیکھا۔ اس کی روح کو نہ پہچانا، ہم اس کے مزاج کو نہ لے سکے۔ اس کے کھلنڈراپن کی شان کو نہ اپنا سکے۔ اتنے سال کے تجربے کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارے یہاں نہ دکھتی رگوں کی کمی ہے اور ——— نہ بھڑکتے ہوئے شعلوں کا کال ہے۔ اگر کمی ہے تو ایسے مزاج اور ظرافت کی جو شعلوں کے لیے پانی کا کام دے اور دکھتی رگ والوں کو بتا سکے کہ اس دکھ کا علاج اک صحت مند روح و قلب کے سوا اور کچھ نہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ دونوں خصوصیتیں علی گڑھ کا سرمایہ رہی ہیں۔ قوم کے لیے ہی نہیں پورے

ہندوستان کے لیے اگر ہم انھیں دوسروں تک لے جا سکے، تو یہ ملک کی بڑی خدمت ہوگی۔ اور اگر ہم انھیں محفوظ نہ رکھ سکے تو اِس میں ہمارا ہی نہیں سبھی کا نقصان ہے۔

لیکن سرسیّد کے قول کے مطابق یہ تحریک قومی ترقی کی پہلی سیڑھی تھی۔ ابھی قوم کو بہت سی منزلیں طے کرنا باقی تھیں۔ انھوں نے ایک عظیم الشان محل کی داغ بیل ڈال دی۔ اس کی بنیادوں کو استوار کر دیا۔ اسے بامِ فلک تک پہنچانا آنے والی نسلوں کا کام تھا۔ ابھی تک کھچڑی میں چند ہی چاول تھے۔ آنے والوں کو اسی دیگ میں سے کیا کچھ رنگا رنگ کے خوانِ نعمت نکالنا تھے۔

ایک مصلح کی کامیابی اِس میں نہیں کہ وہ کیا کچھ کر گذرتا ہے بلکہ اِس میں کہ وہ کتنوں کو کیا کچھ کرنے کے قابل بنا جاتا ہے۔ کتنی راہیں روشن کر جاتا ہے۔ کیسے کیسے ٹھنڈے دل گرما جاتا ہے۔ کیا کیا امیدیں جگا جاتا ہے۔ اس کی فتوحات اینٹ اور پتھر کی تعمیر میں نہیں دلوں کی تعمیر اور ان کی تسخیر میں ہے۔

اگر ہمیں سرسید کے نقشِ قدم پر چلنا ہے تو ایک نہیں بیسیوں علی گڑھ بنانا ہوں گے۔ گاؤں گاؤں اور قصبے قصبے مدرسے قائم کرنا ہوں گے۔ اِس نئے آہنگ کو لینا ہوگا جس سے مغرب کا سازِ زندگی کے تاروں کو مرتعش کر رہا ہے اور اِس کے ساتھ ان دھیمی ملائم سروں کو ملانا ہوگا جو سکوتِ مشرق سے اُٹھ رہی ہیں۔ ہمیں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو دوبارہ زندہ کرنا ہوگا تعلیم بالغاں کو لکھائی پڑھائی اور گنتائی کی سطح سے بلند کرنا ہوگا۔ اس طرح ہم نہ صرف ستاروں کو پیدا کر سکیں گے۔ بلکہ پوری فضا کو اِک برق پاش ضیاء سے بھرپور کر دیں گے۔

باوقار اُستاد

انور علی قریشی

۱۹۳۶ء میں بی۔ٹی میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ ثانوی مدارس کے طلبا کی نگاہ میں بالعموم اپنے اساتذہ کا کوئی وقار نہیں۔ سنٹرل ماڈل سکول کے ایک کھلاڑی طالب علم نے ہمارے ایک ہم جماعت سے کہا کہ آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔ مگر آپ نے یہ کیا کیا کہ بی ٹی میں داخلہ لے لیا۔ چھبیس برس گذرنے کے باوجود یہ جملہ میرے کانوں میں گونجتا ہے۔ (اس ربع صدی میں استاد کے گرتے ہوئے وقار کے متعلق بہت کچھ سنا اور دیکھا بھی مگر میری طبیعت اب تک اس بات کو گوارا نہیں کرتی کہ استاد باوقار نہیں ہو سکتا۔

وہ کونسا سٹاف روم ہے جہاں اس موضوع پر بحث نہیں ہوتی کہ معاشرہ میں ہماری کوئی عزت نہیں۔ ہمیں سماج میں کوئی مقام حاصل نہیں۔ استاد کو کون پوچھتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اسی قسم کے رجحانات نے مدرس کے ذہن میں شدید احساس کمتری پیدا کر دیا ہے، جو استاد کے وقار کو مزید تنزل کی طرف لیے جا رہا ہے۔ اس کے برعکس میرا یہ نظریہ بلکہ ایمان ہے کہ مدرس خواہ وہ پرائمری سکول میں ہو یا ثانوی ادارے میں ہو، ہمارے معاشرے کا ایک نہایت اہم، مفید، باعزت اور باوقار فرد ہے، بشرطیکہ وہ صحیح معنوں میں مدرس ہو۔ استاد یقیناً وہ محور ہے جس کے گرد معاشرہ کا مستقبل گھومتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنے صحیح مقام کو پہچانے اور اپنے فرائض کو کمال تندہی سے پورا کرے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مدرس کی شخصیت کیسی ہو اور وہ کیا کرے کہ طلباء اس کے رفقائے کار اور والدین اس سے خوش ہوں اور اسے اپنا صحیح مقام حاصل ہو جائے۔

میں ذیل میں اپنی تدریسی زندگی کے تجربات کا نچوڑ عرض کرتا ہوں جس پر عمل پیرا ہونے سے ہر استاد یقیناً اپنے ماحول میں آبرومندانہ زندگی بسر کر سکتا ہے۔

کیریکٹر

بچوں کی نگاہ میں استاد کی اپنی شخصیت چلن اور کردار اس کے جملہ اوصاف میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ بچوں میں تجسس کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف استاد کے لباس اور جسم کو دیکھتے ہیں بلکہ اس کے چلن اس کی عادات اور اس کے اٹھنے بیٹھنے پر بھی غور کرتے ہیں۔ اگر بحیثیت مدرس کے وہ بہت کامیاب نہیں بھی ہے۔ تاہم نیک استاد کا گھر گھر چرچا ہوتا ہے۔ بچہ نہ صرف ایسے استاد کے درس سے فیض حاصل کرتا ہے۔ بلکہ خود کو ویسی ہی زندگی میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اساتذہ کو یہ چیز خوب سمجھ لینی چاہیے کہ بچے کی نگاہ میں صرف دو ہیرو ہوتے ہیں جن کی وہ پیروی کی کوشش کرتا ہے۔ ایک باپ اور دوسرا استاد۔ ان دونوں میں استاد کا مقام بلند تر ہے کیوں کہ وہ استاد ہے۔ قدرت نے اسے قوت انتقادی دی ہے۔ اکثر بچے اپنے گھروں میں امی اور ابا کی بات کو یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ ان کے استاد نے ایسا نہیں کہا۔ یا ان کے استاد نے یوں کہا ہے۔ اسی طرح استاد کی تھوڑی سی لغزش اس کو معاشرہ میں رسوا بھی کر سکتی ہے۔ کیوں کہ اس کے ہر فعل کو ہر روز سینکڑوں نگاہیں دیکھتی ہیں۔ اس کی ہر حرکت سکول میں سینکڑوں نگاہوں اور ذہنوں پر منعکس ہوتی ہے۔ اور استاد کے اس فعل اور عمل کے چرچے گھر گھر شروع ہو جاتے ہیں۔ لہذا اساتذہ کو اپنے ہر فعل اور ہر عمل میں بہت ہی محتاط ہونا چاہیے۔ استاد کے علاوہ معاشرہ کے ہر فرد کی کوتاہی یا بے ڈھنگی عوام کی نگاہوں سے چھپی رہ سکتی ہے۔ مگر استاد کی کوئی حرکت پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ یوں سمجھیے کہ استاد کے سامنے بچے نہیں بیٹھے بلکہ کیمرے لگے ہوئے ہیں۔ وہ شاگرد نہیں بلکہ ٹیپ ریکارڈ ہیں۔ بلکہ ٹیلی ویژن سٹیشن جہاں نہ صرف استاد کا قول ریکارڈ ہوتا ہے۔ بلکہ اس کے ہر فعل کی تصویر بھی اتاری جاتی ہے۔ اور اوقات مدرسہ کے بعد بچے ان فلموں کو والدین کی ذہنی سکرینوں پر پروجیکٹ کرتے ہیں۔ اساتذہ کا عیب تو بہت بڑی بات ہے ان کی عام عادات بھی بچوں کی تنقید سے محفوظ

نہیں رہتیں۔ عام عادات سے مراد (MANNERISM) ہے۔ مثلاً استاد کا عادتاً ایک ہی طرح حرکت کرنا، آتے ہی کرسی پر بیٹھ جانا، پھر اٹھ کر مخصوص انداز میں سبق شروع کرنا۔ دوران سبق ایک ہی طرح بازو یا انگلی ہلانا، تمام بچوں کو غصے میں ایک ہی طرح خطاب کرنا اور ایک ہی طرح کی بدنی سزا دینا، استاد کو ان تمام حرکات سے بچنا چاہیے جن کی نقل بچے اپنے فارغ اوقات میں نقالی کریں اور اپنے لیے وقتی مسرتوں کا سامان پیدا کریں۔

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہمارے پرانے مبلغین، آئمہ دین، علماء، صوفیا جن کی کاوشوں سے دنیا میں اسلام پھیلا۔ جن کے نور بصیرت سے ہم نے اپنی ذہنی اور روحانی شمعیں روشن کیں اور جن کی جدوجہد کا یہ نتیجہ ہے کہ آج دنیا میں کروڑوں مسلمان موجود ہیں۔ ان میں بیشتر ہستیاں درس و تدریس پر تکیہ کیے ہوئے بیٹھی رہیں۔ اور اپنی انتھک کوششوں سے دنیا کو تعلیم دین سے بہرہ ور کرتی رہیں اگر ہم ماضی کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں وہ پاک مدرسین نظر آتے ہیں جنھوں نے دنیا کے چپے چپے پر درس کھولے ہوئے تھے۔ وہ مدرسین نہ صرف علوم ظاہری کا درس دیتے تھے اور ان کی تدریس اپنے شاگردوں کو صوفی اور ولی کے درجے پر پہنچا دیتی تھی۔ یہ درست ہے کہ وہ ہستیاں علمی تبحر کی مالک تھیں مگر علم سے بڑھ کر ان میں جو وصف تھا وہ کیریکٹر اور اخلاق کا تھا۔ یعنی وہ علما باعمل تھے جو کہتے تھے وہی کرتے تھے اور جو کرتے تھے وہی کہتے تھے۔ مثلاً سید علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ نے لاہور میں ابتداً معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ مگر اس میں بھی تکبر کی بو پا کر اسے ترک کر دیا۔ بھلا اس سے بڑھ کر اصلاح نفس کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔ یہی کیریکٹر تھا جس کی بنا پر ہمارے آئمہ دین کو معاشرہ میں وہ مقام حاصل ہوا کہ سینکڑوں سال گزر جانے کے بعد ہم ان کا نام ادب سے لیتے ہیں۔ ان کا ذکر سن کر دو زانو ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کی داستان حیات کو دہرا کر اپنی محفلوں میں خیر و برکت کے متمنی ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ویسا ہونا بڑا مشکل ہے، مگر ان کی تھوڑی بہت تقلید، ان کے چلن کی کچھ نہ کچھ پیروی اور ان ہستیوں کی جلائی ہوئی مشعلوں سے تھوڑا بہت نور حاصل کر لینا آج بھی دشوار نہیں ہے۔ میرا یہ ایمان ہے کہ جب تک استاد صوفیانہ رنگ

اختیار نہیں کرتا۔ جب تک استاد میں فقر و درویشی غالب نہیں آتی وہ معاشرہ میں اپنا صحیح مقام ہرگز حاصل نہیں کر سکتا۔

علمی تبحّر

میری نگاہ میں استاد میں جو دوسرا وصف ہونا چاہیے وہ علمی تبحر ہے جس کے بغیر طلبہ کی نگاہ میں استاد کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ ہماری اکثریت بی اے، ایم اے پاس کر لینے کے بعد یہ فرض کر لیتی ہے کہ اب ہم سکول کے بچوں کو پڑھانے کے لیے کافی علمی جوہر رکھتے ہیں۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے۔ صحیح معنوں میں استاد وہی ہے جو تمام عمر طالب علم رہتا ہے۔ اسے چاہیے کہ اپنے علم میں اضافہ کرتا رہے۔ اگر اس کا مبلغ علم اپنی درسی اور نصابی کتب تک محدود ہے تو وہ اپنے اچھے طالب علموں کی ذہنی سطح سے اوپر نہیں جا سکتا۔ مثلاً اگر تاریخ کا استاد اپنی درسی کتاب دیکھ کر کلاس میں پڑھانے کے لیے آجاتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنے شاگردوں کو مطمئن کر سکوں گا تو وہ ایک بہت بڑے مغالطے میں مبتلا ہے ان حقائق کو جو درسی کتاب میں دئے گئے ہیں چند ہونہار بچے سبق سے پیشتر ہی جانتے ہیں۔ استاد کو چاہیے کہ وہ متعلقہ موضوع کے متعلق اتنا جانتا ہو کہ محض ایک دل چسپ تقریر کے بل بوتے پر تمام بچوں کو مطمئن کر سکے۔ ان کے علم میں دل چسپ اضافہ کر سکے اور ان کو ایسی باتیں بتا سکے جنھیں وہ عمر بھر نہ بھولیں۔ گذشتہ چند سال میں ہمارے تاریخ کے اساتذہ کے لیے مزید سہولت یہ پیدا ہو گئی ہے کہ پاکستان پر بے شمار نئی کتب لکھی جا چکی ہیں۔ ہماری ثقافتی، ادبی، فنی، تعمیری اور روحانی تاریخ پر بیشمار لٹریچر اردو زبان میں شائع ہو چکا ہے۔ ہمارے تاریخ کے استاد کے لیے لازم ہے کہ وہ ان مصنفین کی کاوشوں کا بغور مطالعہ کرے۔ تاکہ بچوں کے لیے اپنے اسباق میں صحیح قسم کا مواد مہیا کر سکے۔ اسی طرح سائنس کے اساتذہ کو سائنس دانوں کی جدید تحقیقات سے آگاہ رہنا چاہیے اور اس آگہی سے بچوں کی صحیح رہنمائی کرنا ان کا فرض ہے۔ قدیم و جدید علوم میں اضافہ کے علاوہ اساتذہ کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ جدید طریقہ ہائے تدریس سے آشنا ہوں، جن پر روز بروز تجربات ہو رہے ہیں۔ استاد کا فرض ہے کہ ان طریقوں کو طلبا پر آزمائے اور ان کے متعلق اپنی حتمی رائے قائم کرے۔ مثلاً معاشرتی علوم پڑھانے کا

بہترین طریقہ (LECTURE METHOD) سمجھا جاتا تھا۔ اور میں خود اس پر برسوں کاربند رہا۔ مگر جب میں نے (GROUP DISCUSSION) کا ذکر سنا تو اس کو اپنی کلاسوں میں آزمایا اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ طریق اول الذکر طریق سے بہت ہی بہتر ہے۔ مثلاً یہ کہ بچوں کو کلاس لائبریری کی مدد سے کسی خاص سبق کے بعد تیاری کرائی جائے اور بعد ازاں تمام بچوں کو اس موضوع پر بحث کرنے کی ترغیب دی جائے۔ میں نے یہ دیکھا کہ غبی سے غبی بچہ بھی اس بحث میں حصہ لیتا ہے اور سبق میں استاد کے ساتھ برابر کا شریک ہوتا ہے۔

اسباق کی تیاری

ہر استاد کے لیے لازم ہے کہ اپنے علم میں اضافے کے علاوہ روزمرہ کے اسباق کی تیاری ضرور کرے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اساتذہ کلاسوں میں بالکل کورے چلے آتے ہیں کسی شاگرد سے درسی کتاب لیتے ہیں اور کلاس مانیٹر سے پوچھتے ہیں کہ آج کیا پڑھنا ہے۔ اس سے زیادہ افسوسناک صورت اور کیا ہو سکتی ہے کہ استاد شاگرد سے پوچھے کہ آج سبق کہاں سے شروع ہوگا۔ اس مجرمانہ صورتِ حال کو روکنے کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات لازمی ہیں۔

(۱) ڈائری :- ہر استاد کے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنے اسباق کی روزانہ یا ہفتہ وار ڈائری لکھے۔ ڈائری میں ہر روز ٹائم ٹیبل کے مطابق مختلف اسباق پر مختصر سے اشارات ہوتے چاہئیں۔ یہ ڈائری روزانہ بھی لکھی جا سکتی ہے۔ اور ہر اتوار کو ہفتے کے آئندہ چھ دنوں کے لیے بھی لکھی جا سکتی ہے مگر (PERIOD WISE) ہونی چاہیے۔ استاد کی آزاد طبع پر ڈائری لکھنا ایک بہت بڑا بوجھ ہوتا ہے۔ مگر اس بوجھ کو بہر طور سنبھالنا چاہیے۔ کیونکہ اس پرداخت میں استاد کی کامیابی کا راز ہے۔ ڈائری لکھتے وقت وہ مجبور ہوگا کہ وہ نصابی کتب کو دیکھے۔ کتب کے ابواب کو اسباق میں بانٹے اور کتب کے مضامین پر حاوی ہو۔ ابتداً میں خود ڈائری کو ایک بوجھ تصور کرتا تھا۔ مگر طبیعت پر جبر کر کے اسے لکھنا شروع کیا تو میں نے دیکھا کہ میرا تدریسی جوہر چمکنے لگا ہے۔ چنانچہ ڈائری لکھنے کی کاوشوں کی بدولت میں نے کئی ایک انگریزی نظموں کا اردو نظم میں ترجمہ کر دیا۔ اور سب سے بڑا فائدہ میں نے

یہ دیکھا کہ میں نے اپنے آپ کو کسی روز کسی کلاس میں خالی الذہن نہیں پایا۔

(ب) روزانہ تیاری :- ڈائری لکھنے کے علاوہ اساتذہ کے لیے تدریسی زندگی میں سب سے بڑھ کر روزانہ اسباق کی تیاری ہے۔ میرا ہمیشہ سے یہ معمول رہا کہ ہر روز بوقت صبح نماز اور تلاوت قرآن کریم سے فارغ ہو کر ہر سبق کی تیاری کر لیتا تھا، خواہ مجھے اس پر کتنا ہی عبور کیوں نہ ہو۔ سب سے پہلے ٹائم ٹیبل دیکھتا پھر اپنی ڈائری کے اشارات دیکھتا جو مختلف کتب سے اخذ کیے ہوئے ہوتے۔ ان کتب کو پھر اچھی طرح دیکھ لیتا اور تمام سبق کو اپنے ذہن میں سلجھا لیتا کہ اس کو پیش کس طرح کرنا ہے۔ بچوں کے علم میں کیا اضافہ کرنا ہے۔ ان کے ذہن کو کس طرف لے جانا ہے۔ کس طرح سب کے لیے دلچسپی کا سامان پیدا کرنا ہے۔ اور سبق سے کیا نتیجہ اخذ کرنا ہے۔ اس طریقۂ کار کی بدولت میں نے یہ دیکھا کہ میں ہنسی خوشی سکول جاتا تھا۔ جماعت کے کمرے میں نہایت دلجمعی کے ساتھ داخل ہوتا تھا۔ دوران سبق بچوں کے ذہنوں کو اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتا تھا، اور جب کمرے سے نکلتا تو اس احساس سے خوش ہوتا تھا کہ میں نے بچوں کی معلومات میں حتی المقدور اضافہ کیا ہے اور میں یہ دیکھ کر بہت ہی مسرور ہوتا کہ بچے مجھ سے دوسرے سبق کے آغاز میں پہلے سبق کے متعلق دلچسپ سوالات پوچھتے۔ بہرکیف مدرسے جانے سے پیشتر استاد کے لیے یہ بہت ہی ضروری ہے کہ وہ اس روز کے جملہ اسباق کو بہت سلیقے کے ساتھ ذہنی کھونٹیوں پر لٹکائے رکھے۔ بچوں کو مجبور کرے کہ وہ اس سے سوال پوچھیں اور بجائے گھبرانے کے وہ ان سوالات کا اطمینان بخش جواب دے۔

ہمدردی

ماہرین نفسیات لکھتے ہیں کہ استاد میں تین خوبیاں ہونی چاہئیں

میرے خیال میں ان تینوں میں پہلی

یعنی ہمدردی، استاد کا سب سے بڑا وصف ہونا چاہیے۔ استاد

استاد نہیں کہلا سکتا جب تک کہ اس کے سینے میں اپنے طالب علم کے ساتھ کمال ہمدردی کا جذ

موجود نہ ہو۔ یہ درست ہے کہ اساتذہ کو تنخواہیں کم ملتی ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ معاشرہ ہماری قدر نہیں کرتا۔ یہ بھی بجا ہے کہ والدین بچے کی بہتری کے لیے ہم سے تعاون نہیں کرتے۔ بلکہ ہمارے ساتھ علیک سلیک کے بھی روادار نہیں۔ مگر ان تمام مجبوریوں کے باوجود استاد کے لیے لازم ہے کہ وہ بچے سے لوجہ اللہ کمال اخوت، ہمدردی اور محبت رکھے۔ محض اس لیے کہ بچہ قوم کا وہ ننھا سا فرد ہے جو اس کے پاس تحصیل علم کے لیے آیا ہے۔ پھر اس بلند نصب العین کی تکمیل کے لیے اس کے پاس کوئی سفارش نہیں۔ اب استاد کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کی ذہنی پہنائیوں کو سمجھے، اس کے جوہر سے شناسا ہو اور اپنی تدریسی سعی و کاوش سے اس کے جوہر کو آشکار کرے۔

اگر استاد سال بھر میں دس فیصدی شاگردوں کے ذہنوں کو بھی بیدار کر سکے۔ ان کو حصول تعلیم کے صحیح راستوں پر ڈال سکے۔ ان کے اخلاق کو سنوار سکے تو یہ سمجھیے کہ اس نے ایک بڑا کام کیا جس کا صلہ اگر قوم اسے نہیں دیتی تو اللہ تعالیٰ ضرور دیں گے۔ بچوں کو علم سکھانا ان کی ذہنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا۔ ان کو زندگی کے صحیح راستوں پر ڈالنا، انہیں اچھا شہری بنانا اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار کرنا، ان کے دلوں میں قوم اور وطن کا تقدس پیدا کرنا۔ انہیں بہت اچھے انسان بنانا کوئی مذاق نہیں ہے۔ اور جو استاد ان امور میں تھوڑا بہت بھی کامیاب ہو گیا وہ معاشرہ کی طرف سے تمام تحسین و آفرین کا مستحق ہے۔ (باقی آئندہ)

تدریس زبان میں مکالموں کی اہمیت

محمد صدیق احمد

خواہ کوئی زبان ہو، اس کی تدریس میں مکالموں کی افادیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ خصوصاً غیر ملکی زبان کی تدریس میں مکالمے بے انتہا مفید اور مؤثر ذریعۂ تدریس ثابت ہوتے ہیں۔ اس طرح طالبعلم مکالموں میں عملی طور پر حصہ لیتا ہے اور نتیجتاً اسے اس زبان پر عبور حاصل ہو جاتا ہے جس زبان میں اس نے مکالمے ادا کیے ہوں، اس کی قوتِ اظہار بڑھتی ہے اور ذخیرۂ الفاظ پر اس کی گرفت مضبوط ہو جاتی ہے۔

اگر بات چیت کو مناسب طور پر منظم کیا جائے تو یہ تدریس الفاظ، محاورات اور گرامر میں انتہائی مفید ثابت ہوتی ہے۔ اس طرح نہ صرف سبق میں جان پڑ جاتی ہے بلکہ وہ سبق طلبا کو اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ اور کھیل کھیل میں وہ زبان بولنا آ جاتی ہے۔ استاد اور شاگرد دونوں ہی اس طریق تدریس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مکالموں کو صحیح طور پر استعمال کرنے کے لیے استاد کو اپنی قوتِ تخیل اور موقع شناسی کو کام میں لانا پڑتا ہے۔ اگر استاد خود مکالموں میں دلچسپی نہیں لیتا یا پھر اس کے لیے ضروری محنت سے جی چراتا ہے تو افادیت کا ختم ہو جانا عین ممکن ہے۔

ایک موثر مکالمے کی دو اہم خصوصیات یہ ہیں۔

۱- اپنے اپنے پارٹ کسی کاغذ یا کتاب کے بغیر ادا کرنا۔

۲- صورت حال کے مطابق ایکٹنگ کرنا۔

دوسرے الفاظ میں اس بات چیت کو ڈرامائی مکالمہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا کہ استاد کتاب کے ڈرامے کو طلبہ سے فرداً فرداً پڑھوا کر ان کے پارٹ ادا کرواتے ہیں

اس طرح نہ تو وہ ڈراما رہتا ہے۔ نہ ہی اسے کامیاب مکالمہ سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اصل مکالمے سے پہلے اس طرح طلبہ کو اپنے اپنے پارٹ یاد کروائے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ طریقہ اصل مکالمے کی جگہ ہرگز نہیں لے سکتا۔

اس مقصد کے لیے کہ زیادہ سے زیادہ طلبہ غیر ملکی زبان کو بول کر اور سمجھ کر اس سے لطف اٹھا سکیں۔ استاد کو چاہیے کہ وہ مکالمے کو جہاں تک ممکن ہو سکے سادہ اور مختصر رکھے۔ لیکن وہ اتنا مختصر بھی نہ ہو کہ اس سے زبان پر عبور حاصل نہ ہو سکے۔

ہر مکالمہ ایک چھوٹی سی وحدت ہونی چاہیے۔ جس میں روزانہ زندگی میں پیش آنے والا کوئی سین۔ کوئی پُرلطف قصہ یا مزیدار لطیفہ پیش کیا گیا ہو۔ بہت سے مفید الفاظ، محاورات جملے اور اشعار مکالموں کی صورت میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ بلا شبہ کوئی محاورہ یا گرامر کا کوئی اہم اصول ان مکالموں میں کارفرما ہو سکتا ہے۔

مکالمہ کے لیے مندرجہ ذیل موضوعات موزوں اور مناسب ثابت ہو سکتے ہیں۔

(۱) کسی دوست کو ٹیلیفون کرنا۔

(۲) قہوہ خانہ یا ٹی شاپ میں دوستوں کی بے تکلف بات چیت۔

(۳) بازار میں خرید و فروخت کا منظر

(۴) ریلوے اسٹیشن پر قلی اور ٹکٹ چیکر سے بات چیت۔

(۵) گڑیا کے بیاہ کے لیے دو سہیلیوں کی بات چیت۔

یہ مکالمے مختلف طریقوں سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اگر یہ کتاب میں مل جائیں تو اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو استاد خود حسب ضرورت مکالمے تخلیق کر سکتا ہے۔ خود طلبہ بھی استاد کی مدد سے یہ مکالمے تیار کر سکتے ہیں۔ جب مکالمہ تیار ہو جائے تو استاد کو چاہیے کہ وہ منتخب طلبہ کو اپنے اپنے پارٹ لکھوا دے۔ پھر ان سے کہے کہ وہ زبانی یاد کریں۔ ہر ایک طالب علم سے اس کا پارٹ پڑھوا کر لہجہ اور تلفظ درست کروا دے اور موقع و محل کی

مناسبت سے حرکات وسکنات بھی ان کو سکھا دے۔ جب وہ یہ دیکھ لے کہ ہر لڑکا اپنا اپنا پارٹ روانی سے مناسب حرکات وسکنات اور لہجہ سے ادا کر سکتا ہے تو پھر ان کو جماعت کے سامنے مکالمہ بولنے کو کہے۔

شروع شروع میں بلاشبہ لکھے ہوئے الفاظ کی پابندی لازمی ہوگی۔ تاہم استاد اگر یہ دیکھے کہ طلبا کو زبان وبیان پر پورا پورا عبور حاصل ہو گیا ہے اور ان کے پاس کافی ذخیرۂ الفاظ بھی موجود ہے تو انھیں اپنے طور پر خود ساختہ جملے بولنے کی اجازت بھی دے سکتا ہے۔ یہ طریقہ اس صورت میں زیادہ مفید ہوتا ہے۔ جب طلبہ کو ذخیرۂ الفاظ پڑھانا اور اِس ذخیرۂ الفاظ کو کام میں لانا مقصود ہو۔ خرید و فروخت اور ٹی شال کے مکالموں کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ طلبہ کے ذخیرۂ الفاظ کے استعمال کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ اگر طلبہ خود ساختہ فقرے بولنا سیکھ گئے تو مکالمہ میں مزید جان پڑ جائے گی۔ اور وہ دل چسپ سے دل چسپ تر ہوتے چلے جائیں گے۔

مکالمہ کے موثر اور کامیاب ہونے کا انحصار اس میں حصہ لینے والوں کی حاضر جوابی اور کامیاب ایکٹنگ پر ہوتا ہے۔ مکالمہ بذات خود ایک چھوٹا سا ڈرامہ ہی تو ہے۔ اس میں ڈرامے کے تمام لوازمات موجود ہوتے ہیں۔ جس طرح ڈرامے کی کامیابی اس میں حصہ لینے والوں کی ایکٹنگ اور صحیح اور پُر اثر گفتگو پر منحصر ہے اسی طرح مکالمہ میں بھی حصہ لینے والوں کی ایکٹنگ اور گفتگو پر مکالمہ کی کامیابی یا ناکامی منحصر ہوتی ہے۔ جس طرح ڈرامے میں مخصوص لباس اور کچھ سامان کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح مکالمہ میں بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً ٹیلیفون پر گفتگو کرانے کے لیے استاد کو ہاتھ کا بنا ہوا ٹیلیفون کا کھلونا، ایکٹنگ کرنے والے طلبہ کو مہیا کر دینا چاہیے۔ ٹی سٹال کے سین میں طلبہ کی کرسیاں اور استاد کی میز کام میں لائی جا سکتی ہے۔ کچھ چائے کے برتن اور ایک بیرے کا لباس بھی مہیا کیا جا سکتا ہے۔ غرضیکہ تھوڑی سی کاوش اور تیاری کے ساتھ نہایت کامیاب اور پُر اثر مکالمہ اسٹیج کیا جا سکتا ہے۔

ان مکالموں میں زیادہ سے زیادہ جتنے بھی طلبہ حصہ لے سکیں اتنا ہی بہتر ہے۔ البتہ

ٹیلیفون پر بات چیت کے سین میں صرف دو طلبہ ہی حصہ لے سکتے ہیں۔ لیکن ٹی سٹال کے سین میں تین چار یا پانچ طلبہ بھی عملی طور پر شامل ہو سکتے ہیں۔

جونہی طلبہ اس قابل ہو جائیں کہ وہ زبانی یاد کیے ہوئے اپنے اپنے پارٹ خوبی سے ادا کرنے پر قادر ہو جائیں اور موقع و محل کے لحاظ سے مکالموں میں کمی بیشی کر سکیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ایک اونچی سطح پر پہنچ گئے ہیں۔ یہاں میں ایک مکالمہ پیش کرتا ہوں جس کا موضوع "گڑیا" قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس سین میں ہنڈولے پر ایک گڑیا کو لٹا دیا جائے۔ اور ایک لڑکی اس ہنڈولے کو ہلاتی جائے۔ ایک دوسری لڑکی اس لڑکی سے کہے۔

آپ کی گڑیا کے مزاج کیسے ہیں؟

جواب :- اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مزاج اچھے ہیں۔

سوال :- اس کا نام کیا ہے ؟

جواب :- اس کا نام نرگس ہے ۔

سوال :- کیا اس کے بال کالے ہیں ؟

جواب :- نہیں بھورے ہیں ۔

سوال :- کیا اس کے پاس بہت سے کپڑے ہیں ؟

جواب :- جی ہاں گڑیا آٹھ سوٹوں کی مالک ہے ۔

سوال :- ان سوٹوں کے رنگ بتائیے ؟

جواب :- وہ سرخ ۔ زرد ۔ نیلے ۔ سبز ۔ سفید ۔ گلابی اور نارنجی ہیں ۔

سوال :- آپ کی گڑیا کہاں سوتی ہے ؟

جواب :- وہ اسی ہنڈولے میں سوتی ہے ۔

سوال :- وہ سونے کے لیے کس وقت بستر پر لیٹتی ہے ؟

جواب :- آٹھ بجے شام کو سو جاتی ہے ۔

سوال :- کیا آپ اُسے لوری دے کر سلاتی ہیں ؟

جواب :- جی نہیں۔ میری چھوٹی بہن اسے لوری سنا کر سلاتی ہے ۔

سوال :- کیا یہ گڑیا آپ کی بہن کی ہے ؟

جواب :- جی ہاں یہ گڑیا اسی کی ہے ۔

سوال :- وہ کونسی لوری گا کر اسے سلاتی ہے ؟

جواب :- وہ لوری یہ ہے ؛

آجا ری نیندیا تو آ کے نہ جا ؛ میری گڑیا کی آنکھوں میں گھل مِل جا

مندرجہ بالا مکالمہ محض مثال کے طور پہ لکھا گیا ہے۔ استاد (یا استانی) جیسا اور جس زبان میں چاہے مکالمہ تیار کر سکتا ہے۔ ضرورت صرف اِس امر کی ہے کہ استاد کو خود تدریس سے دِلچسپی ہو اور وہ اسے بیگار سمجھ کر نہ ٹالے۔ بلکہ خود محنت سے کام لے۔ اِس طرح اِس کے اسباق دلچسپ بن جائیں گے بلکہ طلباء کو زبان سکھانے میں بھی آسانی ہو گی۔ اور کھیل کھیل میں تمام بچوں کو وہ زبان بولنا آ جائے گی جس کا سکھانا استاد کو مقصود ہو گا ؛

زبانوں کی تدریس اور کھیل

محمد صدیق احمد

ہمارے ملک میں اکثر لوگ یہ کہتے ہوئے پائے جاتے ہیں ؎

کھیلو گے کودو گے ہو گے خراب ؛ پڑھو گے لکھو گے بنو گے نواب

گویا ان کے نزدیک کھیل کود اور پڑھائی میں بعد المشرقین ہے۔ بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ کھیل اور کام میں کوئی تضاد نہیں۔

تدریس کے عمل کو دلچسپ و موثر بنانے میں کھیلوں کی اہمیت مسلّمہ ہے۔ مشرق و مغرب کے تمام ماہرین علم تدریس اس بات پر متفق ہیں کہ طلبہ کو کھیل کھیل میں تمام علوم سکھائے جا سکتے ہیں۔ اس طرح کھیل کام کی جگہ لے سکتا ہے اور کھیل کام کا نعم البدل ثابت ہو سکتا ہے۔ غلطی سے لوگوں نے کھیل اور کام کے درمیان ایک حدِ فاصل قائم کر دی جو عرصے تک تحصیل علوم کے عمل کو بیزار کن۔ بے لطف۔ خشک اور بے مقصد کام بنانے کا سبب بنی رہی۔

کون نہیں جانتا کہ ایک عام بچہ چاہے وہ ابتدائی جماعت کا طالب علم ہو۔ چاہے ثانوی جماعت میں پڑھتا ہو کھیل میں دلچسپی لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کھیل اس کے لیے ایک خوش گوار تجربہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ اس طرح گروہی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی جبلت بروئے کار آتی ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کھیلوں کے درمیان مقابلہ کرنے اور فریق مخالف پر غالب آجانے کی فطری خواہش کی بنا پر کھیل بے انتہا خیال افروز، اور غیر متزلزل توجہ کا موجب بن جاتا ہے۔ اس طرح خشک سے خشک اور مشکل سے مشکل مضامین آسانی سے ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں کھیل ہی جماعت کی وہ واحد سرگرمی ہے جس میں جماعت کے تمام افراد اجتماعی اور انفرادی طور پر حصہ لے سکتے ہیں

اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام سرانجام پا جاتا ہے۔

ایک اوسط درجے کے کم عمر طالب علم کی زندگی میں ایک دور ایسا بھی آتا ہے جب یہ کھیل اسکی ذہنی ورزش اور دماغی وجسمانی تفریح کا موجب بن جاتے ہیں۔ یہ تبدیلی بچے کی زندگی میں تیرہ یا چودہ سال کی عمر میں رونما ہوتی ہے۔ یہی وہ دور ہے جب اِس بچے کو کھیل کھیل میں بہت کچھ پڑھایا اور سکھایا جا سکتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تمام قسم کے کھیل تحصیل علوم میں مدد ومعاون ثابت ہو سکتے ہیں! اِس کا جواب یہی ہے کہ چند مخصوص قسم کے کھیل مخصوص مضامین کی تدریس میں مفید ثابت ہوتے ہیں تمام کھیل مفید نہیں ہوتے بخصوصاً غیر ملکی زبان کی تدریس میں کئی مسائل ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ استاد کو مجبوراً کھیلوں کا انتخاب خود کرنا پڑتا ہے۔ وہ صرف وہی کھیل منتخب کرتا ہے جو طلبہ کے لیے مفید ثابت ہوں۔ یہی نہیں بلکہ اسے یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ وہ کھیل بچوں کے لیے دلچسپ اور مفید ہیں یا نہیں۔

جہاں تک زبانوں کی تدریس کا تعلق ہے یہاں کھیل بمعنی عمل پر اتنا زور نہیں دیا جاتا جتنا کہ زبان یا بیان کی خوبیوں پہ دھیان دیا جاتا ہے۔ زبانوں کی تدریس میں مفید ثابت ہونے والے کھیل یہ ہیں لعلا تاش۔ بیت بازی۔ مکالمے چھوٹے چھوٹے ڈرامے اسٹیج کرانا۔ آسان معمے حل کرانا وغیرہ۔ اب یہ استاد منحصر ہے کہ وہ ان میں سے کس کو منتخب کرتا ہے۔ موقع ومحل اور وقت کے اعتبار سے وہ جس کھیل کو چاہے کام میں لا سکتا ہے۔

غیر ملکی زبانوں کی تدریس میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شاگرد کو زیرِ تدریس زبان کے الفاظ طر اظہار، لہجہ اور تلفظ اور الفاظ کی اشکال اور جملوں کی ساخت سے سرسری واقفیت پہلے سے ہونی چاہیے ورنہ کھیل غیر دلچسپ۔ اکتا دینے والا اور غیر مفید بن کر رہ جائے گا۔ اِس کے لیے استاد کو پہلے جماعت کو تیار کرنا پڑتا ہے۔ پہلے سے سیکھے ہوئے الفاظ اور جملوں کو بولنے سے طلبہ کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے، ان کا ذخیرۂ الفاظ بڑھتا ہے اور الفاظ اور جملوں کو مختلف صورتوں میں

دہرانے سے مشق بہم پہنچتی ہے۔

یہاں پر یہ بات واضح کردینی ضروری ہے کہ کھیلوں کا مقصد نئے الفاظ اور جملے سکھانا نہیں ہوتا۔ بلکہ سیکھے ہوئے الفاظ، جملے، محاورات اور ضرب الامثال کی مشق کرانا مقصود ہوتی ہے، کبھی کبھی یہ کھیل فائدہ پہنچانے کے بجائے نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب کھیلوں کی تنظیم اور ترتیب میں کوئی خامی رہ جاتی ہے۔ استاد متعلقہ کا فرض ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ کس وقت کس قسم کے کھیل طلبہ کے لیے مفید ہوتے ہیں۔ کھیلوں سے صرف اس وقت مقصد حاصل ہو سکتا ہے جب استاد ان کو مناسب موقع محل کے اعتبار سے ترتیب دے اور مناسب رہنمائی اور نگرانی میں ان کی تنظیم کرے۔ اس کے واسطے اسے طلبہ کی عام ذہنی سطح اور دلچسپی کے ذرائع کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔

کھیلوں کی تنظیم و ترتیب کا کام نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ اس میں نہ صرف وقت کم صرف ہوتا ہے بلکہ ڈراموں کی طرح زیادہ سامان کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ ڈرامے کی طرح کھیل کی ریہرسل ضروری نہیں۔

جہاں تک کھیل شروع کرنے کے وقت اور جگہ کے تعین کا تعلق ہے۔ وہ زیادہ تر طلبہ کی دلچسپیوں ذہنی صلاحیتوں اور سکول کے عام حالات پر منحصر ہوتا ہے۔ کچھ اساتذہ کرام تمام سال وقتاً فوقتاً کھیلوں کو ایک اسکیم کے تحت کام میں لاتے ہیں۔ وہ اپنی جماعت کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیتے ہیں ہر گروہ کا ایک لیڈر مقرر کر دیا جاتا ہے۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان تمام سال مختلف قسم کے مقابلے ہوتے رہتے ہیں، ہر پارٹی کو استاد نمبر دیتا جاتا ہے۔ آخر سال میں جو گروہ جیتتا ہے اسے انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ اس طرح طلبہ میں مقابلہ کی روح جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے۔

بہتر تو یہ ہے کہ ہر ہفتہ ہر پارٹی کا لیڈر بدل دیا جائے۔ اس طرح ہر طالب علم لیڈر بننے کی کوشش کرے گا، نتیجتاً تعلیمی کام دلچسپ مؤثر اور مفید تر بنتا چلا جائے گا۔ اگر کھیلوں کا پروگرام ایک سال یا سال کے کچھ حصے پر مشتمل ہو تو وہ مواد جس پر کھیلوں کی بنیاد رکھی جاتی مقصود ہو،

اس کا اعلان پہلے سے کر دینا چاہیے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ یہ مواد الفاظ، محاورات، اشعار
اور جملوں پر مشتمل ہوا کرتا ہے۔ ان الفاظ، محاورات، اشعار اور جملوں کو طلبہ پہلے سے سیکھ لیتے ہیں۔
ایک ایک لفظ کئی کئی جملوں میں استعمال کرنے، متضاد اور مترادف الفاظ بنانے، مذکر اور مؤنث میں
تمیز کرنے۔ واحد و جمع بنانے اور نامکمل فقرے مکمل کرنے کے مقابلے منعقد کرنے سے طلبہ کو
سیکھے ہوئے الفاظ پر عبور حاصل ہو جاتا ہے اور وقتِ ضرورت وہ ان کو استعمال کرنے پر
قادر ہو سکتے ہیں۔

استاد کو بذاتِ خود ان کھیلوں کی نگرانی کرنی چاہیے اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو تو وہ جماعت
کے ایسے طالب علم کو اپنی جگہ مقرر کر سکتا ہے جو اپنے ہم جماعتوں میں سب سے زیادہ قابل، با اثر
اور مقبول ہو۔ یہی نہیں بلکہ اسے اپنی ذات اور اہلیت پر پورا پورا اعتماد بھی ہونا چاہیے۔

کھیل شروع کرنے سے پہلے استاد کو چاہیے کہ وہ کھیل کی تفصیلات اور طریق کار طلبہ پر واضح
کر دے۔ سب سے ضروری بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ کھیل طویل نہ ہو اور بیزاری
کی کیفیت پیدا نہ کرے۔ کھیل بہر صورت دل چسپ ہونا چاہیے ورنہ اس کی افادیت ختم ہو جانے کا
اندیشہ ہے۔ اگر استاد کھیل میں جماعت کے طلبہ کی دل چسپی کم ہوتے دیکھے تو اسے
چاہیے کہ وہ اس کھیل کو بند کر کے کوئی دوسرا کھیل شروع کرا دے۔

یاد رکھنا چاہیے تمام کھیل سب بچوں کے لیے یکساں دل چسپی کا موجب نہیں ہوتے۔ ان کی
دل چسپی بہت سے عوامل مثلاً عمر، قابلیت، ذاتی دل چسپیوں اور تربیت پر منحصر ہے۔ اکثر
اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جماعت کے بچے ایک یا دو کھیلوں میں بہت زیادہ دل چسپی لینے
لگتے ہیں اور ان کھیلوں کے لیے ان کا مطالبہ بتدریج شدت اختیار کرتا جاتا ہے۔ استاد کو
چاہیے کہ وہ ایسی صورتِ حال پیدا نہ ہونے دے، جدّت و اُپج سے کام لے، نئے سے نئے
دل چسپ سے دل چسپ کھیل ایجاد کرے، تاکہ جماعت میں تنوع کی فضا قائم ہو اور طلبہ زیادہ سے
زیادہ فائدہ حاصل کر سکیں۔

مختصر یہ کہ کھیل بہترین ذریعۂ تعلیم و تدریس ثابت ہو سکتے ہیں۔ صرف استاد کی توجہ اور شوق کی ضرورت ہے۔ استاد کی دل چسپی کے بغیر کوئی بھی قابل ذکر کام سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔ استادوں کو چاہیے کہ وہ اپنے فرائض پہچانیں جس معزز پیشے کو انہوں نے اپنایا ہے، ذرا سی محنت، توجہ اور دل چسپی سے کام لے کر اپنے اس پیشے کی لاج رکھ لیں اور اپنے آپ کو صحیح معنوں میں معمار قوم بنا کر دکھا دیں ؎

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

ترقی کے سلسلہ میں تعلیم کی اہمیت

یونیسکو کے قائم مقام ڈائرکٹر جنرل نے ادارے کے انتظامیہ بورڈ کو یونیسکو کی گذشتہ پانچ ماہ کی سرگرمیوں کی جو رپورٹ پیش کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی ترقی کے سلسلہ میں بین الاقوامی کوششوں اور تعاون میں ترقی ہوئی ہے۔ رپورٹ میں اس بات کی خاص طور پر وضاحت کی ہے کہ ممبر ملکوں نے تعلیمی مسائل کو دوسرے مسئلوں پر واضح طور پر فوقیت دی ہے۔ انھوں نے اپنی رپورٹ میں بتایا ہے کہ اب یہ بات عام طور پر مان لی گئی ہے کہ معاشرتی اور اقتصادی ترقی میں تعلیم بنیادی اہمیت رکھتی ہے اور اسکی ترویج کے اخراجات ایک بنیادی ضرورت ہیں۔ اس حقیقت کو نہ صرف یونیسکو کے ممبر ملک بلکہ اقوام متحدہ کے خاص فنڈ، جنرل اسمبلی، اقوام متحدہ کی دیگر مخصوص ایجنسیوں اور بین الاقوامی ترقیاتی انجمن نے بھی تسلیم کرلیا ہے یہی وجہ ہے کہ اب عام اور فنی تعلیم پر پہلے سے زیادہ رقم خرچ کی جارہی ہے اور امداد دی جارہی ہے۔ اگرچہ ابھی یہ امداد ثانوی اور اعلیٰ مدارج تک محدود ہے۔ لیکن جلد ہی اس کی توسیع ابتدائی درجوں تک کردی جائے گی۔ یونیسکو نے تعلیمی امداد کے پروگرام میں خاص طور پر ممبر ملکوں کو فنی خدمات فراہم کی ہیں۔ یہ خدمات خصوصیت سے افریقہ، ایشیا، لاطینی امریکہ و عرب ملکوں کو دی گئیں۔ افریقہ میں یونیسکو نے چار علاقائی ادارے قائم کیے ہیں۔ جو اس سال سے کام شروع کریں گے۔ ان میں عکرہ (گھانا) کا تعلیمی تحقیقات کا مرکز، خرطوم (سوڈان) کا تعلیمی مرکز، یوندی میں درسی کتابوں کی تالیف کا مرکز اور کمپالا میں اساتذہ اور پروفیسروں کے تربیتی مراکز شامل ہیں۔

یونیسکو اب اقوام متحدہ کے خاص فنڈ کے تعاون سے نائجیریا، کانگو، مالی اور سینیگال میں ثانوی کے اساتذہ کے لیے تربیتی مراکز کے قیام میں مدد دے رہا ہے۔ اس سال کے شروع میں ایشیا میں بھی

چار علاقائی مرکز قائم ہوئے۔ یہ مراکز بینکاک، نئی دہلی، بندونگ اور منیلا میں قائم کیے گئے ہیں۔ عرب ملکوں میں بھی یونیسکو سرگرم عمل رہا ہے۔ چنانچہ بیروت میں تعلیمی منتظموں کی تربیت کا مرکز گذشتہ چھ ماہ سے قائم ہے۔ اس کے علاوہ فلسطین کے مہاجروں کے لیے بھی تعلیمی پروگرام پر عملدرآمد ہو رہا ہے۔

قائم مقام ڈائرکٹر جنرل نے اپنی رپورٹ میں بورڈ کی توجہ ان تین اہم علاقائی کانفرنسوں کی طرف مبذول کی جو مارچ اور اپریل میں سنتیاگو، ٹوکیو اور پیرس میں ہوئیں۔ یونیسکو کی آئندہ تعلیمی سرگرمیوں کی نوعیت کا انحصار ان کانفرنسوں میں کیے گئے فیصلوں پر ہوگا۔ ان کانفرنسوں میں تعلیمی منصوبہ بندی کے ماہرین کی تربیت کے لیے علاقائی مرکز قائم کرے گا۔ ان کانفرنسوں میں اس بات کا اندازہ بھی ہوا کہ مستقبل کے لیے کیا تعلیمی منصوبے ہیں اور مختلف ممالک انفرادی طور پر کیا کوششیں کریں گے۔ چنانچہ ان علاقوں کے ملکوں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے بجٹ میں خاطر خواہ رقم تعلیمی ترقی کے لیے مخصوص کریں گے۔

ان کانفرنسوں میں نہ صرف تعلیم کو بہتر بنانے کی تدبیروں پر غور کیا گیا۔ بلکہ اس کی زیادہ سے زیادہ ترویج پر بھی زور دیا گیا۔ نئے طریقوں اور تعلیمی تکنیک اپنانے پر بھی توجہ دی جائے گی۔

رپورٹ کے اختتام پر کہا گیا ہے کہ شاید مستقبل قریب میں تعلیم کی از سر نو ترتیب پر غور کرنا ضروری ہو جائے۔

پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی رجسٹریشن

گورنر مغربی پاکستان نے مغربی پاکستان کے غیر منظور شدہ تعلیمی اداروں کی رجسٹریشن کا آرڈیننس مجریہ ۱۹۶۳ء نافذ کر دیا ہے۔ اس آرڈیننس کا مقصد صوبہ میں غیر منظور شدہ نجی تعلیمی اداروں کو باقاعدہ طور پر چلانا اور ان کی نگہداشت کرنا ہے۔ آرڈیننس کا اطلاق مخصوص علاقوں کے سوا سارے صوبہ مغربی پاکستان پر ہوگا۔ اور اس کا نفاذ اس تاریخ یا تاریخوں سے عمل میں آئے گا جس کا اعلان حکومت بعد ازاں کرے گی۔ آرڈیننس کے تحت کوئی غیر منظور شدہ نجی ادارہ اس وقت تک قائم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی چلایا جا سکے گا جب تک کہ اسے آرڈیننس کی دفعات کے مطابق رجسٹر نہ کرا لیا گیا ہو۔ آرڈیننس یا اس کے تحت وضع شدہ قواعد کے خلاف غیر منظور شدہ نجی تعلیمی ادارہ چلانے پر ایک سال تک کی سزائے قید یا ایک ہزار روپے جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جا سکتی ہیں۔ کوئی عدالت اس آرڈیننس کے

تحت کسی خلاف ورزی پر اس وقت تک کارروائی نہیں کرے گی جب تک کہ رجسٹر کرنے والے حاکم کی طرف سے اس امر کی تحریری شکایت نہ کی گئی ہو جو کہ کالج کی صورت میں متعلقہ یونیورسٹی کا رجسٹرار اور لڑکوں اور لڑکیوں کے اعلیٰ ثانوی ہائی یا مڈل سکول کی صورت میں ڈویژنل انسپکٹر یا انسپکٹرس آف سکولز ہو گی۔

سکولوں کی تعمیر اور رسل و رسائل کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنا دیا گیا

ضلع ہزارہ کے کونسلروں نے قومی تعمیر کے جذبے سے اپنے اپنے علاقوں میں کئی ایک قابل تعریف کام کیے ہیں۔ جگہ جگہ سڑکیں اور راستے اپنی مدد آپ کے اصول پر تعمیر کیے گئے۔ پلیاں بنائی گئیں۔ سکول تعمیر ہوئے اور شفاخانے بنائے گئے۔ یونین کونسل بوٹی نے گڑھی بوٹی روڈ پانچ میل لمبی سڑک بنائی۔ کاکھتری یونین میں دیہات بندہ کاتم اور کنتالی میں آبی ذخائر کے منصوبے زیر تکمیل ہیں۔ یونین کونسل نملی میرا کے کارکن نملی میرا مڈل سکول اور باگنوتر کے ہائی سکول کے لیے تعمیری سامان مہیا کرنے میں سرگرم ہیں۔ یونین کونسل چھمد میں سجان گلی بنبیری روڈ پر سات پلیاں تعمیر کی گئی ہیں۔ مڈل سکول کوکال میں دو کمروں کا مزید اضافہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں آٹھ سو دو روپے علاقائی عوام نے اپنی مدد آپ کے اصول پر اکٹھے کیے۔

بالاک یونین میں پرائمری سکول بوگال پرائمری سکول خوشی کوٹ اور مڈل سکول بالاک کے تعمیری منصوبے زیر تکمیل ہیں۔ یونین کونسل بیر میں بھی ایک مڈل سکول کی عمارت زیر تعمیر ہے۔ علاقے کے عوام نے گاؤں چھمد تک پانی کی پائپ لائن نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔

نامل یونین میں عوام نے بنگل کے پرائمری سکول کی عمارت کا کام تین چوتھائی کی حد تک مکمل کر لیا ہے۔ ایک شفاخانے کی عمارت مکمل کی جا چکی ہے۔

چھمبا یونین میں ایک حفاظتی بند زیر تعمیر ہے تاکہ فصلیں داؤ ندی کے سیلاب سے محفوظ رہ سکیں۔ اندازہ ہے کہ اس بند پر تیس ہزار روپے کی لاگت آئے گی۔ اسی علاقے میں پینے کے پانی

لیے ایک پختہ کنواں بھی تعمیر کیا گیا ہے۔ اس منصوبے پر تین ہزار روپے لاگت آئی۔ علاقے کے عوام
نے دیہات میں چھ فرلانگ لمبے راستے کی مرمت بھی کی۔

یونین کونسل دربند میں صحت و صفائی کی مہم چلائی گئی۔ غازی یونین کے باشندوں نے گاؤں نقاچیاں
میں ایک میل لمبا راستہ تعمیر کیا۔

یونین کونسل پانیاں میں تین میل لمبے راستے کی مرمت کی گئی ہے۔ یونین ملک پور کے گاؤں گدوانی
میں ایک پرائمری سکول کی عمارت مکمل کی گئی۔

یونین کونسل شیر میں حاجی فیروز خاں چیئرمین نے پانچ ہزار کی رقم دے کر یونین کا دفتر تعمیر کروایا
اسی طرح یونین کونسل ددھیال نے اپنی مدد آپ کے تحت سات ہزار روپے کے خرچ سے دفتر
تعمیر کیا۔

یونین کونسل بل کوٹ میں تین میل لمبی سڑک تعمیر کی گئی ہے۔ اس راستے کی تعمیر میں مقامی
کونسل کے چیئرمین نے بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔ یونین کونسل پھیرا مقامی دفتر کی عمارت اور ہال کی
تعمیر پر چھ ہزار روپے صرف ہوئے۔

یونین کونسل گندیاں نے پانچ سڑکوں کی تعمیر کے منصوبے کو مکمل کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ علاقے
کی یونین کونسلیں چھوٹے چھوٹے مقامی جھگڑے چکانے میں بہت کامیابی سے کام کر رہی ہیں۔

پاکستانی لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے صدارتی ایوارڈ

صدر ایوب نے خدمت خلق، خاص مہمات، ذاتی مشاغل اور جسمانی صحت کے شعبہ میں نمایاں کارکردگی
دکھانے والے پاکستانی لڑکوں اور لڑکیوں کو تمغے دینے کا اعلان کیا ہے۔ اس فیصلہ کے مطابق کانسی
چاندی اور سونے کے تمغے دیے جائیں گے۔ ہر تمغہ کے ساتھ ایک پروانہ خوشنودی یا صدر کے دستخط
سے جاری کیا ہوا سرٹیفکیٹ بھی دیا جائے گا۔

ایسے سکوں اور پروانوں کے لیے عمر کے اعتبار سے لڑکوں اور لڑکیوں کو تین مختلف گروپوں میں
تقسیم کیا گیا ہے۔ پندرہ برس سے کم عمر کے لڑکے لڑکیاں ایک گروپ میں اور سترہ سے انیس برس تک

عمر کے لڑکے تیسرے گروپ میں رکھے جائیں گے۔ پندرہ برس سے کم عمر کے لڑکے لڑکیاں کانسی کے بیج، پندرہ سے سترہ برس تک کے گروپ کو چاندی کے تمغے اور سترہ سے انیس برس تک کی عمر کے گروپ کو طلائی تمغے دیئے جائیں گے۔

راولپنڈی سے مرکزی حکومت کے ایک اعلان میں بتایا گیا ہے کہ تمغے حالتو وقت: یں :-

(ا) خدمت خلق کے تحت ابتدائی طبی امداد، جان بچانے کے سلسلہ میں نمایاں خدمات، خانہ سردسر ٹریننگ، پہاڑی علاقوں میں مصیبت میں گھرے ہوئے افراد کی جان بچانے کی ٹریننگ یا اس سے ملتے جلتے شعبوں کی سرگرمیوں پر دیئے جائیں گے۔

(ب) شعبۂ مہارت میں پہل کرنے، خود اعتمادی، ذمہ داری کے احساس اور مہم جوئی کے جذبہ کے مظاہرے پر انعامات دیئے جائیں گے۔ اس سلسلہ میں نقشے پڑھنے (میپ ریڈنگ) ابتدائی طبی امداد اور ایسے کیمپوں کے لیے بیج دیئے جائیں گے جس میں شریک ہونے والے لڑکے اور لڑکیاں پیدل یا سائیکلوں پر یا گھوڑوں پر کشتیوں پر سفر کے ذریعہ شریک ہوں۔

(ج) اس مد کے تحت فنون لطیفہ مثلاً ہاتھ سے بنائی ہوئی تصویر، موسیقی، فوٹو گرافی ایسے فنون کے اچھے اچھے نمونے جمع کرنے، دست کاری، سائنس اور نیچر ہسٹری (مثلاً آثار قدیمہ، علم ہیئت) !! فنی مہارت (مثلاً گائیڈنگ، ملاحی، کوہ پیمائی، جاپانی طرز کی کشتی میں مہارت) حاصل کرنا شامل ہوں گی۔

(د) جسمانی صحت کے تحت کھیلوں، تیراکی اور دوسری ایسی سرگرمیوں میں اعلیٰ صلاحیت حاصل کرنے پر جن کا تعلق جسمانی قوت کے مقابلوں میں مہارت اور بہتر رفتار کے مظاہروں سے ہو انعامات دیئے جائیں گے۔

مغربی پاکستان کے لیے اقوام متحدہ کے خاص فنڈ کی امداد

پاکستان میں اقوام متحدہ کے خاص فنڈ والے پروگراموں کے ڈائرکٹر مسٹر تھامس ایف یار جونز

حال ہی میں اعلان کیا ہے کہ خاص فنڈ کی مجلس عاملہ نے پچھلے مہینے ۲۸ لاکھ ۲۹ ہزار ڈالر کی منظوری دی ہے یہ رقم مغربی پاکستان میں نظم و نسق کی ترقی اور صنعتی تربیت کی اسکیم پر آئندہ چار سال میں خرچ کی جائے گی۔

حکومت پاکستان کی درخواست کے مطابق اقوام متحدہ کا خاص فنڈ تیرہ ماہرین بھیجے گا جو مجموعی طور پر ۱۰ انسانی سال کے برابر خدمات انجام دیں گے۔ علاوہ ازیں دس وظیفے دیئے جائیں گے اور تین یونٹ والے ایک پروجیکٹ کے لیے دو لاکھ دس ہزار ڈالر کی مالیت کا سامان فراہم کیا جائے گا۔ تاکہ نظم و نسق اور ہنرمند عمال کی تربیت میں مدد مل سکے۔ اس میں وہ مشورے شامل ہوں گے جو صحت، عمال اور معاشرتی بہبود کی وزارت کو دیئے جائیں گے۔ تاکہ صنعتی تربیت کے ضمن میں پالیسیوں اور معیاروں کو ترقی دینے میں اور صنعتوں سے متعلق امیدواروں کے تربیتی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں مدد مل جائے نظم و نسق سے متعلق ایک ترقیاتی یونٹ لیکچروں، کانفرنسوں اور سیمیناروں کا انتظام کرے گا۔ مثلاً ہراتی منصوبوں کی ذمہ داری لے گا اور صنعتی جائزے مرتب کرائے گا۔

حیدرآباد کے لیے اتالیقوں کی تربیت کے جس نئے یونٹ کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ اس کے تحت پیشہ ورانہ اسکولوں اور صنعتوں میں تربیتی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے عملے کی تربیت میں مدد دی جائے گی۔ اس مقصد کے لیے چار سو بیس اتالیقوں کو دوبارہ اور ایک ہزار چھ سو پچاس اتالیقوں کو نئے سرے سے اگلے چار سال کے دوران میں تربیت دی جائے گی۔ یہ تربیت ایک ایسے ادارے میں ہوگی جس میں بیک وقت تین سو پینتالیس طلبا داخل ہو سکتے ہیں۔

توقع کے مطابق یہ منصوبہ اس سال کے آخر میں شروع ہوگا، اور خاص فنڈ کی طرف سے بین الاقوامی ادارۂ عمال اسے عملی جامہ پہنائے گا۔

اس منصوبے کے لیے حکومت کے میزانئے میں ۵۰ لاکھ ۴۳ ہزار روپے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔

پاکستان میں عملی جامہ پہنانے کے لیے خصوصی فنڈ کا یہ دسواں منصوبہ ہے یہ نیا منصوبہ اس موجودہ منصوبے سے بالکل ملتا جلتا ہے۔ جو ترقی نظم و نسق، نگرانی اور تربیت اتالیق کے نام سے پچھلے سال مشرقی پاکستان میں شروع کیا گیا تھا۔ خاص فنڈ کے دوسرے منصوبوں کی تفصیل یہ ہے

مغربی پاکستان میں انجینرنگ کی تعلیم میں تعاون۔ مشرقی پاکستان میں آبپاشی جائزہ۔ ملک کے دونوں حصوں میں لوہے اور کوئلے کی جستجو کے لیے ایک معدنی جائزہ۔ مٹی کی ماہیت کا جائزہ۔ جنگلاتی تربیت اور تحقیقات۔ چٹاگانگ کے پولی ٹکنیک ادارے کے لیے امداد میں پاور سروے اور پلاننگ کے لیے امداد اور صحرائی ٹڈیوں کے بین علاقائی جائزے کے لیے امداد سنہ ۱۹۶۰ سے اب تک اقوام متحدہ کے خاص فنڈ نے پاکستان کے لیے جتنی رقوم منظور کی ہیں انکی میزان ایک کروڑ ۳۸ لاکھ ۷۸ ہزار ڈالر ہوتی ہے :-

داگ ہامرشلڈ لائبریری

نیویارک میں اقوام متحدہ کے صدر مقام پر نئی داگ ہامرشلڈ لائبریری کا افتتاح پچھلے سال کے آخر میں ہوا تھا۔ اس کی عمارت سفید سنگ مرمر شیشے اور المونیم سے تعمیر کی گئی ہے۔ اس کے جانب مشرق سکریٹریٹ کی ۳۸ منزلہ عمارت ہے۔ اور جانب شمال جنرل اسمبلی کی عمارت ہے۔ اور جانب غرب وہ لمبی چوڑی سڑک ہے جو فرسٹ ایونیو کہلاتی ہے۔ سامنے کا حصہ جانب جنوب بہت وسیع اور کھلا ہوا ہے۔ لائبریری کی چھ منزلیں ہیں۔ تین سطح زمین سے اوپر اور تین سطح زمین سے نیچے۔ ان سب میں چار لاکھ کتابوں کی الماریوں۔ پڑھنے والوں کی میزوں اور دفتر کے عملے کے لیے گنجائش رکھی گئی ہے۔ عمارت کا طول دوسو انیس فٹ اور عرض نیراسی فٹ ہے۔ سیکریٹریٹ کی عمارت کی طرح لائبریری کی بھی شرقی اور غربی دیواریں یکسر سنگ مرمر کی ہیں۔ لیکن شمالی اور جنوبی رو کار اوپر سے نیچے تک المونیم کے چوکٹوں میں جڑے ہوئے دبیز شیشوں سے بنائی گئی ہیں۔ چنانچہ سورج کے ساتھ ساتھ مشرق اور مغرب سے جو روشنی آتی ہے وہ دن بھر کمروں کو روشن رکھتی ہے۔

نئی لائبریری رسمی طور پر پچھلے سال ۱۶ نومبر کو داگ ہامرشلڈ کے نام سے منسوب کی گئی تھی۔ صدر دروازہ کے محراب پر جو سنگ مرمر کی دیوار میں بنایا گیا ہے یہ الفاظ لکھے گئے ہیں :-

داگ ہامرشلڈ لائبریری

فورڈ فاؤنڈیشن کا تحفہ

۱۹۶۱ ء

ٹیلی ویژن اور کتب بینی

بہت سے ملکوں میں ٹیلی ویژن نہ صرف تفریح بلکہ تعلیم کا بھی ذریعہ ہے۔ کچھ لوگوں کا تو یہ خیال تھا کہ اگر ٹیلی ویژن کی مقبولیت بڑھتی رہی تو دنیا سے کتابیں اٹھ جائیں گی اور کتابیں پڑھنے کا شوق ختم ہو جائے گا لیکن خود برطانیہ میں اس نظریہ کی تردید ہو چکی ہے۔ ایک برطانوی ناشر کا کہنا ہے کہ اس زمانہ میں بھی جبکہ ٹیلی ویژن جیسی چیزیں نسبتاً عام ہیں اور ایسے برقی آلے ایجاد ہو چکے ہیں جو حافظہ میں مدد دیتے ہیں، کتابیں علم کا سب سے بے بہا اور کارآمد ذریعہ ہیں۔ زیرنظر سطور میں لندن کے صحافی اور براڈکاسٹر، ولیم لاؤنڈز کتابوں کے مطالعہ اور نشر و اشاعت اور ٹیلی ویژن کے اثرات کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

ٹیلی ویژن کے باوجود برطانیہ میں کتابیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں چھپتی ہیں، مستعار لی جاتی ہیں اور پڑھی جاتی ہیں۔ لائبریریوں سے جس قدر کتابیں آجکل لی جاتی ہیں اتنی پہلے کبھی نہیں لی جاتی تھیں۔ صرف ۱۹۵۹ء میں برطانیہ میں بیس ہزار نئی کتابیں چھپیں۔ امریکہ میں جہاں کی آبادی تقریباً تین گنا زیادہ ہے اس عرصہ میں برطانیہ کے مقابلہ میں نصف کتابیں چھاپی گئیں۔ برطانیہ میں کتب بینی کا شوق بڑھتا جا رہا ہے۔ یہاں کے لوگ اکثر یہ شکایت بھی کرتے ہیں کہ کتابیں بہت مہنگی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام مغربی ممالک میں اس سے کم قیمت اور کہیں نہ ہوگی۔ یہ برطانوی ناشرین کا کمال ہے کہ انہوں نے کاغذ چھپائی اور جلد بندی کی گرانی کے باوجود کتابوں کی قیمت کو بڑھنے نہیں دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اگر زیادہ مقدار میں چیزیں تیار کی جائیں تو ان کی قیمت کم ہو جاتی ہے اور دوسری یہ کہ اخراجات میں کفایت شعاری اختیار کی گئی ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ناشران کتب اب مزید کوئی جدوجہد نہیں کریں گے۔ ۱۹۵۸ء میں برطانیہ کے باشندوں نے نئی کتابوں پر ڈی کس سترہ شلنگ اکٹھے کیے تھے۔

۱۹۵۹ء میں صورت حال اور بہتر ہو گئی اور کتابوں کی فروخت میں بہت اضافہ ہوا۔ مثال کے طور پر روسی زندگی سے متعلق پیسٹر نک کا لکھا ہوا ناول "ڈاکٹر ژواگو" جب انگریزی میں چھپا تو اس

تین لاکھ بارہ ہزار کاپیاں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئیں۔ فیلڈ مارشل لارڈ منٹگمری کے "تذکرہ جنگ" ایک لاکھ چھیانوے ہزار کاپیاں فروخت ہوئیں۔

معمولی گرد پوش کی کتابوں کی فروخت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس قسم کی کتابوں کے مشہور چھاپنے والوں میں "پینگوئن" کی فرم بھی ہے جس نے ۱۹۳۵ء میں اپنا کاروبار شروع کیا تھا۔ اس وقت سے اب تک پینگوئن کی کتابوں کی طباعت اور ان کا انتخاب معیاری رہا ہے۔ پینگوئن کی پندرہ لاکھ کتابیں ہر ماہ فروخت ہوتی ہیں۔ اسی قسم کی ایک اور فرم پینیتھر کے صدر کا خیال تھا کہ ۱۹۶۰ء میں ایسی کتابوں کی تقریباً آٹھ کروڑ کاپیاں فروخت ہوں گی۔ یہ بہت بڑی تعداد ہے اور ناشران کتب کے لئے تسکین اور اطمینان کا باعث ہے۔

معمولی گرد پوش کی کتابوں کی اس قدر مقبولیت کا بڑا راز یہ ہے کہ ان کی قیمت بہت کم ہے۔ مقبولیت کی اور وجوہ بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان کے گرد پوش چکنے کاغذ کے ہوتے ہیں اور ان پر جاذب توجہ نقش بنے ہوتے ہیں۔ انہیں آسانی سے جیب میں رکھا جا سکتا ہے اور ان کا موضوع ایسا ہوتا ہے جس سے عام لوگوں کو دلچسپی ہوتی ہے۔

پینگوئن کی کتابیں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں بکتی ہیں۔ لیکن ان کی مقبولیت کا انحصار گرد پوش کی جاذبیت پر نہیں موضوعات پر ہے۔ ان کتابوں میں اکثر ادبی شاہکار بھی ہوتے ہیں۔ کامیابی کا راز ان کی کم قیمت اعلیٰ معیار اور مناسب سائز ہے۔ اور پھر یہ بات بھی تو ہے کہ کتاب اگر اچھی ہے تو اچھی ہی رہے گی۔ چاہے جلد کاغذ کی ہو، کپڑے کی ہو یا گتے کی۔

برطانیہ میں کتب بینی کے رجحان کا صحیح اندازہ ان کتابوں سے ہوتا ہے جو مجلد ہوتی ہیں اس رجحان میں بھی چند تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ یہ کہ ناولوں کی فروخت بہت کم ہو گئی ہے۔ اب لوگ لائبریریوں سے بھی ناولوں کا زیادہ مطالبہ نہیں کرتے۔

برطانیہ میں اب زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو معلومات کی خاطر کتابیں پڑھتے ہیں تاکہ اپنے کام اور تفریح میں اس معلومات کا فائدہ اٹھا سکیں۔ سوانح عمریاں پڑھنے کا شوق بھی بڑھ گیا ہے

۱۹۵۱ء کے آخر میں برطانیہ میں جو کتاب سب سے زیادہ فروخت ہوئی وہ جیمز پوپ ہینسی کی لکھی ہوئی ملکہ میری (مرحوم جارج پنجم کی بیوہ) کی سوانح عمری تھی۔ دو گنی فی جلد قیمت کے باوجود یہ کتاب ہزاروں کی تعداد میں آج بھی بک رہی ہے۔

ٹیلی وژن نے کتب بینی کے شوق کو کم کرنے کی بجائے اور بڑھا دیا ہے۔ ٹیلی ویژن کے پروگرام دیکھ کر لوگوں کے دل میں شوق پیدا ہوتا ہے کہ وہ کتابوں کے ذریعہ تواریخ، سائنس، آثار قدیمہ جیسے موضوعات پر اور معلومات حاصل کریں۔ ٹیلی وژن نے ٹرولوپ، ڈکنز، آرنلڈ بینیٹ اور ایچ جی ویلز کو لوگوں سے اور زیادہ متعارف کرایا ہے۔

جنگ کے متعلق کتابوں کا شوق اب کم ہو رہا ہے۔ ٹیلی وژن نے رومانوی ناولوں کی مانگ اور شوق کو بھی کم کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ ہر موضوع پر اب پہلے سے زیادہ کتابیں پڑھی جاتی ہیں۔ غرضیکہ اپنی تعداد اور معیار کی وجہ سے کتابیں برطانوی زندگی میں اب پہلے سے بھی کہیں زیادہ عمل دخل رکھتی ہیں۔

تحفظ نباتات سے متعلق کورس

فصلوں کی حفاظت سے متعلق دس سمندر پار ملکوں کے ۱۳ سروں کے اعزاز میں گذشتہ دنوں لندن میں ایک استقبالیہ دیا گیا۔ کیڑے مکوڑوں پر قابو پانے والی دنیا کی ایک مشہور ترین فرم نے غیر ملکی تربیت پانے والوں کے لیے اپنے دسویں کورس کے افتتاح کے موقع پر یہ دعوت ترتیب دی تھی۔

یہ تربیتی سلسلہ ۱۹۵۲ء میں شروع ہوا تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک ۲۹ ملکوں کے ۱۴۱ طلباء نے ششماہی کورسوں میں شرکت کی ہے۔

استقبالیہ میں شرکت کرنے والے دس طلبا ۱۱ ان ۱۳ طلباء میں سے تھے جو نئے کورس کی تکمیل کے لیے آئندہ چھ ماہ کمپنی کے صدر مقام واقع کیمبرج میں صرف کریں گے۔ ان کا پروگرام، فصل کے تحفظ، کیڑے مکوڑوں کی کنٹرول اور کیڑے مارنے والی ادویات کے استعمال کی تربیت پر مشتمل ہوگا۔ صنعتی تحقیقاتی اداروں، یونیورسٹی اور سرکاری محکموں کا بھی وہ دورہ کریں گے۔